ایکوفیمینزم

اور عصری تانیثی اردو افسانہ

نسترن احسن فتیحی

جب آپ ٹھوس واقعات پر انحصار کرتی ایسی کہانی پر بات کرنا چاہیں گے جو کچھ کچھ باغی ہو، ذرا سی رومانی ہو، جس کے پہلو میں نفسیاتی الجھن کی جھن جھن ہو اور جو سماج سے کلی طور پر یوں جڑی ہو کہ اس کی صرف حقیقت ہی نہ کھلے بلکہ اس کے بخیئے ادھیڑتی چلی جائے اور جو عورت ذات کے گنجل کھولنے کے لئے لکھی گئی ہو۔ تو ایسے میں نسترن احسن فتیحی کا قلم اور اس کی لکھی سطروں کے بیچ عورت ایک اور روپ لے کر جلوہ گر ہوتی ہے۔ جو عورت کا حقیقی عکس قارئین ادب کے ذہنوں پر چھوڑتی ہے۔ ان کا قلم سماجی بے قاعدگیوں پر پے در پے ضرب لگا رہا ہے۔ اردو ادب میں تیزی سے افسانوی حیثیت اختیار کرنے والی نسترن فتیحی نے برصغیر کے مرد بالا دستی والے سماج میں خواتین کے مساوی حقوق کا علم اٹھایا ہے اور اپنی تحریروں سے اسے ایک تحریک میں تبدیل کرتی نظر آتی ہیں، اور شاید اسی جزبے کے تحت پیش نظر کتاب وجود میں آئی، مجھے یقین ہے کہ اسے ادبی دنیا میں پزیرائی ملے گی۔ نسترن احسن فتیحی نے بڑی سرعت سے اپنے افسانوں سے پہچان بنائی اور ہمیں ان کی تحریروں سے اندازہ ہوا کہ اپنے اطراف عورت کو محروم، محکوم اور مظلوم پا کر اسے مرد کے برابر ثابت کرنے کے لیے ان کا قلم تیزی سے گردش میں ہے۔ ان کے افسانے ایک تحریک ہی نہیں بلکہ اردو ادب میں ستون کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ وہ عورت اور مرد کی تخصیص ختم کر کے انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھنے کی خواہاں نظر آتی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ نسترن احسن فتیحی کا قلم عورت کی بالا دستی، حقوق نسواں اور عورت پر جبر کے خلاف بھرپور قوت سے ان نادیدہ طاقتوں پر برستا رہے۔ تاوقتیکہ عورت سماج کی سب سے بڑی مزاحمتی دیوار بن کر انقلابات کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

سید صداقت حسین

کراچی

جدلیاتی، ثقافتی، صنفی اور نفسیاتی مطالعہ کی، مختلف سطحوں پہ، ضرورت محسوس کی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ متن کی سوالیات پہ غور کیا جانے لگا۔ اردو تنقیدی روایت میں خوشگوار حیرتوں کے باب کھلتے جا رہے ہیں۔ انسانی ثقافتی ہے یا فطری (جبلتی)، انسان (مرد و زن) کی موضوعیت کیسے تشکیل پاتی ہے، عورت کا بدن ایک مفعول متن کیونکر ساخت ہوتا ہے وغیرہ ایسے سوالات ہیں جو آج کے قاری کو مضطرب کرتے ہیں۔ جواب کے لئے ہمیں تاریخ اور طاقت کے مراکز میں تشکیل پانے والی درسی نظامت کو سمجھنا ہوگا جس کے سبب سرمائے کے عالم گیر پراجیکٹ کی تکمیل ہوتی رہی اور لوک ورثہ متاثر ہوتا رہا۔ ایسا نہیں کہ فوک کلچر میں عورت کی حیثیت ثانوی نہیں تھی، ایسا ہے کہ کھیتوں میں کام کرنے والے فطرت کے وسائل سے یکساں مستفید ہوتے تھے۔ اگر کیکر مذکر تھا تو ٹاہلی مونث دونوں کی اہمیت ایک جیسی تھی۔ لیکن صنعتی معاشرت اور صارفی ثقافت نے مارکیٹ سے فوک اقدار اور 'حیاتیاتی اخلاقیات' کو شکست دے دی۔ ہندوستان کے صوبہ اتراکھنڈ میں چپکو تحریک چلی جس سے نوآبادیاتی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور مقامی عورت کی مزاحمت ماحولیاتی مادریت کے ڈسکورس میں بائنری کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

ایکوفیمینزم کے سوالات لبرل فمینزم سے مختلف ہیں کیوں کہ بنیادی طور پہ یہاں عورت کی بغاوت نہیں بلکہ کھیت اور 'کھیتیوں' کی اہمیت و افادیت کو عورت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔، ایکوفیمینزم انسانی زندگی کی زرخیزی اور سبزہ زاری کو نامیاتی وحدت سے متشکل کرنے کی کوشش ہے۔ اس شعور کی رو کے مطابق لالچ افروز متون ثقافتی نصابوں کا حصہ بنتے رہے اور زمین اور عورت سکڑتی چلی گئیں۔ سرسبز و شاداب فطری جہن کی اینکر و چمنٹ اور عورت کے استحصال کے درمیان تعلق بھی تاریخی ذہن سازی کا خاصا ہے۔ یوں کہ کمزور، عورت اور نیچر کی تثلیث میں لازمیت اور ابدیت سٹیریو ٹائپ کی گئی۔ ایسی مباحث سے بلاشبہ نظر اور نظریات کی تفہیم و تعبیر کے حوالے سے نئے سوالات کو جگہ ملتی ہے۔ جنگ و جدل، وسائل پہ قبضہ کی خواہش اور چادر اور چار دیوری کے (پسِ) ساختیاتی مطالعہ سے نسلی، لسانی اور صنفی امتیازات تک کی پرکھ بھی آج کے

ہو رہا ہے اور ان کے قدرتی مسکن کو تباہ کیا جا رہا ہے اور مزید بہت سے حیاتیاتی اور طبی مسائل ابھر رہے ہیں۔

لوک ادب اور ماحولیات

یوں تو لفظ ''لوک'' سے مراد انسان، آدمی، بشر، لوگ، مرد، عالم ارواح، دنیا، عالم، جہاں ہوتے ہیں، لیکن اردو ادب میں لوک ادب سے مراد عوام کے ذریعہ خلق کیا گیا وہ ادب ہوتا ہے جس کا تعلق قدیم قبائلی نظام اور اس میں موجود رسم و رواج، بولی ٹھولی، تیج تہوار اور مذہبی رسومات وغیرہ سے ہو۔ لوک ادب انسان کے ذہنی ارتقا کا علامیہ ہے۔ توہمات کو ذہنی ارتقا میں ایک خاص مقام حاصل ہے اور ان توہمات سے ابھرنے والے احساس اور آزادی کی جستجو نے لوک ادب کو جنم دیا۔ لوک ادب سے موضوعات کا تعین ایک مشکل کام ہے، لیکن ہمارے دائرہ نظر میں جو موضوعات ہیں، ان میں کائنات کی تکوین، اس کے نظم و ضبط، دیوتاؤں کی پیدائش، انسان کی تخلیق، دیوی دیوتاؤں کی محبت، نفرت، بے پناہ عشق رقابت، بغض، کینہ، عناد، سازشیں اور عذاب و عتاب وغیرہ شامل ہیں۔

لوک ادب کی ابتدا انسانی زندگی کے ارتقا کے ساتھ ہوئی، لوک ادب انسانی وجود کے طویل عرصے پر پھیلے ہوئے احساسات اور تجرباتی سفر کی روداد ہے۔ ایک طویل عرصے تک یہ سب کچھ سینہ بہ سینہ چلتا رہا۔ تحریر کی صورت اس وقت ممکن ہوئی جب رسم الخط وجود میں آیا۔ لوک ادب کسی نہ کسی تاریخی، تہذیبی، سماجی اور لسانی پس منظر کا حامل ہوتا ہے۔ سماجی پس منظر کے طور پر حیرت انگیز، محیر العقول اور دلچسپ واقعات و حکایات کو اپنے اندر سمیٹے ہوتا ہے جس کے سہارے ہم ماضی کے دریچوں میں جھانک کر قدیم سماجی و تاریخی حقائق کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ انسانی معاشرے کے فکری و اخلاقی ارتقا و زوال کا اندازہ بھی لوک ادب کے توسط سے لگایا جا سکتا ہے۔ لوک ادب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر کسی قسم کی بنیادی تبدیلی یا ترمیم و اضافے کو شاذ ہی

روا رکھتا ہے اس لیے سیکڑوں ، بلکہ ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود ان کی شکل و صورت اس حد تک کبھی نہیں بدلتی کہ اصل شناخت ناممکن ہو جائے۔لوک ادب کی یہ خوبی قوموں کی تاریخی ،ثقافتی ،معاشرتی ،فکری ،فنی ،لسانی اور ادبی خصوصیات کی بقا میں معاون ہوتی ہیں۔ کسی بھی زبان میں لوک ادب کے سرمایے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔لوک ادب انسان کا وہ سرمایہ ہے جو اس کی زندگی کو اس کے ادبی تہذیب وتمدن اور ثقافت کے اظہار سے ملتا ہے۔ سماج کے نشیب و فراز ، اس کے نظام ترکیبی اور اس کی گنگا جمنی بوقلموں کیفیتوں کو جس طرح لوک ادب ظاہر کرتا ہے وہ اس کی اہمیت کا ثبوت ہے۔

دیگر ہندوستانی زبانوں کی طرح اردو کی بھی عوامی جڑیں ہیں اور اس کا دامن عوامی جذبات کی ترجمانی کرنے والے لوک ادب کی روایت سے مالا مال ہے۔ اردو زبان کی تشکیل ہی مختلف قوموں کے باہمی میل جول اور اجتماعی ارتباط کا نتیجہ ہے۔ اردو معاشرے میں بھی اپنی ماؤں سے لوریاں سنی جاتی رہیں،ان کی ولادت پر گیت بھی گائے گئے۔سردیوں کی کپکپاتی اور ٹھٹھرتی راتوں میں ان کی دادیوں اور نانیوں نے کہانیاں بھی سنائیں۔ان کی گھریلو تقریبات میں ڈھولک کی تھاپ پر کنواریوں اور شادی شدہ عورتوں نے گیت بھی الاپے۔ ڈومنیوں نے انکی شادی بیاہ کے موقع پر شادیانے بھی بجائے۔ البیلے موسموں نے ان کے دلوں میں ترنگ بھی پیدا کی۔انہوں نے ساون میں جھولا بھی جھولا۔صدیوں سے ہندوستانی معاشرے میں یہ سب ہوتا آیا ہے۔شمالی ہند میں اردو اور ہندی کا علاقہ مشترک رہا ہے۔ دونوں ایک زمین ،ایک جیسی تہذیب ،مشترک آب وہوا کی پروردہ ہیں۔اردو اور ہندی بولنے والوں کی آبادی اکثر ملی جلی رہی ہے،اس لیے اردو اور ہندی کے لوک ادب ،لوک گیت ،لوک قصوں ،لوک کہانیوں اور لوک کہاوتوں کا بہت بڑا سرمایہ مشترک ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر علاقے کے لوک ادب کو اس علاقہ کی بولیوں اور تہذیبی وتاریخی حقائق نے متاثر کیا ہے۔

1857ء میں جب انگریزوں کے خلاف باغیانہ جذبات کی آگ پھیلی تو عورتوں کے دلوں میں بھی وطن دوستی کے جذبات جاگ اٹھے اور انہوں نے اپنی جرات

اور شجاعت پر مبنی شاعری لوک ادب کے رنگ میں گائیں، جن میں ان کی بہادری اور طاقت و ہمت کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ تحریک آزادی اور تحریک خلافت کے اجتماعی جوش و خروش کی ترجمانی کے لیے جو عوامی گیت لکھے گئے، وہ لاکھوں انسانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ ''آب حیات'' میں محمد حسین آزاد نے بھی لوک گیتوں کا ذکر کیا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک موقع پر لکھا ہے:

''ممکن ہے میرے آرٹ کی شاہکار نظمیں فراموش ہو جائیں، لیکن میرے گیت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔''

ٹیگور کے گیتوں کی ہمہ گیر مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے بنگال کے عوام کی من موہنی دھنوں میں اپنے گیتوں کو ڈھالا ہے۔

اردو لوک ادب میں بھی ہر موقع کے گیت، ہر تقریب کے گیت ماحولیات سے ہمارے جذباتی رشتوں اور تہذیبی قدروں کی آئینہ دار ہیں۔ اردو لوک گیتوں کی بعض دوسری اصناف میں بھی ماحولیات سے ہمارے جذباتی رشتوں اور تہذیبی قدروں بڑا وقیع سرمایہ موجود ہے۔ مثال کے طور پر ''بارہ ماسہ، چکی کے گیت، ساون کے گیت، دوہے، چہار بیت، دکھڑے اور زاریاں'' وغیرہ سیکڑوں ایسی اصناف دیہی علاقوں میں مشہور و مقبول ہیں جن میں ماحولیات سے ہمارے جذباتی رشتوں اور تہذیبی قدروں کا اظہار ملتا ہے۔ دکھڑے اور زاریاں کا مقصد کسی قریبی عزیز یا دوست کی موت پر بین کرنا ہوتا ہے۔ ''زاریاں'' موت کے علاوہ دوسری طرح کی مصیبتوں اور دکھ درد کے موقعوں پر بھی عورتیں تنہا یا مل کر گاتی ہیں۔ ''چہار بیت'' جو پشتو علاقے کی دین ہے میں بھی ماحولیات سے ہمارے جذباتی رشتوں کا اظہار ملتا ہے، یہ ناخواندہ قبائلی افغانی پٹھان فوجیوں، روہیلوں کے نغمے کی صورت میں پشتو زبان سے اٹھارہویں صدی میں اردو میں آئی تھی اور شمالی ہندوستان میں متعارف کرائی گئی تھی اس کا رواج یوپی کے علاقوں مثلاً رام پور، شاہ جہاں پور، بچھرایوں، سنبھل، امروہہ، مراد آباد، روہیلکھنڈ، راجپوتانہ، مدھیہ پردیش، بھوپال، آندھرا پردیش اور خاص طور سے راجستھان ٹونک وغیرہ میں رہا ہے اور

مشرقی بہار کے اضلاع پورنیہ، ارریہ، کشن گنج، کے تعلیمی اداروں میں اس صنف کو جہاں ادبی مقام حاصل ہے وہیں دہقانی زندگی میں یہ ماحولیاتی ثقافت کا پیش خیمہ بھی ہے۔ چہار بیت شعری محفلوں میں لوگ اجتماعی طور پر کورس کی شکل میں گاتے ہیں اور دف بجاتے ہیں اور جوش وخروش کے عالم میں اچھلتے، کودتے اور ناچتے گاتے ہیں۔ لوک ادب میں عوام کی زندگی، سوجھ بوجھ اور طرز فکر کا عکس صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جور یہی وجہ ہے کہ اس میں ماحولیات کا ذکر ملتا ہے۔ لوک ادب میں عام لوگوں کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ہزاروں سال سے انسانی تہذیب کا اٹوٹ حصہ بنی ہوئی ہے۔ انسانی سماج کو ہر سطح پر اس کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ سماج کا ایک بڑا طبقہ لوک ادب کو زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ یہ ایک طرح سے زندگی کے متعلق عوامی فلاسفی یا عوام کے تصورات کا مظہر ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ان میں تبصرہ یا رائے زنی ہوتی ہے۔ لوک ادب میں عوامی کلچر اور عوامی طرز فکر کے سارے ہی پہلو اس خوبی سے سمٹ آتے ہیں کہ اگر کوئی پوری قوم فنا ہو جائے اور لوک ادب باقی رہ جائے تو اس گمشدہ تہذیب کے بیشتر عناصر کو اس کے توسط سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ان کے وسیلے سے کی جانے والی بازیافت میں تہذیب کی زیریں سطح یعنی عوامی کلچر کو ہی نمایاں حیثیت حاصل ہوگی۔ کیونکہ لوک ادب نہ صرف عوامی کلچر کی بطن سے جنم لیتا ہے، بلکہ اس کلچر کی تشکیل، تعمیر اور اس کے انضباط واستحکام میں بھی اس کا رول بہت اہم ہوتا ہے۔ یہ ادب عوامی اور اجتماعی ہوتا ہے، اسے عوام اپنے مروجہ عقائد اور رسم ورواج، تہذیبی تصورات اور اجتماعی نفسیات سے قریب پاتے ہیں۔ اسی طرح لوک ادب مختلف ادوار کے عام انسانی سماج کے رسم ورواج، عقائد وافکار اور تجربات ومشاہدات کا آئینہ دار ہے۔ ہندوستانی سماج کے طبقاتی نظام، نسلی امتیاز، امیری وغریبی کا فرق، آپسی بھید بھاؤ اور ذات پات کی تفریق یا پابندی سے متعلق عوامی ردعمل کو بھی اس میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے لوک گیتوں میں سادگی، برجستگی، معصومیت، بے لوث اپنائیت اور سچائی پنہاں ہوتی ہیں۔ یہ تصنع سے دور خلوص وجذبات میں رچے بسے گیت، جب کسی کی سماعت سے

ٹکراتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے عقائد، نظریات، زبان، ذات پات، دولت، غربت، آسودگی و افسردگی کی بھی دیوار ڈھے جاتی ہے اور انسان ان تمام بندشوں سے آزاد خالص انسانیت کے اعلیٰ مقام کو چھونے لگتا ہے ماحولیات سے محبت کی یہی روح ہے جو ان گیتوں میں سمائی ہوئی ہے۔ لوک گیت لوگوں کے دلوں کی گہرائی سے نکلے وہ جذباتی بول ہیں جو شعری و لسانی ضابطوں اور پابندیوں سے آزاد ہیں، لیکن پھر بھی ان میں ایسا لحن اور سُر ہوتا ہے جو سننے والے کو نہ صرف مسحور کرتا ہے بلکہ متاثر بھی کرتا ہے۔

میرے نہیر سے آج مجھے آیا
یہ پیلا جوڑا یہ پیلا جوڑا یہ ہری ہری چوڑیاں

اب کے پھولی بسنت میرے خالو کے گھر
پیاری خالہ نے بھیجا مجھے یہ پھولوں کا کنگنا
یہ پھولوں کا کنگنا یہ ہری ہری چوڑیاں
میرے نہیر سے آج مجھے آیا
اب کے پھولی بسنت میرے تایا کے گھر
تائی اماں نے آج مجھے بھیجا ابٹن سرمہ
یہ ابٹن سرمہ یہ ہری ہری چوڑیاں
میرے نہیر سے آج مجھے آیا
اب کے پھولی بسنت میرے بھیا کے گھر
بھابھی نے آج مجھے بھیجا زیور کنگنا
یہ زیور کنگنا یہ ہری ہری چوڑیاں
میرے نہیر سے آج مجھے آیا

نجر لاگی راجا تورے بنگلے پر
جو میں ہوتی راجا کالی کویلیا
کہک ہتی راجا تورے بغگلے پر
نجر لاگی راجا تورے بنگلے پر

نجر لاگی راجا تورے بنگلے پر
جو میں ہوتی راجا جوہی چمیلیا
مہک رہتی راجا تورے بنگلے پر
نجر لاگی راجا تورے بنگلے پر

جو میں ہوتی راجا کالی بدریا
برس رہتی راجا تورے بنگلے پر
نجر لاگی راجا تورے بنگلے پر
اچھے بنے مہندی لاون دے
ہریالی بنے مہندی لاون دے
خسرو پیا کے من بھاون دے
اچھے بنے مہندی لاون دے

یہ مہندی موری اجب رنگیلی
خسرو مہندی رچاون دے
اچھے بنے مہندی لاون دے
ہریالی بنے مہندی لاون دے

لوک ادب اپنے اندر سماجی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی قدروں کی ایک وسیع دنیا آباد کیے ہوئے ہے۔ یہ گیت ہماری تہذیب، رسم و رواج، عقائد اور رشتوں کا جامع انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ ان گیتوں کی زبان خواہ کتنی ہی کھردری کیوں نہ ہو، الفاظ اور لہجے میں خواہ کتنا ہی عامیانہ پن کیوں نہ جھلکتا ہو، ادائیگی میں خواہ کتنی ہی بدسلیقگی کیوں نہ ہو، لیکن ان میں جن جذبات کا اظہار ملتا ہے، ان میں امنگ، جوش، ولولہ، مثبت و تعمیری فکر اور ماحولیات سے محبت کی لہریں ملتی ہیں۔

سرائیکی اور پنجابی صوفی شاعری میں ایکوفیمینزم کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں

پیلوں پکیاں نی۔ خواجہ غلام فرید

آچنوں رل یار
پیلوں پکیاں نی وے

(پیلو پک گئی ہیں، میرے دوست آجاؤ انہیں مل جل کر اکٹھا کریں)۔

کئی بگڑیاں کئی ساویاں پیلیاں
کئی بھوریاں کئی پھکڑیاں نیلیاں
کئی اودیاں گلنار
کٹویاں رتیاں نی وے

(یہ بہت ہی خوبصورت رنگوں کی ہیں۔ ان میں کچھ سفید ہیں، کچھ سبز اور زرد ہیں، کئی بھوری اور ہلکے رنگ کی ہیں، کئی دودھیا رنگ کی ہیں اور کئی نہایت سرخ گل اناری رنگ کی ہیں)۔

بار تھئی ہے رشک ارم دی
سک سڑ گئی جڑ دکھ تے غم دی
ہر جا باغ و بہار
ساکھاں چکھیاں نی وے

(ان کی وجہ سے ویرانہ، رشکِ ارم بن گیا ہے۔ ہر طرف باغ و بہار کا سماں بندھ گیا ہے۔ غم و الام کی بنیاد ختم ہوگئی ہے۔ سبھی لوگ اس پھل سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، کیا تو نے

بھی انہیں چکھا ہے)۔

پیلوں ڈیلھیاں دیاں گلزاراں
کہیں گل ٹوریاں کہیں سر کھاریاں
کئی لا بیٹھیاں بار
بھر بھر پچھیاں نی وے

(پیلوں اور کریر کے پھلوں نے ریگزار کو رشکِ گلزار بنا دیا ہے۔ انہیں چننے کے لئے کسی نے ہلکی ٹوکری گلے میں لٹکائی ہے اور کسی نے سر پر ٹوکرا رکھا ہوا ہے۔ کئی ٹوکریاں بھر بھر کر اور انبار بنا بنا کر بیٹھی ہیں)۔

جال جلوٹیں تھئی آبادی
پل پل خوشیاں دم دم شادی
لو کی سہنس ہزار
کل نے پھکیاں نی وے

(ہر جھاڑی کے پیچھے لوگوں کے ٹھکانے بن گئے ہیں، ہر طرف انبساط و مسرت کا دور دورہ ہے۔ سینکڑوں ہزاروں آدمی ان پیلوں کو مٹھیاں بھر بھر کر کھا رہے ہیں)۔

حوراں پریاں ٹولے ٹولے
حسن دیاں ہیلاں برہوں دے جھولے
راتیں ٹھڈیاں ٹھار
گوئلیں تتیاں نی وے

(یہاں کی مہ جبیں، حور شمائل، پری پیکر لڑکیاں ٹولیاں بنا کر پیلوں چن رہی ہیں۔ ہر طرف حسن و جمال اور عشق و محبت کی جلوہ آرائی ہے۔ راتیں سرد ترین لیکن گھر خاصے گرم ہیں)۔

رکھدے ناز حسن پروردے
ابرو تیغ تے تیر نظر دے
تیز تکھے ہتھیار
دِلیاں پھٹیاں نی وے

(حسن و جمال کے پروردہ ہی "رہزن" تیغِ ابرو اور تیرِ نظر جیسے ہتھیاروں سے لیس ہو کر دلوں کو زخمی کر رہے ہیں)۔

کئی ڈیون ان نال برابر
کئی گھِن آون ڈیڈھے کر کر
کئی وِکن بازار
تلیاں تکیاں نی وے

(پیلوں کی خرید و فروخت بھی عجب رونق افزا ہے، کئی اناج کے بدلے فروخت کر رہی ہیں، کئی ڈیڑھ گنا زیادہ قیمت وصول کر رہی ہیں اور کئی وزن کر کے بازار میں بیچ رہی ہیں)۔

کئی ڈھپ وچ وی چنڈھیاں رھندیاں
کئی گھِن چھان چھنویرے بہندیاں
کئی چن چن پیاں ہار
ہٹیاں تھکیاں نی وے

(کئی عورتیں شدید تمازت کے باوجود پیلوں چنتی رہتی ہیں، کئی سائے میں بیٹھی ستا رہی ہوتی ہیں اور کئی چن چن کر تھک ہار بیٹھی ہیں)۔

ایڈوں عشوہ غمزے نخرے
اوڈوں یار خرایتی بکرے
کسن کان تیار

راندا ں رسیاں نی وے

(اِدھر سے ناز و ادا ہیں، ادھر سے صاحبانِ نظر قربانی کے بکروں کی طرح ذبح ہونے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ کیسے مزے کے کھیل رچے ہوئے ہیں)۔

پیلوں چنڈیں بوچھن لیراں
چولا وی تھیا لیر کتیراں
گلڑے کرن پچار
سینگیاں سکیاں نی وے

(پیلوں چنتے ہوئے کسی کا کا دوپٹہ پھٹ جاتا ہے، کسی کا کرتہ تار تار ہو جاتا ہے اور سہیلیوں کی ہنسی مذاق کا نشانہ بن جاتی ہے)۔

آیاں پیلوں چنن دے سانگے
اوڑک تھیاں فریدن وانگے
چھوڑ آرام قرار
ہکیاں بکیاں نی وے

(وہ آئیں تو پیلوں چننے کی خاطر تھیں لیکن فرید کی طرح تیرِ عشق سے ایسی گھائل ہوئیں کہ اپنا آرام سکون چھوڑ کر نقشِ حیرت بن گئیں)۔

(ترجمہ: سبلن علی اور واصف علی واصف)

پنجابی سرائیکی کی تقریباً ساری لوک شاعری اور صوفی شاعری میں ماحول ایک جیتا جاگتا کردار بن کر سامنے آتا ہے۔ اس شاعری میں ماحول علامت بھی ہے اور استعارہ بھی مزے کی بات یہ کہ اس تمام شاعری میں راوی ہمیشہ عورت ہے

تنقیدی شعور کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ زمین زاد اور زمین زادی دونوں فطرت کا حصہ (رہے) ہیں لیکن یک طرفہ تاریخی دھارے نے مصنوعی مصنوعاتی ثقافت کے فروغ کے سبب ارتھلنگز میں تخفیفی رویے کاشت کئے ہیں۔ اس امتیازی ڈسکورس کی غیر اتفاقاتی ثقافت پہ سوالیہ نشان نئی صدی کا اہم باب ہے۔ ایکوفیمیزم اور نسائی بیانوی متون کا یہ مطالعہ ڈاکٹر نسترن کی تنقیدی بصیرت کا عکاس ہے۔ اس کتاب میں عورت، تخلیق، ماحولیات اور سماج کے تعلق سے جن نکات پہ روشنی ڈالی گئی ہے وہ آج کی پوسٹ کولونیل دنیا سے بھی متعلق ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس تنقیدی کام کی اہمیت و افادیت سے مستقبل قریب میں نئے تحقیقی زاویے سامنے آئیں گے۔

فرخ ندیم
انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی
اسلام آباد۔ پاکستان

صوفی ادب کی ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو میں ایسے لوک ادب کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے جن میں ماحولیات سے محبت کا اظہار ملتا ہے۔ ضرورت ہے اس کی تلاش و تحقیق کی۔لوک ادب کے بارے میں برصغیر ہی نہیں، بلکہ یورپ کے ادیبوں اور نقادوں نے انیسویں صدی تک ہتک آمیز رویے کا مظاہرہ کیا اور اسے جاہل گنواروں کی تک بندی سمجھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ انسانی کی اجتماعی فکر کی روایت کو لوک ادب ہی نے محفوظ رکھا۔ یہ سرمایہ ادب آج کی تیز رفتار زندگی میں نفسانفسی کے شکار انسان کی ترجیحات سے معدوم ہو گیا ہے۔لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی ترکیب و تہذیب میں ہر شخص کا حصہ ہوتا ہے اور ان میں سماج کی اجتماعی روح کارفرما ہوتی ہے اس لیے انہیں لوک ادب کہا جاتا ہے۔

مثلاً لوک داستانوں کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ان میں مسائل زیست کا کھرا اور بے لاگ تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ عالمی ادب و تاریخ کا ایک مستقل، مسلسل اور اہم مآخذ ہیں۔ یہ ادب عام آدمی کے لاشعور کا عکاس ہوتا ہے۔اور اس میں مقامی ثقافتی شعور اور ہمہ گیر دانائی و دانش کی جاذبیت بھی نمایاں ہوتی ہیں پنجاب میں لوک داستانیں، قصے، روایات پنجاب کے کلچر کا جاندار حصہ ہیں۔ یہ عوام کی تفریح کا ذریعہ ہی نہیں ان کی ذہنی، نفسیاتی، معاشرتی و اخلاقی تربیت کا وسیلہ بھی ثابت ہوتی ہیں۔ دنیا بھر کا لوک ادب سماجی حدود پھلانگ کر محبت و الفت اور عہد و پیمان نبھانے والوں کو ہیرو اور ہیروئن کے طور پر پیش کرتا ہے۔ جس کردار و صفات کو سماج نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے وہی کردار لوک ادب کی جان بن جاتے ہیں اور جو لوگ داستانوں میں محض عشق حقیقی اور عشق مجاز ہی کو بھرپور انداز میں دیکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے پنجابی کے نقاد و ادیب شریف کنجاہی کی یہ بات ہی کافی ہے کہ اس روگ سے گلوخلاصی کر لینی چاہئے تاکہ دکھی سماج کو سکھی بنایا جا سکے۔ ہماری پنجابی لوک داستانیں بظاہر عشقیہ المیے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ انسان نے اپنی رومانی ترقی کو کسی حال اور کسی عہد میں بھی نظر انداز نہیں کیا۔ وطن پرستی اور

احساس قومیت بھی ان داستانوں کا نمایاں وصف ہے۔ جس عہد میں یہ داستانیں رقم ہوئیں اس وقت پنجاب کا معاشرہ بڑی تبدیلی کے عمل سے گذر رہا تھا اسی لیے کسی نے لکھا ہے کہ ''مہینوال کی موت ایک تہذیب کا خاتمہ اور دوسری تہذیب کی ابتداء ہے فضل شاہ نے عشق کے محاورے میں مہینوال کو مغلیہ تہذیب کے زوال کی علامت بنا کے پیش کیا۔ وارث شاہ کے زمانہ جامد تصورات کا زمانہ ہے اس لیے وارث شاہ کا پنجاب کی ابتر صورتحال پر تنقید ضرور کرتا ہے تاہم ایک دانشور کے ناطے جدید معاشرے کی بنیادوں کی نشاندہی نہیں کر پایا۔ لوک ادب دنیا کی تمام اقوام کا سنہری بچپن ہے۔ ہر قوم اور معاشرہ اپنے جداگانہ لوک ادب کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے۔ لوک داستانوں سے آگاہی کے بغیر عوامی فکر کا ارتقاء ممکن نہیں۔ نسل نو کو لوک ادب سے متعارف کروا کے جدیدیت کی روایت کو مستحکم کیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی تلاش میں ہم اپنی تہذیب کے مرکزی اصولوں تک پہنچ جائیں جو جدید تہذیب کے مرکزی اصولوں سے مختلف ہیں اسی طرح قدیم اور جدید کا فرق واضح ہو کر ہمارے سامنے آئے گا۔ وہ فرق جو صرف دو تہذیبوں کا فرق نہیں بلکہ دو ذہنیتوں کا فرق ہے۔ ادب فہمی کا فروغ ہمیں مضبوط فکر انسان بنا سکتا ہے جس کی بنا پر ہم کئی حقیقتوں کو تلاش کرنے کی ہمت اور جرات کر پائیں گے۔ ہمارے پاس اپنا تخیل نہیں رہا۔ ہم دوسروں کے ذہنوں سے سوچتے ہیں اسی لیے دیگر تہذیبوں کے کارندے پیدا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر پا رہے۔ تخیل کی پرواز سے ہی عمل کی تعبیر حاصل ہو پائے گی۔ نئی نسل کو سوچنے اور ان کی قوت تخیل کو مستحکم کرنے کے لیے انہیں داستانوں سے متعارف کروانا ضروری ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے۔

اردو ادب میں ماحولیات

ماحولیات، فطرت نگاری یا نیچریت یا نیچرل ازم صرف مظاہرِ فطرت کے بارے میں لکھنے کا نام نہیں جیسا کہ اردو ادب میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ محض درختوں، پھولوں، جنگلوں، پہاڑوں، پرندوں، گلہریوں، چوپایوں وغیرہ کا ذکر فطرت نگاری نہیں۔

لفظ ماحولیات یا فطرت یر اگر ہم غور کریں تو احساس ہوتا ہے کہ اردو میں کوئی واضح فرق نہیں۔ حفیظ صدیقی کی مرتب کردہ تنقیدی اصطلاحات کی کتاب کے مطابق ادب اور فن کی دنیا میں لفظ فطرت چار مختلف مضمونوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۱ صحیفہء فطرت یعنی خارجی کائنات،
۲ قوانینِ فطرت،
۳ ہر چیز کی مخصوص افتادِ طبع اور
۴ انسانی سرشت۔

ادب وفن میں یہ اصطلاح وسیع معانی کی حامل ہے۔ اشیا، انسان اور دیگر جاندار، مظاہرِ قدرت اور ان کی طبعی حالت، انسانی جبلت، سادہ پرستی اور یہاں تک کہ طبعی اخلاق اور مذہب بھی نیچرل ازم میں آتے ہیں۔ اس لحاظ سے فطرت نگار یا نیچری محض مظاہرِ فطرت کے بارے میں لکھنے والا، ان کی منظر نگاری کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ فطرت میں عقیدہ رکھنے والا، فطرت پرست، طبعی تاریخ، علم طبیعات اور حیوانات کا ماہر بھی ہوتا ہے۔ دراصل فطرت نگاری حقیقت نگاری کا وہ انداز ہے جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں نمودار ہوا اور جسے فرانسیسی ادیبوں زولا اور موپساں نے اپنایا۔ ادبی مواد اور موضوعات میں آزادی اور فطری انسانی جذبات واحساسات کا اظہار اس ادبی اسکول یا مسلک کی اہم خصوصیات ہیں۔ اگر فلسفے کی رو سے دیکھا جائے تو ادب میں جمالیات مظاہرِ فطرت ہی کی دین ہے اور جمالیاتی حسیات میں انہی مظاہر کا اظہار جھلکتا ہے۔ شاید ہی کوئی اعلی درجہ کا ادب یا فن پارہ ہو جس میں مظاہرِ فطرت کے اثرات نہ ہوں۔ فیثا غورث، سقراط، ارسطو، ہیگل اور دیگر فلسفیوں کے نظریات کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ادبی جمالیات، تخلیقی قوت اور مظاہرِ فطرت کا باہمی تعلق کتنا گہرا ہے۔ ارسطو نے تو فطرت کو تخلیق کا سب سے بڑا استعارہ قرار دیا ہے۔ ہیگل نیچریت کے فلسفے کا بانی تھا۔

اردو ادب میں سب سے پہلے سرسید احمد خاں کی تحریک نے اردو نظم میں فطرت نگاری پر بڑے اثرات مرتب کیے اور ادب میں فطرت نگاری ایک تحریک کی شکل اختیار

کر گئی۔ سرسید کے مخالفین طنزاً انہیں نیچری کہا کرتے تھے۔ اردو میں نیچرل شاعری کی اصطلاح مولانا آزاد اور مولانا حالی کے ذریعے متعارف ہوئی۔ جدید نظم کے تشکیلی دور میں عبدالحلیم شرر کی مثال دی جاسکتی ہے جو علی گڑھ تحریک کے رکن تھے۔ اس دور اور فوراً بعد کے دیگر شعرا میں نظیر اکبر آبادی، الطاف حسین حالی، اسماعیل میرٹھی، علامہ اقبال، ظفر علی خان، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، احسان دانش وغیرہم شامل ہیں۔ میر انیس اور میر حسن کی مثنویاں بھی اس ذیل میں رکھی اور پرکھی جاسکتی ہیں۔ جب کہ اردو کے جدید تر ادب بطورِ خاص شاعری میں فطرت نگاری سے لبریز فن پارے موجود ہیں۔ لیکن انہیں ایک خاص عہد سے آگے آکر اور ایک نصابی طرزِ فکر سے ہٹ کر پرکھنے والے نقاد نہیں۔

انگریزی اور امریکی ادب بالخصوص شاعری کے حوالے سے اردو میں ایک نصابی سی فہرست ہے۔ کولرج، بائرن، کیٹس، ورڈزورتھ، شیلے، رابرٹ فراسٹ وغیرہ۔ لیکن امریکہ کے سٹیفن کرین اور فرینک نورس کو زیادہ نہیں جانا جاتا حالانکہ فرینک کرین کو پہلا امریکی نیچرلسٹ کہا جاتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدیاں جہاں سائنسی ایجادات کی تھیں وہاں شعر و ادب میں یہ فطرت نگاری کی صدیاں تھیں۔ یہ نصابی جبر ہے کہ جب اردو میں فطرت نگاری کی بات ہوتی ہے تو موسموں، چوہوں، گلہریوں اور گایوں پر بچوں کے لیے لکھی نظموں سے آگے نہیں بڑھتی۔ اقبال کی بانگ درا کی نظمیں اس کی مثال ہیں

ابر

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا
نہاں ہوا جو رخ مہر زیر دامن ابر
ہوائے سرد بھی آئی سوار توسن ابر
گرج کا شور نہیں ہے، خموش ہے یہ گھٹا

عجیب مے کدے خروش ہے یہ گھٹا
چمن میں حکم نشاط مدام لائی ہے
قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے
جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے، اٹھے
زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے، اٹھے
ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل
اٹھی وہ اور گھٹا، لو! برس پڑا بادل
عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا

چاند

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن
قصد کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو؟
زرد رُو شاید ہوا رنجِ رہِ منزل سے تو
آفرینش میں سراپا نور تو، ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں
آہ! میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاق دید سے
تو سراپا سوز داغِ منتِ خورشید سے
ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثالِ گردشِ پرکار ہے
زندگی کہ رہ میں سرگرداں ہے تو، حیراں ہوں میں
تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہے، سوزاں ہوں میں

میں رہِ منزل میں ہوں، تو بھی رہِ منزل میں ہے
تیری محفل میں جو خاموشی ہے، میرے دل میں ہے
تو طلب خو ہے، تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا، عشق میرا نور ہے
انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو، تنہا ہوں میں
مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغامِ اجل
محو کر دیتا ہے مجکو جلوہ حسنِ ازل
پھر بھی اے ماہِ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو سے اٹھتا ہو وہ پہلو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دُور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے، جبیں جس سے تری محروم ہے

اور جب انگریزی ادب میں فطرت نگاری کی بات کی جاتی ہے تو بات بس انگلستان کے ادب سے آگے نہیں بڑھتی۔ جبکہ امریکی ادب اور لاطینی امریکہ میں بھی فطرت نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اس ضمن میں گارشیا مارکیز اور پابلو نیرودا کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ جب تک ہم ماحولیات یا فطرت نگاری کے اصل اور وسیع تر معانی نہیں سمجھتے ہم جدید ادب، چاہے وہ فکشن ہو یا نظم، ماحولیات کی صحیح تفہیم نہیں کر سکتے اور نہ اس کی ارفعیت کا تعین کر سکتے ہیں۔

باب۔۲

عصری تانیثی اردو افسانہ
اور ایکوفیمینزم کا تصور

تجربات، احساسات اور مشاہدات کو ذاتی بلکہ نجی حوالے کے ساتھ پرکھنے کے بعد انھیں تمام جزئیات کے ساتھ احاطہ تحریر میں لانا فنی مہارت کی دلیل ہے۔ اس پس منظر میں اردو افسانوی ادب کا جائزہ بھی ضروری ہے تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ اردو افسانوی ادب میں ''ماحولیاتی مادریت'' یا ''ایکوفیمینزم'' کا کوئی تصور کارفرما ہے یا نہیں۔ یا اردو افسانوں پر مادرسری معاشرے کے اثرات نظر آتے ہیں یا نہیں۔ یہ باب اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے کیونکہ اس باب میں تانیثی افسانوی ادب کے غیر روایتی موضوعات، اسالیب؛ اور استعارے کا ایکوفیمینزم کے تنقیدی پیرامیٹرس کے تحت جائزہ لینے کی ادنی سی کوشش کی گئی ہے تاکہ اردو کے افسانوی ادب میں ماحولیاتی نسائی فکر کو ممیز کیا جاسکے۔ اس باب میں ''افسانوی ادب'' یا ''اردو فکشن'' کی ترکیب کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

فکشن دراصل لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی تخیل کے ذریعے تخلیق کردہ ادب ہے۔ اس کا اردو میں افسانوی ادب ترجمہ کیا گیا ہے لیکن لفظ فکشن کو بھی من و عن استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو میں فکشن سے مراد ناول اور افسانہ ہے جبکہ افسانوی ادب تمام طرح کے قصوں کو کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ دونوں فرضی کرداروں، فرضی واقعات اور فرضی حالات کے ذریعے کسی زندگی کو پیش کرتے ہیں لیکن دونوں لفظوں کا استعمال

اردو ادب میں علیٰحدہ علیٰحدہ طور پر بھی ہوا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور لفظ فکشن کو اردو میں استعمال کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فکشن کا لفظ ناول اور افسانہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں فکشن کے لیے افسانوی ادب کی اصطلاح بھی برتی گئی ہے، مگر چونکہ افسانہ ہمارے یہاں مختصر افسانے کے لیے مخصوص ہوگیا ہے اس لیے افسانوی ادب کہا جائے تو پڑھنے والے کا دھیان مختصر افسانے کے سرمائے کی طرف جائے گا اس لیے میرے نزدیک ناول اور افسانہ دونوں کے سرمائے کے لیے فکشن اور فکشن کا ادب استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔''

(پروفیسر آل احمد سرور)

ویبسٹر زانسائیکلو پیڈیا میں فکشن کی مندرجہ ذیل تعریف کی گئی ہے:[1]

اردو میں لفظ فکشن اب عام ہو چکا ہے۔ اس کے مفہوم میں کافی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اس لیے کسی مخصوص صنف کے ساتھ اسے جوڑنا آسان نہیں ہے۔ ادبی اصطلاح میں فکشن ایک ایسی کہانی کا نام ہے جس میں فرضی کرداروں، فرضی واقعات، حالات اور حادثات کے ذریعے کسی زندگی کی ایسی تصویر پیش کی جائے جو نہ صرف قارئین کے شعور کو متاثر کرے بلکہ انہیں مسرت بھی عطا کرے۔ فکشن کے لیے ضروری نہیں کہ اس کا ہر واقعہ فرضی ہو بلکہ اس میں سچے واقعات بھی بیان ہو سکتے ہیں۔ فکشن کے فرضی کردار اور فرضی واقعات بھی ہماری حقیقی زندگی کے ترجمان ہوتے ہیں لیکن یہ ہر وقت ضروری بھی نہیں ہے کیونکہ فکشن پہلے فکشن ہوتا ہے اور اس کے بعد کچھ اور۔ فکشن نگار ہمیشہ تخیل کی مدد سے اپنے قصے کو دلچسپ اور متاثر کن بنانے کے فراق میں رہتا

1 "The class of literature comprising works of imaginative narration, esp. in prose form, works of this class, as novels or short stories")

ہے۔اس کی یہی ذہنی اختراع ایک کہانی کو چاہے وہ سچی ہو یا جھوٹی فکشن بناتی ہے۔بغیر اس کے ایک سچی کہانی تاریخ یا دستاویز کے سوا کچھ بھی نہیں۔لہٰذا خیال آرائی فکشن کی جان کہلانے کی مستحق ہے۔گویا یہ ایک ایسا نثری افسانہ 'کہانی' واقعہ یا قصہ جو فرضی یا خیالی ہو لیکن اس سے حقیقت کا تاثر ابھرے۔فکشن میں حقیقی یا دستاویزی کہانی کو بھی بیان کر سکتے ہیں۔لیکن اس شرط کے ساتھ کہ بیانیہ میں اسے دستاویزی حقائق کے طور پر نہ بیان کر کے فرضی کہانی کے طور پر بیان کیا جائے۔اس طرح بیان کردہ واقعات یا قصے کہانی فکشن کے ضمن میں آتے ہیں۔دورِ جدید میں نئی تکنیکوں اور نئے طریقوں کے استعمال نے فکشن کے تصورات کو بدل دیا ہے۔جادوئی حقیقت نگاری اور قدیم روائتیں فکشن میں داخل ہو گئیں ہیں جن سے حقیقت کا ایک نیا تصور ابھر کر سامنے آیا ہے۔نئی اور تازہ کہانیوں میں جہاں اساطیرت انہیں قدیم داستانوں سے قریب لے جاتی ہے وہیں ان کا منفرد اور علامتی انداز انہیں کہانی کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔قصے میں قدیم و جدید تصورات کے امتزاج کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے ہر طرح کے قصے کو فکشن مانا ہے۔

قصہ چاہے کسی بھی نوعیت کا کیوں نہ ہو اس کا دائرہ کار وسیع ہوتا ہے۔

لہٰذا ہم ہر اس تحریر کو فکشن قرار دے سکتے ہیں جس میں کسی واقعہ یا کہانی کو بیان کیا گیا ہو۔ایسی ہر تحریر جس میں کسی واقعہ' کہانی یا افسانے کو بیان کیا جائے' فکشن کے زمرے میں آئے گی۔اسی لیے اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔اس میں حکایت بھی شامل ہے اور تمثیل بھی۔داستان' ناول اور افسانہ (طویل یا مختصر) بھی' ناولٹ بھی اور ڈرامے بھی۔یہاں تک کہ منظوم داستانیں بھی اور ایسی مثنویاں بھی جن میں قصہ پن کا عنصر ملتا ہے۔عام طور پر فکشن سے مراد ناول اور افسانہ لیا جاتا ہے۔ناولٹ چونکہ ناول اور افسانے کے درمیان کی کڑی ہے اس لیے یہ بھی ان میں شامل ہے۔ناول' ناولٹ اور افسانہ تخلیقی اور اظہاری اعتبار سے ایک ہی صنفِ ادب ہیں۔ان تینوں اصناف میں جو چیزیں مشترک ہیں وہ قصہ پن، بیانیہ' واقعہ نگاری' کردار نگاری' اور ان کا خیالی ہونا ہے

باب : ۱

لیکن جن سے حقیقت کا تاثر ابھرتا ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جو انہیں فکشن بناتی ہیں۔ جب ہم کسی ایسی دوسری کہانیوں یا تحریروں پر نظر ڈالتے ہیں تو جن میں کوئی نہ کوئی عنصر مفقود رہتا ہے لہٰذا انہیں ہم فکشن کا نام نہیں دے سکتے۔

شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

> ''آسانی کے لیے افسانہ کو Fiction کے معنی میں رکھیئے کیونکہ ناول اور افسانہ تخلیقی اور اظہاری اعتبار سے ایک ہی صنف ہیں اور اگر فکشن کی تعریف یا حد بندی ہو سکے تو ہم اسے ناول اور افسانہ دونوں کے لیے کام میں لاسکیں گے۔''

فکشن کی اصل بنیاد قصہ ہوتا ہے اور اس کو بنانے میں کردار واقعات اور زمان ومکاں جیسے اجزاء کا اہم کردار رہتا ہے۔ کردار اور واقعات کے درمیان ہونے والے معاملات سے ہی کہانی کی تشکیل ہوتی ہے۔ فکشن کا یہی کہانی پن قارئین کے لیے تجسس اور دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اس کے کردار چونکہ انسان یا انسانوں جیسی سوچ رکھنے والے ہوتے ہیں اس لیے یہ اصل زندگی کی تصویر نظر آتی ہے اور ساتھ میں زماں ومکاں کی موجودگی سے بھی فکشن کے فرضی کردار اور واقعات حقیقی محسوس ہونے لگتے ہیں۔

اس باب کا مرکزی سوال یہ ہے کہ کیا فکشن میں ایکوفیمینزم کا ڈسکورس، معاشرے میں مرد، عورت اور ماحول کے درمیان کے آپسی تعلق کی تعمیر میں اثر انداز ہوا ہے۔ یہ یقینی طور پر ایک دشوار اور قیاس آرائی پر مبنی سوال ہے۔ اور اس سوال کی معنویت کو بخوبی سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایکوفیمینزم کے ڈسکورس کے خدوخال کو سمجھا جائے تاکہ ماحولیاتی پائیداری سے منسلک حقوق نسواں کے مفادات اور صنفی مساوات کی کلیدی تبدیلیوں پر بھی غور کیا جاسکے۔ ڈپٹی نذیر احمد سے شمس الرحمٰن فاروقی تک کے فکشن میں ایک تہذیبی ناسٹیلجیا تو دیکھنے کو مل جاتا ہے لیکن اس پر آشوب عہد کی آگاہی وعکاسی کہیں بھی نظر نہیں آتی — ہاں، عصر حاضر میں سچ کا سامنا کرنے والی تحریریں بڑی تعداد میں مل جاتی ہیں۔ اسد محمد خاں سے لے کر آصف فرخی، طاہرہ اقبال، مبین مرزا اور حمید شاہد تک

عالمی مسائل پر لکھی جانے والی تحریروں کی کوئی کمی نہیں۔ حمید شاہد کے ''سورگ میں سور'' جیسے افسانے کے بارے میں احمد طفیل کی رائے ہے کہ یہ افسانہ عالمی معاصر صورتحال کے خلاف احتجاج ہے۔ لیکن ان تمام تخلیق کاروں کی تخلیقات میں بھی ''ماحولیاتی مادریت'' کا کوئی تصور کارفرما نظر نہیں آتا ہے۔ شاید اس کی وجہ تجربات اور مشاہدہ کی دنیا کا فرق ہے۔

پچھلی چند دہائیوں کی تکنیکی ترقی نے ادب کو ایک جمہوری عمل بنا دیا ہے۔ انٹرنیٹ کا پھیلاؤ قلم کاروں کے لیے سودمند ثابت ہوا ہے اور e-books کی مقبولیت بھی بڑھی ہے۔ عددکاری (digital and Computational) کے عمل نے ادب میں نئی راہیں ہموار کی ہیں اور نئی ہیئتیں سامنے آئی ہیں۔ جیسے ماورائے متن فکشن (FictionHighpertext) اور ارتباط باہمی فکشن (FictionInteractive) وغیرہ۔ اب قارئین اور متن کے درمیان فاصلے کو فوق المتن (hypertext) کے رخنوں نے کم کر دیا ہے جس کے باعث پڑھنے کے عمل میں پڑھنے والے کی شرکت کا اضافہ ہوا ہے۔ اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ کیا اس بدلے ہوئے تناظر کو اردو کے افسانہ نگاروں نے اور بالخصوص خواتین افسانہ نگاروں نے اسی طرح محسوس کیا ہے جس طرح یہ بین الاقوامی ادب میں کیا جا رہا ہے۔ اس کے پیش نظر زیر نظر مقالے میں صرف ان خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب کیا گیا ہے جو فیس بک یا بلاگ پر فعال ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ ایسی افسانہ نگار خواتین کی ایک بڑی تعداد ہمارے سامنے ابھر کر آئی ہے جن میں نسیم سید، سلمی جیلانی، سیمین علی، شاہین کاظمی، نورالعین ساحرہ، ناہید اختر، انجم قدوائی، غزال ضیغم، فرحین چودھری، سیمیں درانی، فرحین جمال، نگہت نسیم، فرح دیبا، طلعت زہرا، رضیہ صغیر، رضوانہ سید علی، عشرت ناہید، مہر افروز جیسے کئی نام قابل ذکر ہیں مگر یہاں اس باب میں جن کی تخلیقات کا انتخاب کیا گیا ہے ان کی تخلیقات میں نظریہ ایکوفیمینزم سے گہری مماثلت ہے۔ پچھلے دس سالوں میں شائع ہونے والے افسانے بے شمار ہیں مگر ان میں آج کی دنیا میں ادب کے بدلتے مظاہر کم ہیں لیکن فیس بک اور بلاگ پر کچھ ایسی

خواتین افسانہ نگار ضرور ہیں جن کا بالواسطہ مقصد معاصر ادب کی نمائندہ تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے مسائل اپنی تخلیقات میں متشکل کرنا ہے۔ ایسی افسانہ نگار فکر و فن، زبان و بیان میں ہر لمحہ مفاہمت کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ افسانہ نگار تخلیق کی Virgin Territory کی سیاحت کرنے میں دلچسپی لیتی ہیں، جو عصر حاضر کے بہت ہی کم فنکاروں کا مقدر بنی ہے، Virgin Territory غیر ممسوس منطقے (untouched territory) کی سیر کے لئے جس آشفتگی، دیوانگی، جرات، بے خطری اور عصری آگہی کی ضرورت پڑتی ہے، اس سے بہت سے تخلیق کار محروم ہیں۔ لیکن متذکرہ بالا خواتین افسانہ نگاروں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ تخلیق کو نیا سیاق وسباق، نیا مفہوم اور نیا تناظر عطا کرنے کی جدوجہد میں اس فکری اور اظہاری منطقہ تک رسائی میں کامیاب ہوئی ہیں جو بہت حد تک virgin (کنوارا) اور قدرے غیر مستعمل ہے۔ ان کی تخلیق میں ''ماحولیاتی مادریت'' کا وہ مرکزی نقطہ اور محوری نکتہ بھی موجود ہے جو عصر حاضر کی بیشتر تخلیق سے غائب نظر آتا ہے۔ فیس بک پر فعال ان خواتین تخلیق کاروں کا تعلق تخلیق کے اس تلازماتی نظام اور تناظر سے ہے جس سے تخلیق میں تازگی، تحیر اور تابندگی آتی ہے۔ ان لوگوں نے 'تخلیقی اجتہاد' سے کام لیا ہے اور تقلیدِ جامد سے گریز کیا ہے اور ایک نئی تخلیقی سمت کی تلاش نے ان کے افسانوں کو اس بھیڑ سے بھی بچالیا ہے جس میں اکثر فن پارے اپنے نام و پتہ کی تلاش میں مدتوں بھٹکتے رہ جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں اس انسان کی جستجو ملتی ہے جو گلوبل گاؤں' میں اپنی شناخت کھو چکا ہے اور بے چہرگی جس کی پہچان ہے۔ بنیادی انسانی اقدار سے منحرف اور ٹکڑوں میں بٹے ہوئے انسانی وجود کے ذہنی وفکری بحران اور انتشار واختلال کو انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کے ذریعہ انسان کی داخلی' خارجی صورتحال سے آگہی ہوتی ہے۔ Globalised Society اور ملٹی کلچرایج (کثیر ثقافتی دور) میں سماجی، سیاسی اقدار میں تبدیلیاں آئی ہیں اور انسانوں کے ذہنی زاویے بھی بدلے ہیں۔ ایسی بدلتی ہوئی صورتحال میں ان افسانہ نگاروں کی تخلیق نہ صرف آج کے معاشی' اقتصادی' سماجی' تہذیبی نظام کے

مسائل پر نگاہ ڈالتی ہے بلکہ ان سے بے خوف مکالمہ کرتی ہے۔ان کے افسانوں میں نہ صرف ''ماحولیاتی مادریت'' کا تصور کارفرما نظر آتا ہے بلکہ اس کے treatment میں مادرسری معاشرے کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔آج کی زندگی کی صورت حال اور انسانی متعلقات کے حوالے سے ان کا زاویہ نظر جداگانہ ہے۔ان کے افسانوں میں تیزی سے ہورہی شہرکاری (Urbanisation)، پاورفل ٹرانسمیٹر کے ریڈی ایشن، اور اس کی وجہ سے ماحولیاتی توازن میں انتشار، ایک جانب مصنوعی پلانٹیشن سے خوبصورتی میں اضافہ، تو دوسری جانب کٹتے درخت جیسے Paradoxes کے خلاف احتجاج نظر آتا ہے۔ان کی تخلیق کردہ دنیا میں ماحولیاتی آلودگی اس دنیا میں ازخود نہیں آئی بلکہ انسان کی بے ربط ترقی کے نتیجے میں ملی ہے، ایسی تمام ملاوٹیں جو ماحول کو قدرت سے دور کرتے ہوئے اسے انسانی حیات کے لیے نقصان دہ یا کم فائدہ مند بنادیں انہیں ماحولیاتی آلودگی کہتے ہیں۔

آلودگی پھیلانے والے عناصر قدرتی بھی ہوسکتے ہیں اور مصنوعی بھی یعنی قدرتی گیسیوں کا کسی خاص علاقے میں دباؤ بلاضرورت بڑھ جائے تو وہ علاقہ آلودہ ہوجائے گا مثلاً گاڑیوں کے دھویں سے نکلنے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ اور نائٹروجن آکسائیڈ کی مقررہ حدود سے زائد مقدار ماحول کو آلودہ کردیتی ہے اسی طرح حیاتی فضلہ اگر زیادہ مقدار میں غیر سائنسی طریقے سے زمین میں ضم کردیا جائے تو اس سے زمینی آلودگی پیدا ہوتی ہے، پانی میں ایسے آبی یا ٹھوس عناصر ملادیئے جائیں جو پانی کا کیمائی حصہ نہ ہوں تو ایسی صورت میں آبی آلودگی پیدا ہوتی ہے۔آلودگی کی سنگینی کا اندازہ ان کے افسانوں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔اور اس آلودگی کی وجہ انسانی کج روی، خود غرضی، سنگ دلی اور بدنیتی بھی ہے۔جسے ان افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے طریقے سے محسوس کیا ہے اور اپنے اسالیب کا اسے حصہ بنایا ہے۔دوسری جنگ عظیم کے بعد جوہری ہتھیاروں کے استعمال کے نتیجے میں واضح طور پر فضا میں مضر صحت عناصر کا پتہ لگایا گیا تھا۔لندن میں سن انیس سو باون میں ایک جوہری پلانٹ سے زہریلی گیسیں خارج

ہونے سے چار ہزار اموات ہوئی تھیں جس کے بعد دنیا کا پہلا ماحولیاتی قانون کلین ایئر ایکٹ 1956 میں منظور کیا گیا تھا۔ امریکہ میں ماحولیاتی آلودگی پر توجہ سن انیس سو پچاس سے انیس سو ستر کے درمیان دی گئی تھی جب امریکی کانگریس نے صوتی آلودگی (نوائز کنٹرول) ایکٹ، کلین ایئر ایکٹ اور نیشنل انوائرنمنٹل پالیسی ایکٹ پاس کیے تھے۔

ہندوستان اور پازن میں ماحولیاتی قانون سازی کا آغاز سن انیس سو اسی میں ہوا اور سن انیس سو چوراسی میں انوائرنمنٹل پروٹیکشن آرڈیننس اور انیس سو ستانوے میں پاکستان انوائرنمنٹل پروٹیکشن ایکٹ منظور کیے گئے۔ اس کے بعد مذکورہ ایکٹ میں ترامیم تو کی جاتی رہیں تاہم گزشتہ بارہ سال سے کلی طور پر مزید کوئی جامع ماحولیاتی قانون نہیں بنایا گیا اور نہ ہی موجودہ قانون پر سنجیدگی سے عملدرآمد کیا گیا۔ ان افسانہ نگاروں نے ماحولیاتی آلودگی کے مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی اور ایسے کئی نمایندہ افسانے لکھے جس میں اس تفکر کو نمایاں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقالے میں جن تخلیق کاروں کی تخلیقات یکجا کی گئی ہیں ان کا تخلیقی احساس منفرد اور مختلف ہے۔ زندگی کے تعلق سے ان کا رویہ اور اس کی لسانی پیشکش واضح طور پر ڈائی نیمک ہے۔ ان تخلیق کار خواتین میں بعض کے یہاں ان کے بیشتر افسانوں میں فیمینزم کا موضوع زیادہ ابھر کر سامنے آیا ہے، مگر ان کی حساس طبیعت نے ماحولیاتی مادریت کے موضوعات کو بھی اندیکھا نہیں کیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں صرف احتجاج کی نہیں، بلکہ ایک غیر مرئی ماحولیاتی مادریت کے احساس کی ایسی تصویر ملتی ہے جس میں ایک طرح کا تفکر ہے اور اس تفکر کو ان خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں ایسے تجسیم کیا ہے کہ ہم ایکوفیمینزم کی مثال کے لئے ان افسانوں کو اٹھا کر دیکھ سکتے ہیں دور حاضر کا یہ نسائی متن، دلچسپ، حقیقت پسندانہ اور معنی خیز ہے جو سماجی تفکرات سے ادب اور فن تک کا ایک تخلیقی سفر ہے۔ لیکن اس کا یہ قطعی مفہوم نہیں کہ ان اردو کی عصری خواتین افسانہ نگاروں کے علاوہ کسی اور نے مادری ماحولیات میں دلچسپی نہ لی ہو۔ قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا''، ''میرے بھی صنم خانے''، ''آخر شب کے ہم سفر''، ''کار جہاں دراز ہے'' ایسی لسانی پرکاری کی عمدہ مثالیں

ہیں جن میں ماحولیاتی تفکرات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔قرۃ العین حیدر کے لسانی اظہار میں ثقافتی فکر کی جلوہ گری نمایاں نظر آتی ہے۔آگ کا دریا سے یہ اقتباس قرۃ العین حیدر کے ماحولیاتی مادریت کی عمدہ مثال کے طور پر پیش کرتی ہوں۔

''آم کے درختوں میں چھپی خانقاہوں میں اس نے ان اللہ کے بندوں کو دیکھا جو لاہوت اور ناسوت تک سارے فاصلے طے کر چکے تھے یا جو تصور شیخ میں گم بیٹھے تھے''۔

قرۃ العین حیدر کے علاوہ زاہدہ حنا کا افسانہ ''یکے بود یکے نہ بود'' کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔زاہدہ حنا کے اس افسانے کے اقتباسات دیکھیں۔

''دریا اور اسکے حاشیے پر پھیلی آبادی پیچھے رہ گئی۔سورج کی ترچھی کرنوں نے ببول کی بھاگتی ہوئی جھاڑیوں کے سائے لمبے کر دئے ہیں۔سڑک کے بائیں اور دائیں خاک کے چھوٹے بڑے ٹیلے پھیلے ہوئے ہیں۔ہوا کے ساتھ چھک پھیریاں کھاتے ہوئے ذرے فراٹے بھرتی ہوئی گاڑی کے بند شیشوں پر دستک دے رہے ہیں۔یہ جو کبھی گل ثریا کسی سیم بر کی صورت زندہ ہونگے،کل جانے کب اور کہاں نمو پذیر ہوں۔کسی کے نازک لبوں کی تراش میں،کسی کے سر پر غرور کی بناوٹ میں۔''

''اس نے چچا کو اپنا مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی تو چچا نے یتیم و یسیر بھتیجے کو ڈانٹا،زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی،کوزہ گری کا دور گزر چکا تھا،مشین انسانی انگلیوں کی ہنر کاری کی جگہ لے چکی تھیں۔لمحہ بھر میں چٹخ جانے والی مینکی روغنی رکابیوں اور پیالیوں کی جگہ پلاسٹک اور اسٹیل کی طشتریاں اور ڈونگے استعمال ہو رہے تھے۔جو سستے تھے اور برسوں چلتے تھے۔کوزہ گر ساری دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔اور چند رہ گئے تھے وہ بھی اس لئے رہ گئے تھے کہ انہیں اور

کوئی کام کرنا پسند نہ آتا تھا۔

یہ تمام بات شاہ پور بھی سمجھتا تھا، لیکن وہ اپنی انگلیوں کے سامنے بے بس تھا۔ وہ خمیر کی ہوئی مٹی کے لوچ کو محسوس کرنا چاہتی تھیں۔ موقلم تھام کر برتن کی چکنی سطح پر نقش و نگار بنانا چاہتی تھیں۔ انہیں تار کے ٹکڑے سے کسی پیالے کے کناروں پر کنگوریاں کاٹنے کی خواہش تھی۔''

زاہدہ حنا کا متذکرہ بالا افسانہ ایکوفیمینزم کی بہترین مثال ہے، زاہدہ نے مٹتی ہوئی قدروں کی اور اس کے ساتھ گم ہوتی ہوئی ثقافت اور تہذیب کی سنگینی کا احساس کسی جادو کی طرح جگا کر دل میں گہرا نقش چھوڑا ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ماحولیاتی تفکر ماقبل نسل کے یہاں اتنا شدید نہیں تھا اس لئے اس موضوع کی طرف توجہ بھی کم کم رہی۔ مگر گزرتے ہوئے وقت نے عصری تقاضوں اور حالات کے زیر اثر اس سے اثر قبول کیا اور خاص کر نسائی ادب میں یہ تفکر واضح طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔ اس لئے وہ قرۃ العین حیدر ہوں یا زاہدہ حنا ہوں یا کوئی اور ان سب کے لسانی اظہار میں ماحولیاتی مادریت کی یہ تصویر کشی کبھی کبھی نظر آتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس عصری خواتین افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں ایک غیر مرئی ماحولیاتی مادریت کے احساس کی ایسی تصویر ملتی ہے جس میں ایک طرح کا تفکر ہے اور اس تفکر کو ان خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں تجسیم کیا ہے۔ آج جو خواتین افسانے لکھ رہی ہیں ان کے افسانوں میں گوناگوں موضوعات کی رنگا رنگی اور زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا شعور جھلکتا ہے انہوں نے نفسیاتی مسائل ہو یا سماجی، فیمینزم کا نظریہ ہو یا آزادی نسواں کا مسئلہ ہر پہلو پر بڑی خوبی سے قلم اٹھایا ہے۔ اس باب میں ان تمام خواتین افسانہ نگاروں کی تحریروں کو شامل کرنا ممکن نہ تھا مگر ان میں سے کچھ ایسے افسانے منتخب کر کے شامل کیے جا رہے ہیں جو ماحولیات سے گہری جڑت رکھتے ہیں۔ جن کی تحریروں میں تباہ ہوتی ہوئی ماحولیاتی قدروں کا اور اس کے ساتھ گم ہوتی ہوئی تہذیب کی سنگینی کا احساس نظر آتا ہے۔ درحقیقت یہ ایکوفیمینزم کے موضوعات ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ اس فہرست میں بہت سے اہم نام شامل ہونے سے رہ گئے ہیں ۔مگر ان افسانہ نگاروں کا ذکر اس مقالے میں شامل ہے جنکی تحریریں اردو افسانوی ادب میں ایکوفیمینزم کے نظریے کے تحت متاثر کرتی ہیں۔

☆☆

افسانے

سیمین علی

کتن والی

مقیم۔جدہ
آبائی وطن۔لاہور پاکستان
تصنیفات۔افسانوی مجموعہ (زیرطبع)،غیرعروضی نظمیں (زیرطبع)
ہند و پاک کے معتبر ادبی رسائل و جرائد میں افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔فنون، ادبیکا، اجراء، ادب لطیف (پاکستان)، شاعر، ثالث، دربھنگہ ٹائمس، وغیرہ

.....

سوت کو مختلف رنگوں میں رنگ کر امتزاج اور توازن کو صغریٰ مائی جانے کس طرح قائم رکھتی تھی اور یہ بھی کسی کے علم میں نہیں تھا کہ کچی آبادی میں بسنے کی بجائے جولاہوں کے اس مختصر کنبے نے جھگی بڑی نہر اور راج باہ کے بیچ میں موجود جگہ پر کیوں ڈال رکھی تھی۔ پہلے پہل یہ علاقہ مضافات میں شمار کیا جاتا تھا مگر کچھ سال بعد ہی شہر کے اندر شامل ہو چکا تھا۔

فیکے جولاہے کی انگلیاں پاور لوموں کے بیم سے اترے ویسٹ تانے کو بل دے کر سوت بٹنے کی اتنی عادی ہو چکی تھیں کہ خواہ وہ حقے کی تازہ چلم کو کش لگا رہا ہوتا یا کسی گاہک کو اپنی چرب زبانی سے گھیر کر کھیسوں کی افادیت پر دلائل دے رہا ہوتا، اس کی ٹیڑھی انگلیاں مسلسل گولے کو گھماتی اور بل دیتی رہتیں۔ ایک ہی لڑکا تھا جو ویونگ

فیکٹری میں وائینڈر پر بابنیں بھرتا تھا۔ اگر کھیس جتنی کا کوئی گاہک مل جاتا تو ان کی آبائی کھڈی چلتی ورنہ فیکا جولاہا سوت بٹ کر چارپائیاں بننے والا بان بناڈالتا۔

بابا فیکا اور صغریٰ جسے عرف عام میں سب مائی جولاہی کہتے تھے فیصل آباد شہر میں بس کر خود کو قدرے آسودہ محسوس کرنے لگے تھے۔ پاور لومز کی کثرت میں انہیں نا صرف سوت آسانی سے دستیاب ہوتا بلکہ دستی کھڈی پر بنی دریاں کھیس اور چٹیاں بھی آسانی سے بک جاتیں۔ صغری جولاہی اور بابے فیکے پر بڑھاپے کی آمد آمد تھی۔ ان کی انگلیوں پر سوتر کے گولوں کو بل دیتے اور تانے بانے میں الجھتے الجھتے گٹھے پڑھ چکے تھے۔ مائی دبلی پتلی اور چست تھی۔ ہر کام بڑی محنت اور نفاست سے کرتی، تیکھے نقوش مگر رنگ دھوپ میں جل کر سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ بڑی روشن آنکھیں جن کی نظر عمر کے ساتھ کمزور ہو رہی تھی۔ بال کہیں سفید کہیں سیاہ اور کہیں کہیں لال مہندی کے آثار کا پتا بتاتے۔ اکثر چھوٹے پھولوں والے پرنٹ کا گول گلے والا کرتا جس کی اطراف میں جیبیں لگی ہوتیں اور سادہ شلوار پہنتی۔ ایک ہاتھ میں کانچ کا موٹا کڑا، انگلیوں میں مختلف رنگوں کے کانچ کے چھلے اور کانوں میں چاندی کی بالیاں پہنے رکھتی۔ اس کی انگلیوں میں پرکھوں کا ہنر تھا تو فطرت میں رنگوں کے استعمال اور نمونے بنانے کی صلاحیت ودیعت ہوئی تھی۔ عام سی جھگی کو اس نے نفاست سے سجایا ہوا تھا۔ لال اینٹوں کے فرش پر جیومیٹری کی اشکال والے نمونوں سے مزین صاف ستھری دری پڑی ہوتی۔ جھگی کے دروازے پر پڑا پھولدار پردہ، مٹی کا چولہا جس پر نقش نگار بنے تھے، چھوٹی دیواریں اور گاچنی سے لیپ کیے ہوئے پیندے والے چمکتے برتن غرضیکہ جھگی کی ہر چیز اس کی نفاست کی گواہی دیتی۔

اُس سال سردی کی شدید لہر اور نہر کنارے پڑنے والی گہری دھند فیکے کو نمونیے کا تحفہ دے چکی تھی کھانس کھانس کر بدحال ہو جاتا تو بلغم کے ساتھ کبھی چونی کبھی اٹھنی جتنا خون بھی لگا ہوتا۔ دھیرے دھیرے اس کا وجود متروک سکوں کی مانند ختم ہوتا جا رہا تھا۔ کھڈی پر باریک تانا چڑھانے کا کام ان کے لڑکے بھولے کو نہیں آتا تھا۔ اگر بابا فیکا کسی طرح تانا باندھ دیتا تو بھولا کھڈی پر سادہ بنائی کر لیتا تھا۔

گھر کی صفائی ستھرائی اور ہانڈی چولہا کرتے وقت مائی بہت شوق سے ریڈیو سنتی۔ کئی خبریں اور باتیں اس کے لیے بالکل انوکھی اور حیرانی کا باعث ہوتیں۔ کبھی ماہیے سنتی تو دھیان اپنے چہرے پر نمودار ہوتی جھریوں کی طرف بھی چلا جاتا۔ سوتر منڈی اور ملوں سے لے کر فیکے جولاہے تک ایک وقت میں سب لوگوں کا روزگار خوب پھلا پھولا تھا۔ ہفتے میں ایک دن بجلی کا ناغہ ہوتا۔ کسی علاقے میں یہ ناغہ جمعے کو ہوتا اور کسی علاقے میں اتوار کو۔ اور اسی دن مزدوروں کی ہفتہ وار چھٹی ہوتی۔ ہر مزدور کم سہی لیکن رات کو دیہاڑی لے کر گھر آتا۔ مگر یہ سب اسی رفتار سے نمو پذیر نہ رہا۔ ریڈیو سانڈل بار پنجابی پروگرام میں میزبان اکثر کہا کرتا تھا! محنت کش اس قوم کا ہاتھ ہیں۔ کئی بار یہ سن کر اس کی سوچوں کا تانتا بندھ جاتا کہ مجھ جولاہی کے ان ہاتھوں نے کتنے سوت بٹے ہیں پر جھگی سے باہر درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور بہتی نہر پر ان کا کیا حق؟ پھر سوچتی کہ ملک کی بڑی بڑی باتوں اور آنے والے وقت پر اس کا اتنا ہی اختیار ہے جتنا گھاس کا موسموں پر۔ سورج اپنا سفر مختصر یا طویل کرتے وقت گھاس سے صلاح مشورہ کبھی نہیں کرتا۔ گھاس ہی خود کو موسموں کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔

غیر محسوس طریقے سے پاوڈر کا زہر پورے شہر یا شاید پورے ملک کی رگوں میں اتارا جا رہا تھا۔ مائی جولاہی کو تو ملک کے طول وعرض کا اندازہ تھا نہ ہی شہروں کے نام یاد تھے۔ اس غریب نے تو پاس ہی صدیوں سے بسنے والا شہر لاہور تک نہ دیکھا تھا۔ سنا کرتی تھی کہ جنہے لہور نئیں ویکھیا اوہ جمیا ای نئیں تو کئی بار دل ہی دل میں ارداہ کرتی کہ اگر اس بار اچھی بچت ہوئی تو داتا دربار کا عرس دیکھنے کے بہانے ہی لہور شہر دیکھ لے گی۔

مگر اسے اتنا ضرور علم تھا کہ لڑکوں بالوں اور دیہاڑی پر کام کرنے والے غریب مزدوروں کی کثیر تعداد آہستہ آہستہ ہیروئین کی پڑیوں کے نشے کی عادی ہو چکی جن میں بھولا بھی شامل تھا۔ ان کے وجود کے نئے نکور سکے دیا سلائی کی آنچ پر دہکتے سفید سے سیاہ ہوتے پاؤڈر کو اپنے اندر تحلیل کرتے کھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔ کبھی وہ سوچتی کہ اگر یہ سب اسے نظر آ رہا ہے تو بڑوں کو بھی نظر آتا ہوگا ایک دن وہ کوئی جادو کی چھڑی

گھمائیں گے تو جیسے یہ پڑیاں گلی گلی بکنے لگی تھیں ایک دن اچانک غائب بھی ہو جائیں گی اور اس کا بھولا جواب وائینڈر پر بابنیں بھرنے کا کام قد نکلنے کی وجہ سے چھوڑ چکا ہے پھر سے اپنے باپ کی کھڈی سنبھال لے گا۔

انہی دنوں فیکا جولاہا گرمیوں کا موسم آنے سے قبل ہی مٹی میں جا سمایا۔ بھولا کبھی لوموں پر کام کر لیتا تو کبھی سوت بٹ لیتا۔ کہیں اسی تو کہیں سو روپیہ دیہاڑی ملتی تھی جس میں سے پچاس روپے کی پڑی آ جاتی۔ اگر پڑی نہ پیتا تو سارا بدن ٹوٹنے لگتا اور وہ ماہی بے آب کی مانند تڑپتا مٹی میں پلسٹیاں لیتا ہائے ہائے کرتا رہتا۔ مائی جولاہی سے اکلوتی اولاد کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی۔ اسی مجبوری میں اجرت پر کبھی کسی کی چارپائیوں کے سنگے نکال آتی تو کہیں کسی کے گھر میں رضائیوں کے نگند نے بھر آتی کہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رہے۔

کچھ عرصہ تو اسی طرح چلتا رہا مگر جب بھولا بالکل ہی کام سے جانے لگا تو مائی جولاہی نے ہمت پکڑی کہ کسی طرح کھڈی پھر سے چلنے لگے۔ بی بی جی ہم ہنر مند ہیں بھیک مانگ کر نہیں کھاتے، رب سوہنے کا کرم کہ کھڈی کی صورت روزی کی آس لگائی ہوئی ہے۔ بس اتنی حسرت ہے کہ کہیں سے سوتر مل جائے تو مہینوں کا بیکار پڑا بھولا کھڈی جوڑ لے۔ مائی جولاہی عاصمہ سے منت سماجت کر رہی تھی۔ عاصمہ ایک کالج میں تاریخ کی لیکچرار تھی۔ اکثر گھر کے کام کاج کے لیے اسے کسی کام کرنے والی عورت کی ضرورت پیش آتی رہتی۔ مائی جولاہی کئی بار ان کی رضائیاں نگند چکی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ عاصمہ بی بی کے میاں کی ویونگ فیکٹری ہے تو مائی نے بڑی آس لگاتے ہوئے اسے اپنا دکھڑا کہہ سنایا۔ عاصمہ ایک خداترس عورت تھی اسے مائی جولاہی کے سب حالات کا علم ہوا تو دل میں اس غریب عورت کے لیے ہمدردی جاگ اٹھی۔ مائی کھیسوں کا تو رواج ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ اچھا خیر میں تمہیں فیکٹری سے ویسٹ منگوا دوں گی تم دیکھ لینا اس سے کیا بنتا ہے، عاصمہ نے مائی جولاہی کو دلاسا دیا۔ کچھ دن بعد جب عاصمہ کے گھر سے مائی جولاہی سوت لے کر نکلی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ ادھورے

اور کچھ ان دیکھے خواب پھر سے بننے لگیں۔ جھگی کی طرف اٹھتے ہر قدم کے ساتھ ازلی تفکرات کے تانے میں خوابوں کا بانا جوڑتی رہی کہ اس بار بھولے کا علاج کرالے گی۔ کچی آبادی میں کوئی ڈھائی مرلے کا مکان بھی لے گی، بھولے کے سر سہرہ سجے گا تو سونا آنگن کھل اٹھے گا۔

بھولا جو اپنے نشے کی لت سے تنگ آچکا تھا مگر جان چھڑانے کا کوئی راستہ اس کے سامنے نہیں تھا سوت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اگر موٹے بانے کے ساتھ ایک دن میں ایک دری بنالیتا تو سو روپے کی بچت لازمی تھی۔ مائی جولاہی نے اپنی ماہر انگلیوں سے تانا باندھنا شروع کیا تو بھولا بھی ساتھ لگ گیا۔ بانے کے لیے مائی نے سوت کو لال نیلے پیلے جامنی اور کالے رنگوں میں رنگ کر ڈیزائین بھولے کو سمجھانا شروع کیے۔ بھولا جو پاور لوموں پر کام کرنے کی وجہ سے دستی کھڈی پر ڈیزائین والے کھیس دریاں بنانا اچھی طرح سے سیکھ نہیں پایا تھا ایک مفعول بناماں کی ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ جب دیگر کی بانگ کے ساتھ دری کھڈی سے اتاری تو طمانیت کا احساس اس کی ساری تھکن اتار گیا ان تخلیقی رنگوں میں امید کی کرن تھی۔ مائی نے اگلے ہی دن دری بغل میں دابی اور عاصمہ بی بی کے گھر پہنچ گئی۔ کھڈی چالو ہونے پر اس کی خوشی دیدنی تھی اس کا پہلا خواب تعبیر ہونے جارہا تھا۔

عاصمہ جسے آرٹ کی کچھ سمجھ بوجھ بھی تھی بوڑھی ان پڑھ جولاہی کی فنکارانہ چابک دستی اور نفاست سے رنگوں کا استعمال دیکھ کر حیران رہ گئی۔ مائی کی چوٹ نشانے پر پڑی تھی، اس نے جان لیا تھا کہ اپنے ہنر کو بدلتے وقت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں ہی ان کی بقا ہے۔ اپنی اجرت لیتے ہوئے مائی نے بڑی امید کے ساتھ عاصمہ سے ایک اور تقاضا کیا۔ بی بی جی اگر تُسی برا نا مانو تے اپنے کالج کی دوسری استانیوں کو بھی میری بنی دریاں دکھانا۔ تہاڈی مہربانی نال مجھ غریبنی کا آٹا دال لگا رہے گا۔ اچھا مائی تم ایسا کرو کچھ دریاں بنا کر تیار رکھو دو ہفتے بعد میری کچھ سہیلیاں آرہی اس دن سب کو دریاں دکھانا شاید بک جائیں۔ عاصمہ نے ہمدردی میں ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ پر بی بی جی روز پچاس

روپے تو بھولے کی پڑی کے چاہیں، پڑی نہ ملے تو وہ کھڈی پر بھی نہ کھلو سکے۔ مائی نے فکر مندی سے کہا۔ مائی جتنا مجھ سے ہوسکا میں تیرا ساتھ دے تو رہی ہوں تیرے بیٹے کا کہیں سے علاج ہو جاتا تو اچھا تھا۔ عاصمہ نے تاسف سے کہا۔

بی بی جی اللہ وارث ہے صغریٰ نے بڑے حوصلے سے امید بھرے لہجے میں جواب دیا۔ بھولے نے بھی جی جان سے ماں کا ساتھ دیا۔ ان کی بنی دریاں کچھ منفرد نمونوں کی بنا پر اور کچھ عاصمہ کی مدد کی وجہ سے خوب بکیں۔ اس کی کئی کولیگز نے مائی جولاہی سے اپنی اپنی پسند کے مطابق سائی دے کر مختلف طرز کے کھیس اور دریاں بنوائیں۔ عاصمہ کے دل میں مائی جولاہی کے فن اور مشقت کی وجہ سے جو انسیت اور ہمدردی پیدا ہو چکی تھی وہ صغریٰ کے لیے کسی بڑے آسرے سے کم نہ تھی۔ جیسے بجھنے سے قبل ایک بار چراغ پوری تمکنت سے جگمگاتا ہے اسی طرح کچھ عرصہ ان کا ہنر بھی جگمگایا۔ بھولے نے خراب صحت کے باوجود اپنی ماں کا ساتھ نبھاتے ہوئے منفرد سے منفرد نمونے بنائے گویا اپنی محنت کا سارا نچوڑ اور مائی کے فن کی ساری مہارت کھڈی میں ڈال کر کوئی عجوبے تخلیق کرنے بیٹھا ہو۔ مائی کے خوابوں کو ایک نیا جزیرہ مل گیا تھا کبھی خواب دیکھتی کہ اس کی بنی دریوں کی مانگ سارے شہر میں ہے۔ کبھی خواب میں ڈھیر سارا سوت نظر آتا تو کبھی بے شمار رنگ اور کبھی ایک کی بجائے دو دو کھڈیاں نظر آتیں۔ لیکن خوابوں کے برعکس بھولے کی دن بدن کمزور ہوتی صحت بدصورت حقیقت بن کر سامنے موجود ہوتی۔ جب سے عاصمہ کو شوگر کا مرض لاحق ہوا اسے ڈاکٹر نے صبح سویرے واک کرنے کی تاکید کی تھی۔ اکثر وہ نہر کنارے بنے ٹریک پر چہل قدمی کرنے جاتی جہاں بہت سے لوگ موجود ہوتے بڑی سڑک کے ساتھ والی نہر سے کچھ آگے جا کر راج باہ نکلتی۔ وہاں قریب ہی مائی جولاہی کی جھونپڑی تھی۔ ایک بار وہ مائی کی جھونپڑی میں گئی تو اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر جکڑ لیا۔ بوڑھی عورت کا اکلوتا سہارا اس کا بیٹا بھولا سوکھ کر ڈھانچہ بنتا جا رہا تھا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، سوکھے چمڑے جیسی جلد، جلے ہاتھ، زرد چہرہ، عاصمہ کو لگا جیسے وہ میوزیم میں رکھا کسی فاقہ زدہ شخص کا قدیم سنگی مجسمہ دیکھ رہی

ہو۔ بھولے سے باریک کھیس پہلے ہی نہیں بنتے تھے اب موٹے سوت سے رنگین دریاں بنانا بھی اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ صغریٰ اپنے ناتواں کندھوں پر جوان بیٹے کا بوجھ بڑی استقامت سے اٹھائے ہوئے تھی۔ بھولے کا کہیں آنا جانا اور جھونپڑی سے نکلنا بہت محدود ہو چکا تھا۔ صغریٰ خود ہمیشہ کرتی اور کسی نہ کسی طرح پیسے بچا کر اس کے لیے پڑی لے آتی وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو نشہ ٹوٹنے پر بری طرح تڑپتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ محنت و مشقت کی آدھی سے زائد کمائی اس طرح لٹ جاتی۔ پھر بھی وہ اپنی ہمت کسی مشکل وقت کے لیے بچائی نقدی کی مانند جوڑے رکھتی۔ لوگوں کے سامنے وہ نہ تو بھولے کی کمزور صحت کا رونا روتی اور نہ ہی نشہ کرنے پر اس کی برائی کرتی۔ سیاہ رات اپنے آنچل میں چمکتے ہوں یا گرہن لگے، چاند سمیٹ ہی لیتی ہے۔ گھر گھر جا کر دریاں بنتیں کر کے بیچتی اور سوچتی کہ ساری بیبیاں ایک طرح کی کیوں نہیں ہوتیں گلی کوچوں کی خاک چھانتی مائی طرح طرح کی باتیں سنتی۔ مائی جولاہی، جھلی، کملی، سوکھا وان، نمانی کئی ناموں سے مخاطب کی جاتی۔ مگر مائی جولاہی تو جیسے بہری ہو چکی تھی۔ اسے تو بس اتنا پتا تھا کہ دریاں بیچنا اور پڑیاں خریدنا ہیں۔ وہ اکثر یہ خواب دیکھتی اور کبھی خواب دکھایا جاتا کہ گھوڑے پر سوار کوئی شہزادہ آئے گا جو پلک جھپکنے میں اس کے بھولے کو بھلا چنگا کر دے گا پھر اپنی جادوئی چھڑی گھمائے گا اور ساری پڑیاں یک دم غائب ہو جائیں گی۔ اس کے کمزور ہاتھوں کی بنی مزین دریاں ہر ڈرائینگ روم کی زینت بنیں گی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس سپنے کی تعبیر ناممکنات جیسی بن چکی ہے پھر بھی سارا دن وہ اپنے خواب کو خود ہی سچ کرنے کے عمل میں جٹی رہتی۔ اس کی خودداری اور اپنی انگلیوں پر مان برقرار تھا ورنہ پیٹ کا تنور بھرنے کو ہتھیلی پھیلانا کونسا مشکل تھا۔ عاصمہ ریفریشر کورس پر لاہور گئی ہوئی تھی۔ کئی دنوں بعد لوٹی تو پھر اپنی نوکری اور گھر بار کی مصروفیت میں گم رہی چند ایک بار دل میں خیال آیا کہ مائی کا پتا کرے لیکن خیال خیال ہی رہا۔ کئی مہینوں بعد مائی اس کے گھر آئی۔ تھکی ماندی مضمحل اور کمزور، ایسا لگ رہا تھا کہ روئی کی پونی کی بجائے کسی نے مائی کا وجود تکلے کی سوئی میں پرو ڈالا ہے۔ سمندر جیسی ڈونگھی آنکھوں کے گرد کالی ریت کی لکیریں

زمانوں کے تھکا دینے والے سفر کا احوال بیان کر رہی تھیں۔ جھریوں کی چادر اوڑھے کالی جلد کی سلوٹیں جسم کا لباس بنی تھیں۔

عاصمہ اس کی یہ حالت دیکھ کر افسردگی سی پوچھنے لگی! مائی یہ کیا حالت بنالی؟ اور اب تیرے بھولے کا کیا حال ہے؟

بس بی بی جی کیا بتاؤں اب تو اس کا ہاتھ پانی بھی میں خود کرتی ہوں نامراد پڑی پینے جوگا بھی نہیں رہ گیا۔ منجی سے جالگا ہے۔ صغریٰ نے ایک آہ بھری سمندر میں گرداب اٹھا اور پاتال میں اتر گیا۔

یہ لو کچھ پیسے رکھ لو عاصمہ نے چند نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ نہ بی بی جی پیسے رین دیں۔ پڑی تو مل رہی پر لے کر کیا کرنی۔ آٹا کسی چکی ہٹی میں نہیں مل رہا۔ آپ تو سارے سال جوگی کنک اکٹھی لے کر رکھتی ہیں جی، بس اپنی ڈرمی سے تھوڑا آٹا ڈال دیو۔ یہ کہتے ہوئے مائی کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور حسرت بھری نظریں انگلیوں کے گٹھوں پر جمی تھیں۔ عاصمہ نے آٹا ڈال کر ساتھ کر دیا اور چلتے چلتے زبردستی چند روپے بھی مٹھی میں تھما دیے۔

انہی دنوں عاصمہ کو کسی دوسرے شہر ٹرانسفر ہو کر جانا پڑا۔ واپس فیصل آباد تبادلے کے لیے تین چار مہینے کتنے ہی پاپڑ بیلے اور دفتروں کی خاک چھانی تب جا کر دوسرے گرلز کالج میں پوسٹنگ ہوئی۔ اسی جھنجھٹ میں کئی مہینوں تک مائی کی کوئی خبر نہ لے سکی۔ ایک دن گوالے سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ مائی جولاہی کا بھولا چل بسا تھا۔ اس نے دل میں ارادہ کیا کہ خود جا کر مائی جولاہی سے تعزیت کرے گی۔

اگلے ہی روز شام کے وقت اس کے بچوں نے باہر کھانے اور گھومنے کا پروگرام بنایا۔ اسکے میاں انہیں ایک بالکل نئے تعمیر ہوئے کینال پارک ریسٹورنٹ میں لے آئے۔ کھانے کے بعد بچے ادھر ادھر کھیلنے لگے۔ عاصمہ کے دل کو ہُڑک لگی ہوئی تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ ریسٹورنٹ جھگی کے قریب ہی بنا تھا۔ اسی تلاش میں وہ نہر کے ساتھ ساتھ چلتی کافی آگے نکل گئی۔ پرانی راج باہ کے ساتھ جولاہوں کی

جھگی کا نام ونشان تک مٹا دیا گیا تھا۔ کھڈی کے لیے کھودی جگہ برابر تھی جس پر تازہ گھاس اگا دی گئی تھی مختلف کیاروں میں موسمی پھول اپنی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ نہر کنارے ساری گرین بیلٹ دیکھنے والوں کو بہت خوب صورت نظارہ دے رہی تھی۔ جہاں کبھی جھگی ہوا کرتی تھی اس جگہ کسی ریسٹورنٹ کے مونوگرام والا سیمنٹ کا بنچ نصب تھا۔ عاصمہ نے حیران ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی عینک اتار کر شیشے فلالین کے نرم رومال سے صاف کیے پھر دوبارہ عینک لگا کر گہری نظر سے ادھر ادھر دیکھا اور لڑکھڑا کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ ''وے سائیں تیرے چرخے نے آج کت لیا کتن والی نوں۔''

☆☆

سلمیٰ جیلانی

عشق پیچاں

مقیم۔ نیوزی لینڈ
آبائی وطن- پاکستان
وہ جرائد جن میں افسانے شائع ہوئے۔۔

پاکستان، میں فنون ، ادبیکا ۔ اجراء ۔ ہندوستان میں ثالث ،خرمن، در بھنگہ ٹائمس وغیرہ ادبی جریدے میں ان کے افسانے شائع ہویے –اس کے علاوہ لائف اینڈ لیجنڈ اون لائن میگزین کی سب ایڈیٹر رہیں اور دیگر ممالک جیسے لندن، جرمنی، کینیڈا وغیرہ سے شائع ہونے والے اردو اور انگریزی کے کچھ اہم جریدے ورسائل میں تصنیفات شائع ہوتے رہے ہیں۔

تصانیف۔۔زیر ترتیب مختصر افسانے ،ترجمے اور غیر عروضی نظمیں

.....

عشق پیچاں یعنی انگلش آئی وی کی ننھی سی کونپل کو سامنے لگے ہوئے پام کے درخت پر سر اٹھاتے دیکھا تو میں نے کیاریوں کی صفائی کرتے ہوئے ناگواری سے اسے کاٹنے کے لئے قینچی بڑھائی -''ہفتہ دو ہفتے تک نہ دیکھو تو خودرو پودوں سے سارا باغیچہ جنگل بن جاتا ہے اچھے پودوں کو تو بڑھنے نہیں دیتے ،پچھلے سال جو درخت لگایے تھے وہ ابھی تک وہیں کے وہیں تھے اور یہ جھاڑیاں ہیں کہ.....'' چبھتی ہوئی دھوپ میں ان

پودوں کی دیکھ بھال اور بھی کھل رہی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا ایک تو مالی رکھنے کی سکت نہ تھی اور نہ ہی میری صفائی پسند طبیعت اس بات کی اجازت دیتی کہ گھر کے سامنے کا حصہ جھاڑ جھنکاڑ سے بھر جانے دوں-- اسی دوران، ننھے امرود کے پودے کے آس پاس لگی جھاڑیوں کو صاف کرنے میں مگن ہوگئی -- اس کی آبیاری میرے لئے بہت اہم تھی، آخر اس کے پھل کے ذائقے سے اپنے وطن کی یادیں جو جڑی تھیں،--- عشق پیچاں کی بیل کی طرف سے میرا دھیان ہٹ چکا تھا۔

کئی دن بعد-- آج پھر ہفتہ کو-- باغیچہ کی صفائی کا خبط سوار ہوا تو دیکھا-- اس بیل نے تو درخت کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، لگتا تھا یہاں کا مزاج اسے کچھ زیادہ ہی بھا گیا ہے اور وہ تیزی سے پنپتی جا رہی تھی، میں نے سامنے برساتی نالے سے خراماں خراماں سڑک پار کرتی ہوئی بطخوں کی ٹولی کی طرف نظر جماتے ہوئے سوچا جنہوں نے تیزی سے آتی ہوئی کاروں کو اپنی رفتار آہستہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا، ایک کار والے کو زیادہ ہی جلدی تھی اس نے غلطی سے کہیں ہارن پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور باقیوں نے جو اسے گھور کر دیکھا-- ان میں سے ایک نے سڑک کے کنارے لگے سائن بورڈ کی طرف اشارہ بھی کیا، جس پر بطخوں کی گزرگاہ کا اشارہ بنا ہوا تھا-- گویا بطخوں کی راج دھانی میں مخل ہونے کا اسے کوئی حق نہ تھا-- کچھ منٹوں کی رونق کے بعد سڑک پھر خالی ہو چکی تھی اور میرا دھیان بیل کی طرف پلٹ گیا تھا'' آج تو میں اس بیل کو ختم کر ہی ڈالوں گی-- اتنا خوب صورت پام کا درخت اس سے متاثر ہو رہا ہے'' میں نے دل میں سوچا اور بڑے جوش سے تنے پر لپٹی بیل کی ٹہنیاں نوچنے لگی'' ارے-- ارے-- کیا کر رہی ہو'' پیچھے سے میاں صاحب نے آواز لگائی'' آپ دیکھ نہیں رہے-- کتنی تیزی سے یہ طفیلی بیل بڑھ رہی ہے، سارے درخت کھا جائے گی'' میں نے جھنجلا کر جواب دیا بھئی یہ میرے دوست جمال نے دی ہے اس کا تازہ پھولوں کی آرائش کا کاروبار ہے اس کو بیل کے پتے چاہیے ہوتے ہیں گلدستوں میں لگانے کے لئے اور اس کا گھر بہت چھوٹا ہے تو ہمارے یہاں اگر تھوڑے سے حصے میں یہ بیل لگ جائے گی تو اس میں ہمارا کیا نقصان ہے، انہوں نے

ایکوفیمینزم

ہمارے ادراک واحساس اور جمالیاتی ساخت کا تخلیقی توانائی سے حرارت لے کر حسنِ اظہار کے مختلف اسالیب میں ڈھل جانے کا نام ادب ہے۔ انسانی زندگی ''مشاہدے" سے ''تجربے'' کے درمیان جھولتی، گرتی، سنبھلتی اور ہچکولے کھاتی رہتی ہے۔ اس کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور دکھانے کی فنی مہارت، کبھی قریب اور کبھی فاصلے سے برتنے کا ہنر، اس کی آگہی اور بصیرت کا جمالیاتی بیان اور حسن کاری کے ساتھ ترسیل و ابلاغ، ادب کا وسیلہ ہے۔ اس طرح فرد اور سماج کے تعلقات، حیات و کائنات کے تصورات، عقل و عشق کی کشمکش، خواب اور حقیقت کے ٹکراؤ کے ساتھ لفظ و معنی کے رشتوں سے بننے والے بے شمار معنوی انسلاکات اور شیوہ ہائے رنگارنگی کی امانت کا بوجھ اُٹھانا اور ناز برداری کرنا ادب کا تقاضہ ہے۔ اسی لیے ہر زمانے کا ادب مختلف زاویہ ہائے نگاہ رکھتا ہے اور اپنے وقت کی تحریکات اور اس سے پنپنے والے رجحانات کے زیرِ اثر ترجیحات کو قبول کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے، اور کشتِ حیات کو سیراب کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ جب ہم ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس میں نئی سوچ، تھیوری اور موضوعات جنم لیتے رہتے ہیں اور ان سے تخلیقی رویے کی تازہ کونپلیں پھوٹتی رہتی ہیں، جن سے ادب کی جمالیات اور شعریات میں ایک شادابی رہتی ہے۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں ثقافتی اور لسانی یک رنگی ختم ہوتی جارہی ہے۔ نتیجتاً زبانیں اور ادبی روایات اپنی علاقائی سرحدوں سے باہر کے اثرات قبول کر رہی ہیں۔ اس پیچیدہ باہمی ربط کے نتیجے

وضاحت سے بتایا نقصان ___ آپ کو کیا معلوم، یہ بیل ہمارے پودوں کو کتنا نقصان پہنچا رہی ہے۔ ''طفیلی ہے تو کیا ہوا اس کی وجہ سے کتنا ہرا بھرا لگنے لگا ہے باغیچہ، کیا تمہیں یہ سب اچھا نہیں لگ رہا؟'' انہوں نے مزید استفسار کیا۔

''آپ کونسا باغبانی کرتے ہیں، جو اس بات کو سمجھیں گے''

''ہاں---بس ایک تم ہو اور تمہارے پودے،

تم! ارے تم تو پوری سنکی ہو،

درختوں سے ایسے باتیں کرتی ہو جیسے وہ سب سن رہے ہوں''

''آپ کیا سمجھیں گے، چھوڑیں اس بات کو'' میں نے تنک کر کہا

ان سے الجھنے کا مطلب سارا دن خراب گزرنا تھا جو میں نہیں چاہتی تھی

سو---اندر جانے میں عافیت سمجھی۔

اب انہیں کیا یاد دلاتی کہ گئے دنوں میں جب بڑے گملے میں لگی ہوئی رات کی رانی کو بچوں نے کرکٹ کی بال مار کر توڑ دیا تو اس رات وہ میرے خواب میں آئی تھی، پھر یہاں ہجرت کے وقت اسے اپنی دوست انیلہ کے گھر زمین میں لگوا آئی تھی، جیسے وہ ہمارا کوئی بچہ ہو جسے یہاں لانے کی اجازت نہ ملی ہو، بعد میں اس کی خیر خبر بھی پوچھا کرتی تھی تو انیلہ کہتی ''ہاں--وہ تمہاری بیٹی رات کی رانی بھی ٹھیک ہے، چاندنی رات میں خوب خوشبو مہکاتی ہے تو تمہاری یاد بہت آتی ہے''۔

کچھ وقت گزرا تو کام کے سلسلے میں ایک ماہ کے لئے ویلنگٹن تبادلہ ہو گیا موقع بموقع ہونے والی بارش نے پودوں کے لئے پانی کا مسئلہ تو حل کر رکھا تھا واپس آ کر جو دیکھا، پام کا درخت تو پورا عشق پیچاں کی بیل سے اٹ چکا تھا اور ساتھ والا میگنولیا کا درخت بھی، جو ہر وقت سفید پھولوں سے ڈھکا رہتا تھا اب ہرے پتوں سے بھرا ہوا تھا جو اس کے نہیں بلکہ عشق پیچاں کی بیل کے تھے- وہ انہیں بری طرح گھیرے میں لے چکی تھی، ان کے تنے سوکھ چکے تھے اور چھال مرجھا کر جھڑ رہی تھی- یہ سب دیکھ کر میرا دل دکھ سے بھر گیا، لیکن- درختوں کے اس درد کو صرف میں ہی سمجھ سکتی تھی، میں نے آؤ دیکھا

نہ تاؤ، اپنی بڑی سی قینچی اٹھائی اور پام کے درخت سے بیل کاٹنے کی سعی کرنے لگی لیکن ---- مجھے اندازہ نہ تھا-- یہ سب کچھ اب اتنا آسان نہ رہا تھا، بیل کی جڑیں درخت کے اندر تک مضبوطی سے گھر کر گئی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر ہاتھ مارے-- لیکن چند ہی شاخیں کاٹنے میں کامیاب ہو سکی، درخت کے اوپری حصے تک تو میرا ہاتھ کسی طرح پہنچ ہی نہ پایا تین چار دن لگا تار کوشش میں لگی رہی مگر خاطر خواہ کامیابی نہ ہونے پر اچھی خاصی دل برداشتہ ہو چلی تھی-

ادھر گھر کے کام کاج میں حرج ہونے لگا تھا اور آفس کے کاموں نے بھی اس طرح گھیرا کہ پھر کئی دن باغیچے کی خبر نہ لی-

آج صبح سے ہوا بہت تیز تھی، لگتا تھا جیسے ویلنگٹن کی ہوا ساتھ میں آ گئی ہو، جہاں ہر وقت اس کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ اکثر ہوائی جہاز بھی اڑتے ہوئے اپنا راستہ بدل لیتا ہے-

خیر--- میں نے گھر کے پچھلے حصے میں لگی الگنی پر پھیلے ہوئے کپڑے سمیٹنا شروع ہی کیے تھے کہ--- دھڑام کی آواز آئی- دل دہل سا گیا

''یا اللہ خیر--- کیا گر گیا-- کہیں گیراج کی چھت تو نیچے نہیں آن پڑی، ہلکے پلاسٹک کی چھت جو پہلے ہی اولوں کے ستم سہ سہ کر کمزور ہو چکی تھی اب تیز ہوا کے جھکڑوں کو برداشت نہ کر سکی ہو تو کیا تعجب-

بھاگم بھاگ سامنے آ کر جو دیکھا-

پام کا درخت--- بمع عشق پیچاں کی بیل کے زمین پر اوندھا پڑا تھا--- تنا بیچ میں سے ٹوٹ چکا تھا صاف ظاہر تھا کہ بیل کا بوجھ نہ سہار سکا اور زمین پر آ رہا تھا-

کوئی ایک ماہ بعد کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پام کے ٹنڈ منڈ تنے پر نظر جماتے ہوئے میں نے اداسی سے سوچا'' بے چارہ--- اس کی جڑیں اب بھی زمین چھوڑنے کو تیار نہیں--- اسے معلوم ہی نہیں کہ اس میں اب کبھی شاخیں نہیں پھوٹیں گی، کیا درخت بھی خود کو دھوکہ دیتے ہیں؟--- میں نے خود سے سوال کیا-- جواب---

---اندر---بالکل خاموشی تھی-----ایک اور بم دھماکہ---پاکستانی چینل پر خبر آرہی تھی---میری کچھ سمجھ میں نہ آیا، سامنے میز پر پڑا ریموٹ اٹھایا اور چینل بدل دیا۔

☆☆

ترنّم ریاض

مجسّمہ

آبائی وطن ۔سرینگر کشمیر۔ ہندوستان
مقیم ۔نئی دلی ۔ بھارت
وہ جرائد جن میں افسانے شائع ہوئے،
ہندوستان میں آجکل ،ایوانِ اردو، نیاورق اور بعض دسرے رسائل کے علاوہ پاکستان میں ،ادبِ لطیف ،فنون ،اوراق ،ادب دوست وغیرہ اور دیگر مما لک جیسے لندن، جرمنی ، کینیڈا وغیرہ سے شائع ہونے والے اردو اور انگریزی کے کچھ اہم جریدے
تصانیف ۔(ناول)''برف آشنا پرندے،''اردو ہندی۔''مورتی'' زیبِ خطہء گل''
افسانوی مجموعے۔''مرارحتِ سفر''،''یمبر زل''،''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''''یہ تنگ زمین''
تنقید۔''بیسویں صدی میں خواتین کااردوادب''۔، ''چشمِ نقشِ قدم''۔،

……………………

عظمیٰ چیخ سن کر پلٹی تو دیکھا کہ اُس کی سات سالہ بیٹی کا چہرہ سفید پڑ رہا ہے۔ بہت عرصے بعد آج صبح ہی اُس نے نوٹ کیا تھا کہ عُنّاب کے رخسار پہلی بار گہرے گلابی نظر آنے لگے تھے۔''کیا ہوا بٹیا؟''عظمیٰ مختصر سے پتھریلے زینے پر ٹھہر گئی اور پلٹ کر عنّاب کی طرف دیکھا تو عناب بھاگ کر اُس کے گھٹنوں سے لپٹ گئی۔''وہ……وہ…… مجسمہ چلنے لگا ہے امّی ۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے……وہ……وہ۔''عُنّاب پر کپکپی

طاری تھی۔

''نہیں بیٹے..... آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' عظمیٰ نے جھک کر اُس کے آنسو پونچھے۔ اُس کے ماتھے پر آرہے بالوں کو ایک ہاتھ سے سنوارا اور دوسرے ہاتھ سے اُسے لپٹائے رکھا۔ مگر اُس کا ہاتھ اُس کے رخسار کے قریب ہی ٹھہر گیا اور وہ خود کسی پتھر کے بُت کی طرح اُس منظر کو دیکھتی رہ گئی، جسے اُس کی عقل کسی صورت بھی قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔

اُس دن بچے جھیل کی سیر کے بعد بیحد اُداس تھے۔ عظمیٰ اُنہیں کسی ایسے مقام پر لے جانا چاہتی تھی جہاں اُن کا جی بھی بہل جاتا اور اُن کے تجسّس کی تسکین بھی ہو جاتی۔ عظمیٰ خود کو اُن کا مجرم سمجھ رہی تھی۔ مگر اُس کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ ''وہاں کی جھیلیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔'' عظمیٰ نے اُنہیں سفر کرنے سے کئی دن پہلے جھیلوں اور وادیوں کی بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ ''بٹکل لیک جیسی.....؟'' عتاب نے پوچھا تھا۔

''نہیں بیٹے..... یہ تو مصنوعی ہے..... سیاحوں کو attract کرنے کے لیے سرکار نے بنوائی ہے۔''

''تو کیا وہاں کی ساری جھیلیں Natural ہی ہیں۔'' عظمیٰ کا دس سالہ بیٹا راحل بولا۔

''ہاں بیٹے۔ جھیلیں تو قدرت کی ہی بنائی ہوتی ہیں۔ اب چونکہ انسان جھیلیں خود بھی بنا سکتا ہے اس لیے اب بہت سی مصنوعی جھیلیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مگر ہمارے وہاں کی جھیلیں دنیا کی حسین ترین جھیلوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اُن کا پانی اتنا شفاف ہوتا ہے جیسے..... جیسے.....''

''جیسے مِنرل واٹر؟'' دو میں سے کسی نے کہا تھا۔

''ہاں بیٹا..... ایسا شفاف کہ بس..... کوئی دس سال پہلے آپ کے ابّو کے ساتھ گئی تھی میں وہاں..... جھیل کی سیر کو..... شکارے میں بیٹھ کر۔ پانی اتنا صاف تھا کہ جھیل کی تہہ میں اُگی آبی گھاس صاف نظر آتی تھی۔ لمبی لمبی..... پانی کی سطح تک آتی

ہوئی۔ ذرا سا جھانکو تو ہری ہری گھاس میں روپہلی مچھلیاں ادھر ادھر پھرتی نظر آتیں۔ چھوٹی، بڑی بے شمار۔ آپ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ جھیل کے کناروں کے قریب جہاں پانی کی نسبت مٹی زیادہ ہوتی ہے وہاں گلابی رنگ کے نیلوفر یعنی..... کنول کے بڑے بڑے پھول کھلا کرتے ہیں..... اگست کے مہینے میں۔ اُن کے پتے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ عناب کے چھوٹے سے سر کا چھاتا بن سکتے ہیں۔'' عظمیٰ نے عناب کا سر ہاتھ میں تھام کر ہولے سے ہلا دیا۔ دونوں بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''پھر اُن مچھلیوں کے شکاری بھی نظر آتے ہیں۔ جانتے ہو کون؟''

''کون؟''

''نیل کنٹھ..... اور کون..... نیلے، سرخ، نارنجی پروں والے۔ لمبی چونچ اور چھوٹی دم والے۔ پانی کے بالکل قریب اُڑتے ہوئے اچانک گردن تک پانی میں ڈبکی مار کر جھٹ سے کسی مچھلی کو دبوچ کر 'پھرّ' سے اُڑ جاتے۔''

''بیچاری..... مچھلی.....'' عناب نے اُداس سا ہو کر کہا۔

''یہ تو Food Chain ہے..... کوئی نہ کوئی Living Being کسی نہ کسی دوسرے Living Being کو کھاتا رہتا ہے۔'' راحل نے عناب کو دیکھ کر سمجھانے کے انداز میں کہا تھا۔

عظمیٰ کی مسکراہٹ میں محبت جھلکنے لگی۔

''یہ تو ہم شہر کی جھیل کی بات کر رہے تھے۔ وہاں کے قصبوں میں اور بھی بہت سی مشہور جھیلیں ہیں جن کے حسن کا جواب ہی نہیں..... ایک تو دنیا کی شفاف ترین جھیلوں میں دوسرے نمبر پر آتی ہے۔''

''پہلی صاف جھیل Supreme Lake ہے نا امّی؟'' راحل نے سر ہلا کر کہا تھا۔

''ہاں بیٹا۔''

بچوں ہی کی طرح عظمیٰ خود بھی بے قرار تھی۔

کوئی دس برس ہو گئے تھے..... اُس نے اُن گلیوں کو نہیں دیکھا تھا جہاں وہ کھیلی تھی۔ وہ خوابوں میں خود کو اُن راستوں پر ٹہلتا دیکھتی جہاں سے گذر کر وہ سکول، کالج، یونیورسٹی گئی تھی۔ اُسے اس ہوا کی خوشبو یاد آیا کرتی جس کی ٹھنڈک اُس کے جسم و جاں کو تر و تازہ رکھتی تھی۔

کیا دن تھے وہ.....

وہ ہاتھوں کی محراب سی بنا کہ منھ پر رکھ لیتی اور اپنے کمرے کی درمیانی کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوئی منھ سے کک کک کک..... کک کک کک آوازیں نکالتی..... جانے کس درخت کی کون سی ٹہنی پر ننھے ننھے کیڑوں کو کھوجتا کوئی ہُدہُد اُس کی آواز میں آواز ملا دیتا۔ کبھی وہ بولتی، کبھی ہُدہُد بولتا۔

کھڑکی کے قریب ایک پُرانا پیڑ بھی تھا۔ جس پر سیاہی مائل سرخ شہتوت اُگا کرتے تھے۔ اُس کی شاخوں میں چڑیوں نے گھونسلے بنائے تھے۔ ان کی چہکار سے ہی اکثر وہ بیدار ہوا کرتی تھی۔

ایک دفعہ جب کرم کشی والوں نے ہر سال کی طرح، ریشم کے کیڑوں کے چارے کے لیے شہتوت کے درخت کی پتوں سے لدی ساری شاخیں اُتار لی تو چڑیا کا ایک گھونسلہ جانے کیسے دو ٹہنیوں کے درمیان ٹکا رہا تھا۔ مسہری پر کھڑے ہو کر عظمیٰ کو سارا منظر صاف دکھائی دیا کرتا تھا۔ چڑیا اپنے بچوں کے حلق میں چونچ ڈال کر اور سر جھٹک جھٹک کر دانہ اُنڈیلتی۔ اور بچے پنکھ پھڑ پھڑاتے للچائی للچائی سی چہکار چھیڑے رکھتے۔ عظمیٰ پہروں اُنہیں سنا کرتی، گھنٹوں دیکھا کرتی۔ چڑیا نے کیسے اُڑنا سکھایا تھا اپنے بچوں کو..... قدم بہ قدم..... جیسے عظمیٰ نے راحل اور عُناب کو چلنا سکھایا تھا۔ جس طرح اس کی ماں نے اُسے سکھایا ہوگا۔

چڑیا ایک بار پھدک کر بچے کو دیکھتی تو وہ بھی ویسی ہی کوشش کرتا۔ مگر کبھی ایک پنکھ کھولنا بھول جاتا کبھی عدم توازن کی وجہ سے گر پڑتا۔ یا پھر بس۔ چڑیا کی طرف چونچ کیے رہ جاتا۔ چڑیا کے بچوں نے جب پہلی انفرادی اڑان بھری تھی تو اُس کے کمرے کے

درمیان میں لٹک رہے چھوٹے سے فانوس پر آ بیٹھے تھے۔ وہاں کمروں میں سیلنگ فین کم ہی ہوا کرتے تھے بلکہ ہوا ہی نہیں کرتے تھے۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

وہ چوکھٹ پر دانہ بکھیر دیا کرتی تھی۔ بچے شاید اُس کی موجودگی سے کبھی خائف نہ تھے۔ فانوس کی تار کے ارد گرد سوکھی ہوئی چکنی مٹی سے دو ابابیلیوں نے سیلنگ سے لگا کر ایک گھونسلہ بھی بنا رکھا تھا۔ خدا جانے یہ مخصوص مٹی کس مخصوص ندی کے کنارے سے لاتی تھیں یہ ابابیلیں۔ ایک گھونسلے کے لیے ان گنت بار مٹی ڈھونا پڑتی۔ اور مٹی بھی ایسی جیسے اُس میں گوند ملا دیا گیا ہو۔ بھری ہوئی چونچ کی ساری مٹی گھونسلے سے چپک جاتی اور ایک ذرّہ بھی نیچے نہ گرتا۔ کبھی اتوار کو عظمیٰ جب دیر سے بیدار ہوتی تو سیلنگ کے قریب سے یاقوت جیسی چار آنکھیں چمکا کرتیں۔ چپ چاپ دیکھتی ہوئی۔ ابابیلوں نے کبھی اُسے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر جب وہ اُٹھ بیٹھتی اور کھڑکی کا پردہ سرکاتی تو وہ لطیف سی چہکار چھیڑ دیتیں۔ جیسے ایک ایک ماترا پر گایا جانے والا کوئی غیر یقینی نغمہ..... جن دنوں عظمیٰ اپنے اس کمرے میں اکیلی سونے لگی تھی تو ابابیلوں کی موجودگی نے اکیلے ہونے کا احساس تک اُس کے پاس نہ آنے دیا تھا۔

سفید سینوں اور کالے کالے لمبے پنکھوں والی ابابیلیں۔ جیسے خمیدہ کمر والی ضعیفاؤں نے سفید لباس پر بڑے بڑے سیاہ اوورکوٹ پہن رکھے ہوں۔

کتنی یادیں کتنے سُکھ وابستہ تھے اُس جگہ کے ساتھ۔ دکھ بھی وابستہ ہوں شاید..... مگر اُسے یاد نہ تھے۔

''مگر ہم جائیں گے کب امی.....'' عناب نے مچل کر کہا تھا تو راحل کی آنکھوں میں سوالیہ سی چمک جگمگائی تھی۔

''آج آپ کے ابو ٹکٹ لے آئیں گے..... بس آپ اپنی اپنی پیکنگ مکمل رکھئے۔ کل یا پرسوں ہی نکلنا ہوگا..... گھنٹے بھر کی اُڑان..... اور ہم اپنے شہر میں.....''

جب وہ شہر پہنچے تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ایرپورٹ سے نکل کر سڑک پر آئے تو سفیدے کے لمبے چھریرے درخت دیکھ کر عظمیٰ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''یہ سفیدے کے درخت ہیں بیٹا۔''

گاڑی کی پچھلی نشست پر اپنے دائیں بائیں بیٹھے بچوں سے اُس نے کہا۔

''اور وہ بید کے.....یعنی Willow۔''

فیروز نے ہاتھ سے سڑک کے کناروں سے ذرا دور باغوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ان کی ایک قسم Weeping Willows کہلاتی ہے جو زیادہ نمی والی زمین میں اچھی طرح پنپتی ہے۔

''Weeping کیوں ابّو.....''

''وہ بیٹا اس لیے کہ اُن کی ساری شاخوں کا جھکاؤ زمین کی جانب ہوتا ہے۔ جیسے کسی پہاڑی سے کوئی جھرنا بہہ رہا ہو۔ ان کو بید مجنوں بھی کہتے ہیں۔''

''برگد کی طرح؟، جس کی جڑیں اوپر سے نیچے لٹکتی رہتی ہیں۔'' راحل نے کہا۔

''ہاں۔ کچھ کچھ۔''

''لوگ کتنے گورے ہیں.....وہ دیکھئے امّی۔'' راحل نے سڑک کے کنارے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں بس سٹاپ پر کچھ طلبا بس کے منتظر تھے۔

''اور Red,Red بھی۔'' عُناب نے کہا۔

''آپ یہاں رہیں گے تو آپ بھی ایسے ہی سرخ و سفید ہو جائیں گے۔ یہاں کی ہوا تازہ جو ہے..... پہاڑوں پر ایسی ہی تازگی نظر آیا کرتی ہے..... جب ہم یہاں سے گئے تھے تو راحل کے رخسار سیب ایسے سرخ تھے۔'' عظمیٰ نے اُس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔

''اور میرے امّی.....''

''آپ تو پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ Metro Polis اور گرم آب و ہوا میں رہ کر ہم سب ہی سانولے سلونے ہو گئے.....'' عظمیٰ ہنس دی۔

چھٹیاں مہینے بھر کی تھیں۔ ہفتہ بھر رشتہ داروں سے ملاقاتوں میں گذر گیا۔

دوسرے ہفتے کوئی چھ روز ہڑتال رہی کہ کسی دکاندار کو کسی سرکاری محافظ نے

محض اپنی انا کی تسکین کی خاطر گولیوں سے بھون دیا۔ اُس کے بعد شہر میں اِدھر اُدھر بم دھماکے ہونے لگے۔ ضروری کاموں کے لیے لوگ قدرت کے بھروسے نکل جاتے مگر گھومنے پھرنے کے خیال سے کہیں جانا.....؟ بات کچھ بنتی نہ تھی۔

پھر یوں ہوا کہ اُن کی رہائش ہی کے باہر بارودی سرنگ میں دھماکا ہوا..... دھماکے والے بھاگ گئے۔ راہگیروں کو پکڑا گیا۔ گھروں کی تلاشیاں ہوتی رہیں۔

تین دن پہیہ جام رہا.....اور آخر ہفتہ بس سوچوں میں گذر گیا۔

واپسی میں دو دن رہ گئے۔ اب تو کہیں جانے کا پروگرام بنانا ہی تھا۔ بچے جھیل کی سیر کے لیے بیقرار تھے اور ان سے زیادہ عظمیٰ اور فیروز۔

جھیل تک کا راستہ کچھ زیادہ طویل نہ تھا۔ اُن دنوں اُس راستے میں پانچ چھ سرکاری پارک ہوا کرتے تھے۔ اب صرف ایک بچا تھا۔ باقیوں میں قطار در قطار نئے نئے کتبے کھڑے تھے۔ اکثر پر درج عمریں ۱۵ اور ۳۰ برس کے درمیان تھیں۔

وہ لوگ جب جھیل کے قریب پہنچے تو موسم نہایت خوشگوار تھا۔

جھیل کا باندھ کئی جگہ سے ٹوٹ چکا تھا۔ کناروں کے پانی میں چھلے ہوئے بھٹے اور Wafers کے خول تیر رہے تھے۔ پانی گدلا تھا۔

''یہ تو گندی ہے امّی.....'' عُناب نے ماں کی طرف دیکھ کر بے یقینی کے سے تاثرات لیے کہا۔

''یہ کنارہ ہے نا.....آگے آگے بالکل شفاف ملے گی جھیل۔'' عظمیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ فیروز شکارے والے سے بات کر رہا تھا۔

''ہم شکارے میں بیٹھ کر وہاں تک جائیں گے.....وہ.....وہ دور جو چھوٹا سا جزیرہ ہے نا.....جس میں چنار کے چار درخت ہیں.....وہ وہاں.....وہاں جاتے ہوئے ہمیں راستے میں بے شمار ننھی ننھی مچھلیاں، ہری ہری آبی گھاس.....نیل کنٹھ اور سب کچھ دیکھنے کو ملے گا۔'' عظمیٰ نے ہاتھ سے دور اشارہ کر کے بچوں سے کہا۔

ہری بیلوں اور بڑے بڑے سرخ پھولوں والے پردوں اور نرم ربر کی کشادہ

کے طور پر حالیہ برسوں میں نئی ادبی اصطلاحیں اور نئے تنقیدی محاورے وضع کئے جا رہے ہیں تا کہ مختلف قومی روایات، زبانوں اور ثقافتی رسومات کے درمیان ایک باہمی ربط کا بخوبی مطالعہ پیش کیا جا سکے۔ گویا ادبی تنقید میں نئے نئے ادبی مکالمات، ڈسکورس اور تحقیقی سطح پر نئے نئے منکشافات کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر ہم گذشتہ ستر پچھتر برس کی ادبی تحریکات کا جائزہ تعقلاتی فریم ورک (Conceptual Frame Work) اور تخلیقی نظامِ اقدار کے حوالے سے لیتے ہیں تو مختلف تخلیقی رویے اور مختلف تنقیدی رجحانات نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

ادبی اصطلاحیں جس سانچے میں ڈھلتی ہیں اور تخلیقی رویہ جس نظامِ اقدار کے حوالے سے اپنی شناخت قائم کرتا ہے وہ اتنا سبک، نازک اور لطیف ہوتا ہے کہ وہ ہمارے جمالیاتی شعور کی کسی نہ کسی سطح پر انبساط کا سامان کرتا ہے۔ ایک ادیب یا فن کار کسی نظریے یا فلسفے کو اپنی جمالیاتی سرگرمیوں کا مرکز بنا سکتا ہے، لیکن اس کی بنیاد پر جمالیاتی اصول اور معیارات سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح دوسرا فن کار کسی نظریے یا فلسفے سے بے نیاز ہو کر یا اُن کا پابند ہوئے بغیر فن کے عظیم نمونے ایجاد کر سکتا ہے۔ نظریہ فکر و فن کی شرائط میں سے نہیں ہیں، البتہ محاسن ہو سکتے ہیں۔ شعور کا جمالیاتی تناظر ایک مربوط معنویت پر استوار ہو تو اس کی بدولت جمالیاتی رسائی میں اضافہ یقیناً ہوتا ہے۔ ادب تصور جمال کا موجد نہیں ہوتا بلکہ ایک موجود تصور جمال کی خلاقانہ اتباع اور صورت گری کرتا ہے۔ ہر تہذیب دیگر مجموعی تصورات کی طرح جمال کا بھی ایک تصور رکھتی ہے۔ اس کی ماہیت ذہنی یا انفرادی یا وقتی نہیں ہوتی بلکہ اس میں بھی حق اور خیر کے تصورات کی طرح وہ اقداری استقلال پوری طرح موجود ہوتا ہے جس میں تبدیلی و تغیر کا امکان محض خال خال کارفرما رہتا ہے، اصول ان کی پہنچ سے ماورا رہتے ہیں۔ ہماری روایت اپنی اصل اور مقصود، یعنی حقیقت کے تناظر میں جن بنیادی تصورات پر مبنی ہے، اُن کی باہمی نسبتوں کا شعور ہماری اصطلاح میں حکمت کہلاتا ہے۔ یعنی حقیقت کا اظہار اور تصور جمال چونکہ حقیقت کے سلسلہ ظہور اور اس میں پائے جانے والے تنوع کو محفوظ

سیٹوں والا ایک شکارہ کنارے کے زینے سے لگا ان کا منتظر تھا..... شکارے کا نام لیک ڈ(Lake Bird) تھا۔

بچے گاؤتکیوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔ عظمیٰ اور فیروز آگے والی نشست پر بیٹھے اپنے اطراف دیکھ رہے تھے..... کوئی دو ایک شکارے دور دور نظر آ رہے تھے۔

''رونق کتنی کم ہوگئی ہے''۔ عظمیٰ نے رونق کے غائب ہونے کی جگہ رونق کم کہا تو فیروز کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

کشتی کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ عظمیٰ کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔

کتنی یادیں وابستہ تھیں اس جھیل کے ساتھ..... وہ اپنے ابّو امّی اور بہن بھائیوں کے ساتھ ایک بڑی سی گھر نما کشتی میں، عمدہ پوشاک پہنے، سامانِ خورد و نوش سے لیس جھیل کی سیر کو نکلی ہے۔ کناروں پر مغل باغات کی سیر بھی کی جائے گی..... ابّو کتنی مصروفیت کے باوجود چھٹی کے روز سب کو سیر پر لے جاتے تھے۔

اب ابّو بھی نہیں رہے..... میلے کا سا سماں ہوا کرتا تھا۔ مقامی لوگوں سے لدی کشتیاں، ملکی اور غیر ملکی سیاح..... کوئی موٹر بوٹ پر جھیل کے پانی میں زور و شور سے لہریں پیدا کرتا ہوا جا رہا ہے کوئی Water Skeeing کر رہا ہے۔ ہنی مون پر آئے جوڑے شکاروں کے پردے برابر کیے عہد و پیمان میں مصروف ہیں، کہیں پیرا کی ہو رہی ہے، کہیں کسی فلم کی شوٹنگ چل رہی ہے..... کسی پھولوں سے لدی کشتی کو کوئی گل رخ حسینہ کھیتی ہوئی پھول بیچ رہی ہے۔ ان پھولوں میں گلِ نیلوفر اپنے حسن و جسامت کی بنا پر سب پھولوں کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے..... اُس کے ساتھ گلاب، نرگس، گیندا، موگرا، یاسمین اور جانے کون کون سی قسم کے پھول ماحول کو معطر کیے ہوئے ہیں۔ کسی کشتی پر پھلوں اور سبزیوں کی بہار ہے۔ جھیل میں تیرتے باغیچوں میں اُگی سبزیاں اور ایک سبزی جو پانی میں اُگا کرتی ہے۔ نیلوفر کے پھول کا موسم ختم ہو جانے پر اُس کے درمیان کا حصہ جہاں ننھی ننھی پتیاں اُگی ہوتی ہیں، رفتہ رفتہ پروان چڑھتا ہے اور مکمل ڈوڈہ کہلاتا ہے۔ جس

میں نرم و نازک لذیذ گریاں ہوتی ہیں اور اسی نیلوفر کی ڈنڈی بڑی ہوکر، کمل ککڑی، بھیں یا ندور کہلاتی ہے۔ جو ایک مرغوب سبزی ہے۔ جھیل کے کناروں پر ہی ایک مخصوص قسم کی گھاس بھی اُگتی ہے جس کی شاخیں نہیں ہوتیں۔ اس کی چٹائیاں بُنی جاتی ہیں۔ ان چٹائیوں پر مٹی بچھا کر اسے قابل کاشت بنایا جاتا ہے۔ ان تیرتے ہوئے باغیچوں میں اُگی سبزیاں حیاتین سے پُر ہوتی ہیں۔ عظمیٰ نے سنا تھا کہ اس طرح کے تیرتے ہوئے باغ وادی کے علاوہ دُنیا میں صرف جنوبی امریکہ میں 'پیرو کی ٹیکا' جھیل میں پائے جاتے ہیں لیکن وہ قدرت کے بنائے ہوئے جزیروں پر انسان نے لگائے ہیں، جانے کیسے تیرتے ہوں گے وہ جزیرے۔ اُن پر بھی سبزیاں اُگائی جاتی ہیں۔ مگر وادی کی جھیلوں، ڈل، وُلر، نگین وغیرہ پر تیرنے والے باغیچے انسان کے ہاتھوں کا کرشمہ ہیں---

آج پھلوں پھولوں والی کوئی کشتی نظر سے نہیں گزری ابھی تک۔

عظمیٰ سوچتی.....

یہ ملاح کتنی سست رفتاری سے بیاکھے رہا ہے۔ جیسے اُداس ہو۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں، پُرجوش ملاحوں کی کشتیوں میں بیٹھنا ایک الگ ہی لطف دیتا تھا۔

کہیں کیوں نظر نہیں آرہی تھیں آج یہ سب چیزیں۔؟.....کیوں.....؟ ہاں وہ جانتی تھی کیوں۔ مگر سمجھنے سے قاصر تھی۔ دور کنارے پر کہیں کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

عظمیٰ حیرت سے دیکھنے لگی۔

یہ تو اگست میں کھلا کرتے تھے۔ جون میں ہی کیسے.....ہاں کرۂ ارض کی حرارت بڑھ جوگئی ہے.....اسی لیے.....اس دفعہ دوپہریں کچھ گرم بھی تھیں.....عظمیٰ کو کئی بار خیال آیا تھا کہ یہاں بھی گرمی سے نپٹنے کا کوئی انتظام کیا جانا چاہیے۔ نئے مکانوں میں اسی لیے اب سیلنگ میں پنکھے لگائے جارہے ہیں.....حضرت بل کے

خواتین کی خاطر مخصوص عبادت والے دالان میں اس نے کولر بھی دیکھے تھے۔ فیروز نے بتایا تھا کی باقی دالانوں اور بالادریوں میں بھی مصنوعی ٹھنڈک کا انتظام کیا گیا ہے۔ پہلے صرف فرش پر ایستادہ رہنے والے پنکھے استعمال ہوا کرتے تھے، گرمیوں کے محض چند ایک دن کی خاطر۔

اوراب ...بھٹے، اخروٹ وغیرہ جو اکتوبر میں پکا کرتے تھے..... فروخت ہورہے ہیں..... ساری دنیا ہی بدل رہی ہے..... عظمیٰ آسمان کو دیکھنے لگی۔

مگر جھیل تو نہیں بدلی..... اسے یکلخت خیال آیا تو وہ جھک کر پانی کو دیکھنے لگی۔ کشتی کنارے سے خاصی دور آ گئی تھی..... مگر پانی..... عظمیٰ کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا اور ریزہ ریزہ بکھر گیا۔ وہ پانی کو دیکھتی چلی گئی۔ پانی مسلسل ویسا ہی نظر آ رہا تھا جیسا کناروں کے قریب تھا صرف اُس میں اس وقت اُسے چھلے ہوئے بھٹے اور ویفرس کی خالی تھیلیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

جھیل کا پانی پہلے سے اتنا مختلف تھا کہ اُسے محسوس ہوا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے..... کوئی ڈراونا خواب جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ اُس کے چاروں طرف میلا گدلا پانی تھا..... دور دور تک پھیلا ہوا..... جیسے پانی میں سیاہی جیسی کوئی چیز گھل گئی ہو۔ گلی سڑی گھاس کے تنکے پانی میں تیر رہے تھے۔ پانی کسی کم گاڑھے دلدل کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ محض انچ بھر گہرائی کے بعد، پانی کے اندر کچھ واضح نہ تھا کہ کنارے پر بنے ہوٹلوں اور آبی گھروں کی آلودگی کا نکاس جھیل میں ہی ہوتا اور صفائی کا انتظام نہ کے برابر۔ کہیں کوئی مچھلی نہیں تھی..... نہ ہی کوئی نیل کنٹھ۔ بچے اُس سے جانے کیا کیا سوال کررہے تھے۔ فیروز انھیں تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ شاید اپنے اندر کوئی بکھراؤ سا محسوس کر رہی تھی کہ خود کو سمیٹ کر کسی سے بات کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

کیا صدیوں پہلے کی طرح آج کوئی حکیم سُویہ نہیں پیدا ہوسکتا۔ کیا پھر سے کوئی معرکہ سر نہیں ہوسکتا۔ کتنا مشہور ہے کشمیر کی تاریخ میں سُویہ کا کارنامہ۔ صدیوں پہلے کا

کارنامہ.....نویں صدی کے ایک راجہ اونتی ورمن کے راج میں ایک دانا درباری حکیم سُویہ ہوا کرتا تھا۔ جہلم جو اُن دنوں وِتستا کہلاتا تھا، گرمی کے موسم میں اکثر و بیشتر طغیانی پر ہوتا کہ دھوپ کی تمازت سے پہاڑوں کی برف پگھل کر وادیوں کی طرف بہہ نکلتی تھی۔ اور کناروں پر بسے گاؤں، شہر سیلاب کی زد میں آ جاتے تھے۔ خطے کے شمالی علاقوں میں ایک حصہ ہر برس جب سیلاب کا شکار ہونے لگا تو سُویہ نے رعایا سے محبت کرنے والے راجہ اونتی ورمن کے خزانے سے اشرفیاں لے کر دریا میں پھینکی جنھیں پانے کی خواہش میں لوگوں نے دریا کی تہہ سے مٹی نکال کر دریا کو گہرا اور کناروں کو اونچا کر دیا جس سے سیلاب کا خطرہ جاتا رہا.....لوگ سُویہ کے اس کارنامے کی وجہ سے اُسے حکیم سُویہ پکارنے لگے کہ اُس کی حکمت سے وہ ایک بہت بڑی مصیبت سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے تھے۔ اس مقام کا نام سُویہ پور رکھا گیا جو رفتہ رفتہ سوپور ہو گیا..... عظمیٰ افسردگی سے سوچتی رہی.....کیا آج کوئی ایسا حکیم.....کوئی حاکم.....کوئی ہمدرد.....کوئی.....کشتی کو ہلکا سا جھٹکا لگا تو اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کشتی کنارے سے لگ چکی تھی۔ بچے بجھے بجھے سے تھے۔ فیروز خاموش.....اور وہ خود بے حد اُداس۔ فیروز کو کہیں جانا تھا۔ عظمیٰ کی نظر بچوں کے چہروں کی طرف اُٹھ گئی۔

''عجائب گھر دیکھیں.....؟.....Musium؟۔''

پتہ نہیں اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جیسی کوئی شے کہاں سے آ چپکی۔

''ایک دم پرانے زمانے کی چیزیں..... جو آپ نے کبھی نہ دیکھی ہوں گی.....'' اُس نے تاثرات میں اشتیاق پیدا کیا۔

''جی امّی.....'' راحل نے آہستہ سے کہا۔

''ہم بھی دیکھیں گے.....'' عناب ہلکے سے مسکرائی۔

میوزیم جہلم کے کنارے ایک روح پرور باغ سے لگا ہوا نہایت پرسکون معلوم ہو رہا تھا۔ پھاٹک کے قریب ریت کے تھیلوں میں محفوظ پہرے دار نے ان کی شناختی پرچیوں کا معائنہ کیا.....میوزیم میں داخل ہوتے ہی بچے ہشاش بشاش نظر آنے لگے۔

احاطے سے اندر داخل ہوتے ہی ایک پرانے وقتوں کی توپ نے ان کا استقبال کیا۔ اُس کے بعد مہاتما بدھ کا ایک قدیم مجسمہ نظر آیا۔ داہنی طرف چھوٹا سا زینہ اتر کر باغیچے کے کنارے سے لگا ہوا ایک بہت بڑا پتھر تھا جو کوئی کتبہ معلوم ہوتا تھا۔ دوسری طرف بغیر سر کی ایک مورتی تھی جس کا جسم نہایت خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔

عمارت کے اندر جانے کا راستہ مختصر تھا اور پتھر کی پتلی لمبی سلوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر بنایا گیا تھا..... سلوں کے درمیان جا بجا ہری ہری گھاس اُگ آئی تھی۔

عمارت میں داخل ہوتے ہی اُن کی نظر سرسوتی کے ایک پرشکوہ مجسّمے پر پڑی، جس کے قدموں کے پاس لکھی عبارت پر دوسری صدی کی کوئی تاریخ درج تھی۔ سرسوتی کا مجسمہ آنکھیں بند کیے پراسرار سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ شیشے کے ایک بڑے شوکیس میں ایک اور مورتی تھی..... یہ مورتی درگا کی تھی جو ایک بہت بڑے دروازے میں جڑی ہوئی تھی۔ غالباً کسی مندر کا حصہ رہی ہوگی اور کھدائی میں دریافت ہوئی تھی۔ اُس کے گرد لگے دائرے میں ماتا درگا کے مختلف رُوپ لیے کئی چھوٹے چھوٹے مجسّمے تھے..... اور یہ سب ایک ہی پتھر کو تراش کر کسی عظیم فن کار نے نہایت مہارت سے بنایا تھا۔

''یہ چھٹی صدی میں رائج تھا..... تانبے کا ہے۔'' بجھے بجھے سے گائڈ نے عجائب خانے کی سیر کو آئے اکلوتے سیاح کنبے کو بتایا۔ یہ سکہ مجسّمے کے بالکل سامنے شیشے کی چھوٹی سی صندوقچی میں لگا تھا۔

دوسری طرف بھگوان مہاویر کا بہت بڑا مجسمہ جیسے کہ صدیوں سے مراقبے میں بیٹھا تھا۔ کونے میں کالی کی پُرجلال مورتی تھی۔ اُس کا ترشول اُس کے پیروں کے پاس پڑے کسی ظالم کے سینے میں پیوست تھا۔

ہال کا آخری سِرا ایک مستطیل کمرے کے ساتھ جوڑا گیا تھا..... جس میں چھوٹے سے دروازے سے گذر کر ہی داخل ہوا جاتا۔

اُس کمرے میں مختلف اوزار اور ہتھیار تھے۔ شیشے کی الماریوں میں بند۔ جن کے خانوں پر سَن، حاکم کا نام وغیرہ درج تھا۔

راحل اور عناب انھیں نہایت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

چھ چھ فٹ لمبی بندوقیں..... ذرہ بکتر۔ کچھ ہاتھی دانت کے دستے والی تلواریں تھیں۔ مخصوص امراء وزراء کی۔ کچھ پر دھات میں چھلائی سے گل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ ماضی کے سیاست والے اوراق کو تاریخ بنانے کے عمل کے عوض اپنے حصے کا خون پی کر سارے ہتھیار خاموشی کے ساتھ دیوار سے لگ کر آ کھڑے ہوئے تھے۔

عظمیٰ نے ایک گہری سانس لی۔

قافلہ دوسرے ہال میں داخل ہوا..... وہاں کی اشیاء بالکل مختلف تھیں۔ مغلوں کے زمانے کے غالیچے۔ پشمینے کے قالین..... شاہ توس کی ایک بڑی سی چادر پر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے وقت کے شہر کا ایک نقشہ۔ مکمل تفصیل سے بنا ہوا۔ جس میں جھیلیں، بستیاں، کوہ، دریا سب مختلف رنگوں کے ریشمی دھاگوں سے کاڑھے گئے تھے۔

مغلیہ، شاہی پوشاکیں، رومال وغیرہ۔ پیر ماشی اور اخروٹ کی لکڑی سے بنی دستکاریاں مختلف دھاتوں کے برتن۔ ہاتھ دھلوانے والا تانبے کا قلعی کیا ہوا بہت بڑا منقش کوزہ اور آفتابہ۔

''اسے کیسے استعمال کرتے ہوں گے امّی؟'' راحل نے پوچھا۔

''کئی کئی لوگ اٹھاتے تھے دونوں کو..... بیک وقت کم سے کم چھ چھ آدمی۔'' گائڈ نے اُسے بتایا۔

شیشے کے ڈھکن والی لمبی سی میز کے اندر مختلف دھاتوں کے ہاتھ سے بنے زیورات تھے۔ ان میں کچھ اب بھی رائج ہیں۔ عظمیٰ نے سوچا۔ جیسے کانوں کے بڑے بڑے بالے۔ اتنے بھاری جھمکے کہ ایک دوسرے سے ایک زنجیر کے ساتھ جوڑے گئے تھے۔ وہ زنجیر سر کے اوپر آنچل کے اندر رہتی اور کانوں پر بوجھ نہ پڑتا۔

دھات اور پتھروں سے بنی پازیبیں، مالائیں..... کچھ برتن۔ کچھ قدیم کتب کے قلمی نسخے..... مغل بادشاہ اورنگ زیب کے ہاتھ سے لکھا ہوا قرآن پاک۔ کچھ قدیم ریاستی معاہدے.....

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

اتنی دلچسپ اور اہم اشیاء کو دیکھ کر عظمیٰ اور بچّے کچھ ِ کھلے سے مطمئن سے نظر آ رہے تھے۔ اور پُر اشتیاق ہر شے کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

اس کے بعد کے ہال کو ایک راہداری کے ذریعے دوسری طرف کے ہال کے ساتھ جوڑا گیا تھا۔ بچّے اگلے ہال کی طرف جا چکے تھے۔

عظمیٰ جب وہاں پہنچی تو بچّے نہایت انہماک سے وہاں نسب مجسّموں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ مجسمے ریاست کے تینوں خطوں میں رہنے والے لوگوں کے مختلف ملبوسات میں ایستادہ ڈمی کی طرح بنائے گئے تھے۔ مگر قدیم لباس میں۔ بغیر زیورات کے۔ سادہ۔ سادہ سے۔

اپنے بچپن میں بھی عظمیٰ نے انھیں اسی جگہ پر ایسے ہی نسب دیکھا تھا۔ ان کے کپڑے اب بوسیدہ ہو چکے تھے۔ گو کہ نلکیوں کے ذریعہ تمام الماریوں تک پرزرویٹو گیس (Perservative Gas) پہنچائی جاتی تھی مگر یہ مجسّے الماریوں میں نہیں رکھے گئے تھے۔

سامنے کا دروازہ ایک بڑے ہال میں وا ہوتا تھا۔ اس میں عنقا اور موجود، دونوں قسم کے بہت سے پرندوں اور جانوروں کی کھالیں حنوط کر کے اس مہارت سے اصلی شکل میں منتقل کی گئی تھیں کہ نقل کا گماں تک نہ ہوتا تھا۔

شیر۔ چیتا۔ تینداوا۔ مارخور بکرا جس کے سینگ خمدار ہوتے ہیں اور جو بڑے شوق سے سانپ کھاتا ہے۔ اود بلاؤ۔ نیولا۔ بھالو وغیرہ۔ اور اس کے علاوہ وادی میں پائے جانے والے پرندے، چیل۔ کوّا۔ گدھ۔ کبوتر۔ ُسن پچُر جو مور سے مشابہہ ہوتا ہے کہ اُس کے سر پر تاج تو ہوتا ہے مگر دم نہایت مختصر۔ مختلف قسم کی بطخیں، راج ہنس، بگلے، طوطے، مینا، کستوری، کئی طرح کی بلبلیں اور دیگر اقسام کی چڑیاں۔

اسی ہال میں دوسری طرف اکبر بادشاہ کا چھوٹا سا آدھے دھڑ کا مجسمہ تھا۔ عظمیٰ کو یاد آیا کہ جب وہ بہت چھوٹی سی تھی تو اُس کے چچا نے بنایا تھا۔ چچا بہت لگن سے مجسّمے بناتے تھے۔ انھوں نے اکبر کے تاج پر سونے کے گھول سے نقاشی کی تھی۔ پھر بازو کی تکلیف کی وجہ سے انھوں نے اپنا یہ مشغلہ چھوڑ دیا تھا۔ چچا نے اپنی ایک چہیتی بیوی کا

مجسمہ بھی بنایا تھا۔ وہ ان کی دوسری بیوی تھی۔ وہ مجسمہ اب بھی ان کی آبائی حویلی کے کسی گوشے میں محفوظ ہے۔

عجائب خانے کے ریکاڈ میں فن کار کا نام بھی محفوظ ہوگا۔ عظمیٰ کو خیال آیا۔

یہاں کئی مجسمے چچا کے ہاتھوں کے بنے تھے۔ اونی پھرن اور ٹوپی پہنے حُقہ پیتا ہوا آدمی۔ سماوار سے پیالی میں چائے انڈیل رہی تلّے کی کڑھائی والے گریبان کا پھرن پہنے خاتون۔ ہل چلاتا ہوا کِسان۔ دودھ بلوتی ہوئی گرہستن وغیرہ، کانچ لگی الماریوں میں محفوظ تھے اور اب بھی ان کی چمک جوں کی توں قائم تھی۔ ویسی ہی جیسے عظمیٰ نے اپنے بچپن میں دیکھی تھی۔

مگر ٹوٹے کانچ کی الماریوں کے اندر کی چیزوں میں کوئی جاذبیت باقی نہیں تھی۔ یعنی حال کی طرح ماضی بھی اُجڑ سکتا ہے کہ یہاں کی بھی دیکھ بھال ٹھیک طرح سے نہیں ہو رہی تھی۔ عظمیٰ نے ایک گہری سانس لی۔

گائڈ دوسرے دالان تک ساتھ آ کر لوٹ گیا تھا۔

وہ اُداس اُداس سی آگے بڑھتی رہی..... ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتی ہوئی جانے کیا کیا سوچتی ہوئی۔

ہال کے آخری سرے پر جہاں سے برآمدہ نظر آتا تھا، ایک قدِ آدم مجسمہ ایک پرانی چھوٹی سی میز پر ٹکا ہوا تھا۔ جیسے کسی ایسی بیمار لڑکی کی مورت، جو کھڑی رہنے سے تھک کر ذرا سا میز پر بیٹھ گئی ہو۔ سوکھی لکڑی سے ہاتھ پاؤں..... گڈھوں میں دھنسی آنکھیں..... عظمیٰ نے یہ مجسمہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ کس قدر عظیم فن پارہ ..... کسی بلند درجہ فن کار کا بنایا ہوا مجسمہ..... وہاں کی ادھیڑ عمر کنواریوں کا ہو بہو عکاس۔ عظمیٰ اس شاہکار کو انگشت بدنداں دیکھتی رہ گئی۔

واہ.....

جانے مجسمے کی آنکھوں میں کیا بات تھی کہ دل میں درد سا بھر جاتا..... اس کی نظریں باہر برآمدے والے راستے پر گڑھی تھیں جیسے کسی کی راہ تک رہا ہو۔

عظمیٰ عش عش کر اُٹھی۔

اور بچوں کو بلاتی ہوئی عمارت سے باہر نکل آئی۔ راحل اُس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

عناب نے پکار کر کہا کہ آ رہی ہے.....

عجائب خانے کے کراہتے ہوئے سکوت میں اُس کی آواز گونج اُٹھی.....

اونگھتے ہوئے محافظ نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔

عظمیٰ آگے بڑھ گئی۔ ابھی اُس نے پہلے ہی زینے پر قدم رکھا تھا کہ اُسے عناب کی چیخ سنائی دی۔ عناب کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

ادھیڑ عمر کنواری لڑکی کالا عفریت مجسمہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا ہوا اُنہی کی طرف چلا آ رہا تھا۔

عظمیٰ دم بخود اُسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆

رکھتا ہے، لہٰذا اس کی کارفرمائی میں حسی اور تجرباتی رنگ حاوی رہتا ہے اور ذہنی کیفیت کم ہوتی ہے۔ اس لیے حکیمانہ شعور جمال کو نظریہ سازی اور فلسفہ طرازی کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ کیونکہ اس حکیمانہ شعور جمال کا حقیقت سے براہ راست واسطہ ہوتا ہے، ذہن جن اسالیب حصول کا پابند ہے وہ اس فضا کو اول تو گرفت میں نہیں لے سکتا اور اگر یہ کوشش کرتا ہے تو انتشار کا موجب بن سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسا اظہار ذہن اور عقل کے لیے fulfilling ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تخلیقی آسودگی کے معیار اور اس کی سطح کے حوالے یقیناً مختلف ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ مختلف نظریہ اقدار (Valuesystem) اور نظریہ حیات (World view) کی روشنی میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ نئی ادبی اصطلاحیں تنقیدی مباحث اور تقابلی جائزہ کو بامعنی اور تعمیری بناتی ہیں اور اس طرح ادبی تنقید میں ایک کھلا ڈسکورس اور مکالمہ جاری رہتا ہے۔ ایکوفیمینزم بھی تنقیدی مکالمے کا ایک نیا محاورہ ہے۔

Ecofeminism (ایکوفیمینزم) ایک ایسا ادبی نظریہ ہے جو حقوق نسواں کے مختلف شعبوں مثلاً تحریک امن (peace movements) خواتین کی صحت، (Women'shealth care) ماحولیاتی تحریکات (Environmental movement) اور جانوروں کی آزادی (Animal liberation) جیسی تحریکوں سے سے نمو پذیر ہوا ہے۔ ماحولیات، تحریک نسواں، اور سوشلزم کی بصیرت سے ماخوذ ایکو فیمینزم کے فلسفیانہ اساس کا ماننا ہے کہ وہ قوتیں جو نسل، طبقاتی فرق، صنفی یا جنسی فرق، اور جسمانی صلاحیتوں کی بنیاد پر استحصال کرتی ہیں وہ فطرت کے استحصال سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ ایکوفیمینزم نسلی، طبقاتی، صنفی، جنسی، اور جسمانی استحصال کی شدت سے مخالفت کرتا ہے اور تمام ظلم اور جبر کے خاتمے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جو ظلم، استحصال، لاقانونیت قائم ہے، کمزوروں کو بطور پائدان استعمال کر کے شہرت عام و بقائے دوام حاصل کرنے والے روشن چہرے مگر اندرون چنگیز سے تاریک تر جو کردار ہیں اور خاص طور پر عورت کے ساتھ معاشرہ میں جو ظلم روا رکھا جا رہا ہے یا اُن کو جس انداز

عینی علی

کنول پوش اور تاجر

مکمل نام۔قرۃ العین علی
مقیم۔جدہ،سعودی عرب
آبائی شہر۔لاہور پاکستان
گورمنٹ کالج لاہور سے ماسٹرز اور نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فیل کیا۔زمانہ طالب علمی سے لکھ رہی ہیں،اولڈ راوین ہیں اور گورنمنٹ کالج لاہور کے معروف میگزین راوی کی ایڈیٹر بھی رہیں۔انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں اور تراجم بھی کرتی ہیں۔ان کی نظمیں۔آرٹکل،افسانے تقریباً ہر اچھے جریدے کی زینت بن چکے ہیں۔

.....

وہ امن و آشتی سے معمور ایسی پرسکون روحیں تھیں کہ جنگل جو ہزاروں پرجاتیوں (انواع) سے بھرا ہوا تھا ان کے ہالے میں بنا کسی خوف کے بسنے لگا۔دور پرے بسنے والے شہر سے چھن چھن کر آتی روشنیاں بھی کبھی انہیں حیران نہ کر پائیں کیونکہ وہ ہمیشہ ایک راز کی پاسداری میں بے خود و سرمست اور شاداں رہتے تھے۔وہ راز اس دریا کا تھا جہاں چاندنی راتوں میں پریاں اترتیں اور اماوس کی گھور اندھیری راتوں میں بالشتیے جھاڑیوں کے نیچے دبے آہ و بکا کرتے۔شہر کے لوگ ان کے لیے بہت متجسس

رہتے تھے وہ کئی بار قصبے میں اپنے کھوجی بھیج چکے تھے تا کہ جنگل کنارے بسنے والے اس قصبے کے راز جان سکیں جس کے ساتھ ہی نچلی وادی میں پرسکوت دریا بہتا تھا۔ ہر بار کھوجیوں کو وہاں دریا کنارے صرف رنگے برتن، کھلکھلاتی عورتیں، لہکتے ہوئے بچے اور گاتے ہوئے مرد کنول چنتے نظر آتے۔ انہیں وہاں کوئی غیر معمولی شے دکھائی نہ دیتی لیکن ماحول کی افسوئی بتاتی کہ وہاں لازما پریاں ہوں گی بالشتیے ہوں گے اور کوئی نہ کوئی ایسا دریچہ بھی ہوگا جو حیات جاودانی کی جانب کھلتا ہوگا۔ ایک دن دور دراز کے کسی شہر سے شاطر (تیز طراز) تاجروں کے گروہ نے فیصلہ کیا کہ وہ وہاں تجارت کے نئے گر آزماتے ہوئے جگنوؤں کو چندھیاتی روشنیوں اور سرمستی کو امن سے تبدیل کر دیں گے۔ شمالی جنگلات سے سہمائے گئے درندے بھاگتے ہوئے کنول پوشوں کی بستی میں آن دھمکے۔ اتفاق سے یہ وہی دن تھا جب تاجروں کا وفد قصبے کے لوگوں کو اپنی سوچی سمجھی تجاویز پیش کر رہا تھا۔ قصبے کے لوگوں کو بتایا گیا کہ جگنو کبھی جنگلی درندوں کو ڈرا نہیں سکتے اور بے خودی کبھی انہیں اس قابل نہیں کرے گی کہ وقت پر بھاگ کر ان بنکروں میں چھپ سکیں جو تاجروں نے چند دنوں کے لیے مفت فراہم کئے تھے۔ قصبے کے لوگ بہت خوش تھے کہ ان کے پاس جگمگاتی روشنیاں ہیں امن ہے اور بہت سے کنول کے خریدار بھی جو بڑے بڑے ٹرکوں میں کنول لاد کر لے جاتے۔ پھر وہاں سخت کنکریٹ کی سڑک بھی تعمیر کر دی گئی جو جنگل کو شہر سے ملاتی تھی۔ وہاں پریوں کا دیس کے نام سے سیر گاہیں بنائی گئیں اور مصروف راہداریوں میں سسکتے ہوئے بالشتیوں کے مجسمے ایستادہ کئے گئے۔ کنول پوش اور تاجروں کی اس ''پرمسرت'' ہم آہنگی کے بعد بہت جلد ہی پریاں دریا کا راستہ بھول گئیں، جگنوؤں کا چمکنا معدوم ہوگیا اور جھاڑیوں کے نیچے چھپے بالشتیوں کے سب آنسو اس فراق میں خشک ہوگئے۔

☆☆

غزال ضیغم

''شکنتلا''

آبائی وطن۔شہرِ لکھنؤ کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں "بہار پور"
مقیم۔لکھنو
تصنیفات۔ایک ٹکڑا دھوپ کا (افسانوی مجموعہ)
مدھوبن میں رادھیکا۔(ہندی کہانی سنکلن)
سارے مئوقر ادبی رسائل وجرائد میں افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

.....

شفاّف پانی سے بھرا حوض جس میں سنہری روپہلی ننھی ننھی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔سفید اور گلابی کنول کے پھول دھیرے دھیرے کھل رہے تھے۔ان کے گول سبز پتوں پر پانی کی بوندیں ہیرے کی طرح چمک رہی تھیں۔ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔خوشبو دار انگنت بیلیں جھول رہی تھیں۔ایک لمحہ کو پانی میں شکنتلا کا عکس جھلملایا اور اسکی کھنکتی ہوئی ہنسی سے جنگل جاگ اٹھا۔جھرنے بہنے لگے۔پھلوں نے درختوں کی ڈالیوں کو جھکا دیا۔ گہری نیند سے دشینت جاگ اٹھا۔اچانک اسکی نظر انگوٹھی پر پڑی۔۔۔۔ارے ابھی تو شکنتلا کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا۔جنگلی ہوا تھی ساتھ۔۔۔۔کہاں گئیں تم۔۔؟ اسنے پی۔اے کو فون کھڑکھڑایا۔''ذرا فون نمبر بتانا شکنتلا کا۔۔۔؟'' نہ جانے بے چاری آشرم میں کیسی ہوگی۔میں تو بھول ہی گیا الیکشن لڑنے کے چکّر میں رہ گیا برسوں بیت گئے۔۔

''سر۔۔۔!'' ''یس۔۔۔۔'' ''کس شکنتلا کا نمبر چاہیئے ؟'' واٹ۔۔۔۔؟'' ''سر جی میرا مطلب ورمالا شکنتلا اور ما؟ سادھنا شکنتلا سوسودھیا؟ شکنتلا چودھری؟ ساگریکہ شکنتلا آریہ؟ رومیلا شکنتلا باٹلی والا؟'' کیا بک رہے ہو۔۔۔۔؟ (شکنتلا۔۔۔تمہارا سر نیم کیا ہے پیاری۔۔جسٹ آئی فارگیٹ) ''سر آپ کے کمپیوٹر میں کئی نمبر ہیں۔'' ''پیچھے سے دیکھو تو ذرا۔۔۔'' ''ساگریکہ ڈانسر ہے ورمالا ٹیچر، رومیلا ٹرانسپورٹ کمپنی میں ہے، چودھری ہاؤس وائف ہیں، سادھنا ٹائپسٹ ہیں۔۔۔۔'' ''دیکھو وہ آشرم میں رہتی تھی رشی جی کے۔۔ ہرا بھرا جنگل تھا خوب گھنا۔۔دن میں بھی روشنی نہیں نظر آتی تھی اتنی ہریالی تھی۔۔وہاں میں ہرن کا شکار کرنے ہی تو گیا تھا۔۔'' ''کس اسٹیٹ کے جنگل میں سر؟؟'' ''یاد نہیں آرہا اسٹیٹ کا نام۔۔۔'' ''سر۔۔۔تمام جنگل کٹ چکے ہیں۔۔۔ کالے ہرنوں کا شکار شہباز خان کر چکا ہے۔۔۔اور تمام سفید ہرنوں نے اس خوف سے خودکشی کر لی ہے کہ انکو کوئی قتل نہ کر دے'' ''اڈیڈیٹ۔۔۔۔۔۔۔'' ''یس سر۔۔۔۔'' ''اچھا 2010۔ ٹیلی فون انکوئری سے پوچھو۔۔۔'' ''سر وہ ٹاپ ماڈل مادھوریما شکنتلم کا نمبر دے رہا ہے۔۔'' ''تو ٹھیک ہے۔۔۔۔وہی لے لو۔!'' (یہی سہی۔۔۔۔)

☆☆

ڈاکٹر کوثر جمال

اہتمام

آبائی وطن- پاکستان
مقیم- سڈنی، آسٹریلیا

وہ ادبی جریدے جن میں افسانے شایع ہوئے- افکار، ماہِ نو، فنون، ادبیات
کتاب- مطبوعہ کتابیں: مور شہزادی (چینی لوک کہانیوں کا ترجمہ)---- مہکتے ہار
(چینی نظموں کا ترجمہ)---- چینی زبان (تحقیق)---- چین میں اردو
(تحقیق)---- چینی منگولوں کے شہر میں (سفرنامہ)------ جہانِ دگر
(افسانے)----

.....

یہ دسمبر کی ایک اجلی صبح تھی۔ رات بھر وہ نیند کی مسافت میں رہا اور اب اس کے حصے کی زمین اپنا چہرہ سورج کی طرف کر چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی کے پردے ہٹائے تو دھوپ کی نوخیز ترچھی کرنیں اٹھکیلیاں کرتی ہوئی کمرے میں یوں آئیں، گویا کہہ رہی ہوں: ''تم نے ہمیں کیوں روک رکھا تھا؟''۔ کمرے کے سرد فرش پر حرارت آمیز کرنوں کا رقص دیکھ کر اسے اپنا بستر سے اٹھنا اچھا لگا۔ اس نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر اپنے جسم کو شب بھر طویل نیند کے خمار سے آزاد کیا اور سست قدموں سے چلتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔ اس نے برنر جلانے کے لیے لائٹر تلاش کیا تو وہ وہاں موجود نہیں

تھا۔ چیزوں اور انسانوں کو اپنی جگہ سے غائب ہو کر اپنی اہمیت جتانے میں شائد ایک جیسا لطف آتا ہے۔ (کوئی تو ہمیں ڈھونڈے)۔ وہ لائٹر تلاش کرتا ہوا واپس اپنے بیڈ روم میں گیا اور برنر جلانے کے لیے اپنا سگریٹ لائٹر اٹھا لیا۔ واپس کچن میں آ کر اس نے کیتلی چولہے پر چڑھائی۔ پھر وہ پچھلے روز کے گندے مگ دھونے کے لیے سنک کی طرف گیا۔ اچانک اس کی نظریں کچن کی چھوٹی سی کھڑکی سے نکل کر باہر کے منظر پر جا ٹھہریں۔ اُس کی نظروں کے سامنے دور دور تک نو تعمیر شدہ اور زیرِ تعمیر مکانوں کا پھیلاؤ ہے۔ کہیں کہیں خالی پلاٹ بھی ہیں۔ اس کے اپنے گھر کے سامنے سڑک کی دوسری طرف بھی زمین کا ایک ٹکڑا ابھی مکان کے بوجھ سے آزاد ہے۔ یہ اس ساون کی بارشوں میں نہانے کے بعد ہری بھری جنگلی گھاس اور خودرو جھاڑیوں سے ڈھک گیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ موسم بدلنے کے ساتھ جب یہ جھاڑیاں اور گھاس مرجھا کر بے جان ہو گئیں تو انھیں جلا کر زمین صاف کرنے کی بے ڈھنگی کوشش کی گئی۔ جس کے نتیجے کے طور پر اب خالی پلاٹ پر جگہ جگہ سیاہ دھبے نظر آتے ہیں۔ بیچ میں کہیں کہیں آگ کی خوراک سے بچ جانے والی بدصورت خشک جھاڑیاں بھی موجود ہیں۔ اس پلاٹ کا سڑک کے قریب کا کچھ حصّہ زیادہ صاف ہے۔ اس حصے پر اسے ایک گٹھڑی سی نظر آئی جو پلاٹ کی عمومی شخصیت سے میل نہیں کھا رہی تھی۔ پھر اچانک اس گٹھڑی میں کچھ حرکت پیدا ہوئی جو اس کی توجہ کھینچنے کے لیے کافی تھی۔ یہ کوئی پانچ چھ برس کا بچہ تھا جو کھلے آسمان تلے رفع حاجت کا ناگزیر کام کر رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک اور گٹھڑی بھی ذرا بغور دیکھنے سے انسانی بچے میں تبدیل ہو گئی۔ دوسرے بچے اس سے کچھ فاصلے پر ایک اور گٹھڑی بھی ذرا بغور دیکھنے سے انسانی بچے میں تبدیل ہو گئی۔ دوسرے بچے کے نیچے کی زمین شائد کچھ زیادہ صاف نہیں تھی۔ اسے بار بار پہلو بدل کر اِکا دُکا گھاس کے شریر تنکوں سے خود کو بچانا پڑ رہا تھا۔ اسی اثناء میں پہلا بچہ اپنا کام کر کے اٹھا اور اپنے پاجامے کو اوپر چڑھاتے ہوئے ابھی گھٹنوں کے قریب لایا ہی تھا کہ اچانک رک گیا۔ اس کا چہرہ اب دوسرے بچے کی طرف مڑ چکا تھا۔ دوسرے بچے نے شائد اسے کچھ یاد دلایا تھا۔ دوسرے بچے کی بات سننے کے بعد پہلا بچہ

دونوں ہاتھوں سے اپنا پائجاما پکڑے ہوئے ایک مشکل چال چلتا ہوا سڑک پر آیا۔ پھر وہ عادت کی آسانی کے ساتھ سڑک پر اس طرح بیٹھا کہ اس کے جسم کا بوجھ اس کے دونوں ہاتھوں نے اٹھالیا اور اس نے سڑک پر، ٹھنڈی یخ سڑک پر، اپنے عضو کی غلاظت کو رگڑ کر صاف کیا۔ پھر وہ اس جگہ سے اٹھ کر ایک قدم آگے بڑھا اور اپنے حساب سے صاف جگہ پر صفائی کا یہ عمل دہرایا۔ اب اس کی طہارت مکمل ہو چکی تھی۔ اس نے اطمینان سے پائجامہ اوپر چڑھا لیا۔ کم و بیش ایک آدھ منٹ کے فرق سے دوسرے بچے نے بھی طہارت کا یہ عمل مکمل مہارت اور آسانی سے دہرایا۔ سڑک بالکل سنسان اور سرد سویرے کی ہلکی ہلکی دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ پھر وہ دونوں بچے ہر بات سے بے نیاز، اس کی مخالف سمت میں چلتے ہوئے اس سے دور ہونے لگے۔ یہ ان مزدوروں کے بچے ہیں جو زیرِ تعمیر مکانوں کے آس پاس کے خالی پلاٹوں پر، جھگیاں بنا کر رہتے ہیں۔ دن کے وقت ان جھگیوں کے مکین، مرد، عورتیں، بڑے بچے، جائے تعمیر پر مٹی، گارا اور سیمنٹ ڈھوتے رہتے ہیں۔ اور رات کو۔۔۔۔ اسے اچانک مزدور عورتوں کا خیال آیا، وہ یہ کام کب اور کہاں کرتی ہوں گی۔ گہری رات میں تو ہڈیوں کا گودا جما دینے والی ٹھنڈ ہوتی ہے! اسی بیچ اس کے خیال کا یہ سلسلہ پانی ابلنے کی آواز نے توڑ دیا۔ چائے بن چکی تو وہ چائے سے بھرے ہوئے مگ کو ایک پلیٹ سے ڈھانپ کر احتیاط سے چلتا ہوا باتھ روم تک گیا۔ اس نے مگ کو باتھ روم کی کموڈ کے برابر والی شیلف پر رکھا۔ پھر دفعتاً "اس کی حرکات و سکنات میں بلا کی تیزی آ گئی۔ وہ تقریباً" دوڑتا ہوا سیڑھیاں اتر کر نچلی منزل تک گیا، دوسرے ہی لمحے وہ اسی رفتار سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آج کا تازہ اخبار تھا۔ وہ باتھ روم میں جا کر اخبار کو چائے کے مگ کے قریب رکھ چکا تو اسے پھر کچھ خیال آیا۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا بیڈ روم میں گیا۔ اور جب وہ سگریٹ کی ڈبیا اٹھا چکا تو دیکھا کہ لائٹر غائب تھا۔ لائٹر کو وہ خود کچھ دیر پہلے کچن میں لے کر گیا تھا۔ پھر بھی وہ اس کے غائب ہونے پر جھنجھلا اٹھا۔ وہ یکساں تیز رفتاری سے کچن میں گیا اور لائٹر کے ساتھ تقریباً" بھاگتا ہوا واپس آیا۔ اور اب۔۔۔۔۔ باتھ روم میں اس کے ناگزیر طبعی کام کی انجام دہی کے

تمام ضروری لوازمات پہنچ چکے ہیں۔ وہ اطمینان سے اپنی جائے کار کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ اچانک کسی خیال کی آمد سے ایک پیچیدہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل جاتی ہے۔

☆☆

نسیم سید

چراغ آفریدم

مقیم۔ کینڈا
آبائی وطن۔ پاکستان
تصنیفات۔ جس تن لاگے۔(افسانوی مجموعہ)،

وہ ادبی جریدے جن میں افسانے شائع ہوئے۔ افکار، ارتقا، فنون، مکالمہ، اوراق، ثالث انڈیا پاکستان کے رسالوں میں کتاب۔ مطبوعہ یا زیر ترتیب آدھی گواہی۔، سمندر راستہ دے گا۔(شعری مجموعے)۔ خوش گزراں گزر گئے۔ جون ایلیا کے فن کا تنقیدی جائزہ۔ شمالی امریکہ کے مقامی باشندوں کی شاعری۔ تراجم۔۔ آنے والی کتابیں۔ شعری مجموعہ "تیلی بھر آگ" اڑان۔ شمالی امریکہ کی ایب اوریجنل شاعرات کی شاعری اور افسانوں کے تراجم مضامین "تنقیدی مضامین اور ہاں۔ زاہدہ حنا پر کام کر رہی ہوں مگر ابھی کتاب کا نام نہیں سوچا۔

.....

یہ جو میں نے ساری دھوپ، تمام بارشیں، برف کے سب طوفان اپنی ہتھیلیوں پر روک رکھے ہیں، یہ جو پھنور کے بیچوں بیچ کسی چٹان کی طرح پیر گاڑے کھڑی ہوں، سب کچھ یوں نہیں تھا۔۔۔ کتنی عجیب بات ہے کہ کبھی ایک لمحہ ہم میں سیکڑوں صدیوں جیسا لق و دق پھیل جاتا ہے، اور کبھی تمام پس انداز کئے ہوئے ماہ و سال یوں

ریت کی طرح اپنی مٹھی سے پھسل جاتے ہیں جیسے تھے ہی نہیں۔ تب کچھ ایسے ہی دن تھے میرے پائی پائی جوڑے ہوئے۔۔ پس انداز کئے ہوئے ماہ وسال اور ان کے ساتھ میں خود بھربھری ریت کی طرح مٹھی سے پھسل کے آنگن کی مٹی میں مل رہے تھے، مگر مجھے اپنے یوں مٹی میں ملنے کی ایسی کوئی پروا بھی نہیں تھی۔۔ بلکہ روزانہ گھر کی صفائی کرتے ہوئے، کونے کونے سے کوڑا نکالتے مجھے کوئی اپنی پھٹی ہوئی کترن، کوئی کٹا ہوا ٹکڑا مل جاتا تو اسے بٹور کے کونے میں دھرے ہوئے ڈبے میں ڈال آتی۔ میں نے اپنی ماں کو بھی گھر کی آرائش کرتے ہوئے اپنی کترنیں بٹور کے کوڑے کے ڈبے میں ڈالتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بھی بڑی لاپروائی سے بھربھری ریت کی طرح اپنی مٹھی سے پھسل کے مٹی میں ملتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن اچانک اس نے اپنی مٹھی کھولی اور خود کو جھاڑ دیا اپنے ہاتھوں سے۔ شام تک لوگوں نے اس کی مٹی بٹوری اور گھر کے پچھواڑے جو میدان تھا۔۔ جہاں دو دو گز کی جاگیر والے بہت سے پرانے اور نئے گڑھے تھے، ان ہی کے درمیان اس کے نام کی دو گز کی جاگیر میں اس کی مٹی دبادی اور پھر اس کی پہلی اور آخری بار اس کا نام سنگ مرمر کی تختی پر لکھ کر لگا دیا۔ اس گھر کی بڑی بوڑھیوں نے گہری سانس لے کے بڑے عجیب لہجے میں کہا تھا۔۔۔ ''چلو مٹی سوارت ہوئی۔''

میری ماں کی مٹی تو سوارت ہوئی، اب میرے اردگرد موجود بہت سی منمناتی ہوئی آوازوں میں میرے لئے ہمدردی اور پریشانی تھی۔ ''کہیں اس کی مٹی اکارت نہ جائے۔'' اس لئے ان آوازوں نے مجھے کھرچ کھرچ کر اندر اور باہر سے پاک صاف اور نیک بنایا۔

انہوں نے مجھے گھر کے رواجوں کی دھونی دی، میری سوچوں پر تاکیدوں کا ابٹن ملا اور مجھے اندر باہر سے نکھار دیا۔ انہوں نے میرے پلو کے چاروں کونوں میں سوجھ بوجھ کے شگن باندھے۔ ''لیر لیر ہو جاؤ مگر خود کو کبھی جوڑنا بٹورنا مت۔'' ''اپنی آنکھیں اور اپنے ہونٹ ہمیشہ جائے نماز والے طاق پر رکھنا۔'' ''اپنی پیشانی کو گھر کی دہلیز پر بچھا دینا۔'' ''گھر کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنی کترنیں بٹور کے کوڑے

میں اپنی آتش ہوس بجھانے کے لیے بطور کھلونا استعمال کیا جاتا ہے۔ ایکوفیمینزم کا فکری اساس اس کی مخالفت کرتا ہے۔ حقوق نسواں کے خواب کی تعبیر اس وقت تک نہیں ملے گی جب تک فطرت کو استحصالی جابر قوتوں سے آزاد نہ کرالیا جائے۔ ایکوفیمینزم کا نظریاتی فلسفہ اس وجود کی اہمیت کو قبول کرتا ہے جس کے گرد زندگی گردش کرتی ہے۔ اس طرح یہ نظریہ مراعات یافتہ ظالم طبقہ اور مظلوم طبقے کے فرق کو واضح کرتا ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی، اور صنعتی انقلابات کا پروردہ مراعات یافتہ اعلی یا متوسط طبقہ استحصالی قوت (Oppressor) کی شکل میں ابھرتا ہے، جبکہ جسمانی اور معاشی اعتبار سے کمزور، غیر ترقی یافتہ، مظلوم طبقہ مثلاً عورتیں، مزدور، مفلس افراد کے علاوہ ماحول اور جانور بھی اس استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ ایکوفیمینزم نے اس استحصالی ذہنی رویے کو Patriarchal یعنی پدرسری مانا ہے۔ روایتی پدرسری سوچ عورت کو گھر کی چار دیواری میں مقید دیکھنا چاہتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہم ایک روایتی پدرسری سوچ والے معاشرے میں رہ رہے ہیں جس کی بنیاد ہی خواتین کے استحصال پر رکھی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ سوچ کے لیے سماج کی جنسی تقسیم تمام تر جبر کی بنیاد ہے لیکن جبر کی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ جنسی تفریق اور جبر کے ساتھ ساتھ ایک قوم کا دوسری قوم پر جبر، نسلی جبر اور طبقاتی جبر بھی اس سماج میں جاری ہے۔ لہذا پروگریسو دانشور ہر جبر اور امتیازی سلوک کی ہر شکل کے خلاف لڑائی لڑتے ہیں۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ صرف سماج کے اندر بنیادی تبدیلی اور طبقاتی غلامی کے خاتمے سے ہی وہ حالات پیدا ہونگے جن میں جنسی تفریق کی ہر شکل کا خاتمہ کر کے برابری، انصاف اور آزادی پر مبنی انسانی سماج قائم کیا جاسکتا ہے۔ عورت پر جبر روز اوّل سے موجود نہیں تھا۔ دراصل جس پدرسری سماج کو آج ہم جانتے ہیں اس کا بھی شاید ہمیشہ سے وجود نہیں تھا۔ یہ ایک عارضی شکل ہے۔ تاریخ اس کی وضاحت کرتا ہے کہ جنسی تفریق کی یہ سوچ، ذاتی ملکیت اور ریاست کے ساتھ وجود میں آئی۔ یعنی عورت پر جبر سماج کی طبقاتی تقسیم جتنا پرانا ہے، لہٰذا اس کا خاتمہ طبقات کے خاتمے یعنی ایک نئے انقلابی سوچ پر منحصر ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ

کے ڈبے میں ڈال دو۔۔۔اس طرح ہمارے گھر مقدس رہتے ہیں۔'' وہ آوازیں اٹھتے بیٹھتے مجھے جتاتیں، ''تمھیں پرائے گھر جانا ہے۔'' حالانکہ مجھے پرائے گھر کی دہشت اور پریشانی اندر سے اس طرح توڑتی اور جھنجھوڑتی جیسے کسی نازک سی شاخ کو غضبناک آندھی توڑتی اور جھنجھوڑتی ہے۔مگر میں نے کسی سے کوئی سوال اس پرائے گھر کی ترکیب کی وضاحت کے حوالے سے اس لئے نہیں کیا کہ مجھے تاکید تھی کہ میں کبھی کوئی سوال نہ کروں۔میرے بچپن کا وہ پرایا گھر جہاں میں رہتی تھی اس کے ایک کونے میں کھونٹے سے بندھی، چارہ کھاتی دودھ دیتی جو گائے تھی شاید میرے گھر کو مردوں کو اس کی خصلتیں بہت پسند تھیں۔تبھی تو میں نے اپنے گھر کی تمام عورتوں اور لڑکیوں کو ہمیشہ اس گائے کی خصلتوں میں ڈھل جانے کی تگ و دو میں مشغول دیکھا لہذا اگر کبھی انکا کوئی وارث ''بالکل گائے جیسی ہے'' کہ کے کسی ایک کو تہنیت پیش کرتا تو خوشی سے اس کا چہرہ تمتما اٹھتا اور باقی سب رشک سے اس عورت کو گھنٹوں تکتیں، جسے اس اعزاز سے نوازا گیا ہو۔سو یہ بات بھی میں نے اپنے پلو سے باندھ لی کہ اپنے اپنے مالک کو خوش رکھنے کے لئے ہمارا گائے کی خصلتوں میں ڈھلنا ضروری ہے۔نہ جانے اس وقت میری عمر کیا تھی ۔۔۔۔تربیتوں کی عمر سے میں گزر چکی تھی۔۔۔شائد حیرتوں کی عمر تھی۔۔۔ایک شام نہ جانے کیوں اور کیسے ہارسنگھار کے ایک درخت نے اپنے تمام نارنجی پھول مجھ میں بکھیر دئے۔اتنا گہرا رنگ تھا ان نارنجی پھولوں کا کہ میرا مٹیالا سا رنگ نارنجی ہو گیا۔۔۔ہار سنگھار کی خوشبو مجھ میں یوں کھل کھلا کے ہنستی، میں گھبرا گھبرا کر اپنے سارے کواڑ بند کرتی جاتی۔کہیں کوئی اس ہنستی ہوئی خوشبو کو سن نہ لے۔۔میرے اندر اگی ہوئی، الجھی ہوئی جھاڑیاں نارنجی پھولوں سے ڈھک گئیں۔میری حیرتوں کی عمر کا ایک انجان سا۔۔۔ حیران سا لمحہ مجھ میں لق ودق....صدیوں جیسا پھیل گیا۔میں ہر صبح اس کے سنہری اجالوں میں طلوع ہوتی اور ہر شام اس کی نارنجی سرخی میں غروب ہو جاتی۔اس حیران کن سرخوشی کے باوجود مجھے اپنے پلو کے کونوں میں بندھی تمام تاکیدیں یاد تھیں۔مجھے معلوم تھا کہ اگر میرے گھر کی دیواریں اس خوشبو کی سن گن بھی پا گئیں تو میری سانسیں اینٹوں کے بیچ رکھ

کے انھیں پیس دینگی ۔۔۔ مجھے ان سے بہت خوف آتا تھا۔ اگر وہ خفا ہو جائیں تو ہمارا زندہ بدن ۔۔۔ کروٹ بدلتی سوچیں۔ سانس لیتی آنکھیں ۔۔۔ سب اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں ۔۔ اور ہمارے پاس ہمارا کچھ نہیں بچتا۔ اسی لئے میں نے اس خوشبو کو تہ بہ تہ اپنی ایک سانس لیتی ہوئی کترن میں لپیٹا اور اپنے اندر کی اندھیری کوٹھری میں رکھ کے خود پر تالا ڈال دیا۔ پھر مجھے اس پرائے گھر بھیج دیا گیا، جس کی بات بات پر بچپن سے حوالے دئے جاتے تھے۔ اب ایک دوسرا نام میرے نام کا وارث ٹھہرا۔ اور ایک اور پرایا گھر میرا ٹھکانا قرار پایا۔ میرا قد اچانک ان عورتوں میں بہت اونچا ہو گیا جو میری مقدس کتاب کی منکوحہ تھیں ۔۔۔ وہ ایسی بدنصیب تھیں کہ گائے جیسی تمام خصلتیں رکھنے کے باوجود ان کا اپنا کوئی کھونٹا نہیں تھا ۔۔۔ مگر میرا اب اپنا ایک کھونٹا تھا۔ جب شادی بیاہ کی رسوم ہوتیں تو وہ سر جھکا کر کے اس جگہ سے دور ہٹ جاتیں کہ کہیں ان کا سایہ کسی شگن پر نہ پڑ جائے۔ ان بدشگن عورتوں کے درمیان اب میں سر اونچا کر کے نیک شگن والی مسند پر پیر دھر سکتی تھی۔ ایک احساس ممنونیت تھا اور میں ۔۔۔ سو میں نے اپنی تمام سانسیں منتوں کے دھاگے کی طرح اس کھونٹے سے لپیٹ دیں۔ اپنی آنکھیں اور اپنے ہونٹ جائے نماز والے طاق پر چڑھا دئے ۔۔۔ اور اپنی پیشانی گھر کی دہلیز پر بچھا دی۔ دن بھر سب اپنے کیچڑ بھرے جوتوں سے میری پیشانی پر چلتے پھرتے، آتے جاتے اور میں ان قدموں کی ممنون اپنی بے وقعتی میں باوقار گھر کو سجانے بنانے میں مصروف رہتی۔

شاید میرے ہونٹ بین کرتے ہوں ۔۔۔ شاید میری آنکھیں روتی ہوں، جب کیچڑ بھرے جوتے میری پیشانی کو روندتے ہوں لیکن ان کی آواز مجھ تک نہیں آتی تھی یا شاید میری آنکھیں سوکھے آنسو روتی ہوں ۔۔۔ شاید میرے ہونٹ سارے بین، سب مناجاتیں، سب دریا، سارے سمندر اپنے صحرا میں جذب کر لیتے ہوں ۔۔۔ پتہ نہیں کیونکہ میرا ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا اس لئے ٹھیک سے پتہ نہیں۔

حالانکہ مجھ میں رواجوں اور دستوروں کو سمجھنے کی بڑی سوجھ بوجھ ہے۔ بالکل اسی پانی کی طرح جو کٹورے میں کٹورے جیسا ڈھل جاتا ہے اور گلاس میں اس کے قد و

قامت میں ڈوب جاتا ہے۔مگر اس سوجھ بوجھ کے باوجود میرے اندر اس نئے پرائے گھر کا ایک دستور اتنا عجیب تھا کہ اس نے مجھے اندر باہر سے واقعی لیر لیر کر دیا۔اس دستور کے سبب مجھے لگتا جیسے میں اس کھونٹے سے بندھی ایک باوقار عورت نہیں بلکہ کوٹھے پر بیٹھی کوئی بے قیمت عورت ہوں۔ہوتا یہ تھا کہ آنگن میں سویرے سویرے غیریت اور اجنبیت کی تیز دھوپ اتر آتی اور پھر وہ میرے گھر کے اور میرے کونے کونے میں پھیل جاتی۔اس تیز دھوپ کی لپٹیں میرے بدن پر چھالے ڈالتیں، میرے وجود کو جگہ جگہ سے داغتیں، میرے وقار کی تمام تہوں میں چنگاریاں بچھاتیں۔مگر رات اسی جلے ہوئے چھالوں والے بدن کو نرم گدوں والی مسہری پر اچھال دیتی اور پھر اسی بدن سے کھل کھلا کر ہنسنے کی فرمائش کرتی۔میں غیریت اور اپنائیت کی چکی کے دو پاٹوں میں پس کے گو ریزہ ریزہ ہوگئی تھی مگر پھر بھی بڑی عقیدت سے خود کو مسہری پر بچھا دیتی۔دن اور رات کے اس قدر مختلف سلوک سے کبھی،...کبھی۔۔۔نہیں!! کبھی کبھی نہیں بلکہ ہر رات۔۔۔ میرا دل چاہتا کہ میں بھی بالکل اچانک۔۔اپنی مٹھی کھولوں اور خود کو جھاڑ دوں اپنے ہاتھوں سے۔۔۔شاید ایسا ہی ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا۔نہ جانے اس وقت میری عمر کیا تھی ۔۔۔شاید بارشوں کی عمر تھی۔ساون کی بارشیں ہو رہی تھیں مجھ میں۔یہ موسلا دھار بارشیں ۔۔۔اندر کے سب خس وخاشاک بہائے لئے جا رہی تھیں۔ان ہی بارشوں کی ایک لہر تھی جو میرے لہو میں میرا نیا جنم تحریر کر رہی تھی۔ایک بوند تھی جو مجھ میں نئے اعلان لکھ رہی تھی ان بارشوں میں سب کچھ دھل گیا اور میرے اندر دور دور تک نور کی ہریالی پھیل گئی۔میری انگلیاں سوچوں کے گلابی اون سے سارا سارا دن خواب بنتیں۔میری سانسیں دھڑکنوں میں دھڑکتی ہوئی ایک مدھم سی دھڑکن کی تال پر محو رقص رہتیں۔یہ عجب سرور تھا۔۔عجب نشہ تھا۔۔عجب احساس تھا جو مجھے مجھ میں نئے انداز سینچ رہا تھا، گھنا اونچا اور سرسبز کر رہا تھا۔۔۔بہت سے دن اسی سرشاری میں گزر گئے اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔لیکن جس رات میرے اندر میرا اکھوا پھوٹا، جس رات میں نے دوبارہ جنم لیا، اس رات میرے گھر کی تمام آوازوں کو صدمے سے سانپ سونگھ گیا۔میرے گھر پر چھائی ہوئی گہری نا امیدی کے

سناٹے میں سرگوشیاں مکھیوں کی طرح بھنک رہی تھیں۔ ''پتھر جنا ہے نامراد نے۔لڑکی ہے۔''
یہ سرگوشیاں نہیں تھیں، بلکہ سازشوں کے یہی وہ پتھر تھے جو ہمیں سنگسار کرتے آرہے ہیں۔۔ایک جنم سے۔میں ان پتھروں کے جادو اور ان کی قوت سے واقف ہوں۔یہ سانس لیتے ہیں۔یہ گھر کی دیواروں پر اپنے فرمان کا سیسہ چڑھا کے جگہ جگہ ان میں زنجیریں ٹانگ دیتے ہیں۔یہ جیتے جاگتے بدن کو چھوتے ہی پتھر میں تبدیل کر دیتے ہیں۔نہ جانے مجھ میں اس وقت اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ میں نے ان پتھروں کو ہتھیلی پر روک لیا ان ہونٹوں پر کھینچ مارا جنہوں نے ابھی سرگوشی کی تھی۔''پتھر جنا ہے''
میری کوکھ پر اترنے والی وحی جھولے میں کلام کر رہی تھی۔۔۔میں نے عقیدت سے اس کے ہونٹوں اور اس کی پیشانی کو چوما اور ایک جھٹکے سے اس مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی جس پر اپنا چھالوں بھرا بدن روز بچھاتی تھی۔مجال ہے دوسرے جنم میں مجھے کوئی لیر لیر کرے۔'' میں نے جھولے میں کلام کرتے ہوئے ننھے سے بدن کو سینے سے لگا کر اس کے گرد اپنے بازوؤں کی سلاخوں کا حصار کھینچا۔۔۔دہلیز پر بچھی ہوئی پیشانی کو گھسیٹ کے اس ننھے سے بدن کے ماتھے سے چھلا کے اس دہلیز پر واپس اچھال دیا۔۔۔اپنی آنکھیں اور ہونٹ طاق سے اٹھا کے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کا صدقہ اتارا اور پھر اپنی انگلیوں سے مسل کے وہ تالا توڑ دیا جو حیرتوں کی عمر میں میں نے خود پر ڈالا تھا۔۔۔میری وہ سانس لیتی ہوئی کترن جو نارنجی خوشبو میں لپٹی مجھ میں قید پڑی تھی آزاد ہوتے ہی ایک کترن سے علم کے پھریرے میں تبدیل ہوگئی۔۔۔میں نے اپنے پاؤں اس بھنور میں گاڑ دئے جو میرے نئے جنم کو خود میں لپیٹ لے جانے کو بے تاب تھے۔میں ایک ٹھیکری سے کوہسار میں بدل گئی۔اور اب ان آوازوں کے سامنے پورے قد سے کھڑی ہوں،جنہوں نے سرگوشی کی تھی، سازشوں والی سرگوشی۔۔۔'' پتھر جنا ہے۔'' میں نے ساری سیلابی بارشیں۔۔۔۔برف کے سب طوفان اپنی ہتھیلی پر روک رکھے ہیں۔۔۔۔میں بھنور کے بیچوں بیچ پیر گاڑے کھڑی ہوں۔''مجال ہے میرے دوسرے جنم کو کوئی لیر لیر کرے۔''

عذرا نقوی

بوگن ویلیا کی اوٹ سے

نام۔ عذرا نقوی
مقیم۔ دہلی انڈیا
تصنیفات۔ آنگن جب پردیس ہوا۔ (افسانوی مجموعہ)
دل کے موسم۔ (شعری مجموعہ)
کئی تراجم کی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں، جہاں بنالیں اپنا نشیمن (مظامین اور کالم) زیر طبع۔

.....

شکر ہے کل رات بھر لائیٹ غائیب نہیں ہوئی۔ پنکھا چلتا رہا تو مچھروں سے نجات ملی۔ مدت بعد پوری رات سونا نصیب ہوا تھا، ورنہ ہر رات وہی مسئلہ تھا، ایک تو لائیٹ غائب، مچھروں کی یلغار اور پھر آس پڑوس کے جنریٹر اپنی خوفناک آواز کے ساتھ چالو ہو جاتے ہیں۔ ہمارے پڑوس والے گھر میں شاید جنریٹر بالکل ہمارے آنگن کی دیوار کے پاس لگا ہوا ہے۔ آواز کے ساتھ ساتھ اس کا دھواں بھی ہمارے نصیب میں ہے۔

بہر حال! آج صبح بہت پیاری لگ رہی تھی۔ پوری رات کی نیند بھی کیا نعمت ہے۔ لیکن آج صبح مجھ سے اک غلطی ہوگئی۔ میں نے بے دھیانی میں اپنے کمرے کی باغیچے کے رخ والی کھڑکی کھول دی۔ وہ اپنا منحوس وجود لئے بیگ صاحب کے مکان کے

سامنے اپنی پوری سفاکی سے موجود تھا۔

لاحول ولاقوۃ! میں نے جلدی سے کھڑکی بند کردی اور مسہری کے سرہانے تکیئے سے ٹیک لگا کر سامنے دیوار پر لگی خوبصورت لینڈ اسکیپ کی پینٹنگ پر نظریں جمادیں۔ یہ پینٹنگ میں نے وہاں جان باجھ کر لگائی تھی تاکہ صبح جب آنکھ کھلے تو سب سے پہلے اس خوبصورت منظر پر نظر پڑے۔ خزاں کے موسم کی عکاسی کرتی یہ بہت خوبصورت پینٹنگ تھی جس میں چنار کے درخت نارنجی اور سرخ پتوں سے بوجھل گم سم کھڑے تھے اور نیچے ایک پہاڑی نالہ خاموشی سے بہ رہا تھا۔ میں اس منظر میں گم ہوجانا چاہتا تھا جو یوں تو میری دسترس سے باہر تھا لیکن اس دنیا میں کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہوگا، کم سے کم میری نظروں کے سامنے اور میرے تخیل میں تو اس لمحے موجود ہے... لیکن موجود تو کوڑے کا وہ ڈھیر بھی ہے جو بند کھڑکی سے گزر کر میرے اور اس حسین پینٹنگ کے درمیان حائل ہوگیا ہے، وہ کوڑے کا اونچا ڈھیر عین میرے بیڈروم کی کھڑکی کے سامنے ہے۔

مجھے کھڑکی پر غصہ آنے لگا۔ کیا اس کھڑکی کا اس رخ پر کھلنا ضروری تھا۔

مجھے یاد ہے میرے ابو نے مکان میں اوپر کی منزل پر یہ کمرہ خاص طور پر اپنے لئے بنوایا تھا تاکہ وہ سکون سے پڑھ لکھ سکیں۔ اک سادہ سا ہوادار کمرہ جس میں چاروں طرف کھڑکیاں تھیں۔ پہلے مکان کے اطراف دور دور تک خالی میدان تھا، پچھواڑے کی کھڑکی سے دور بنی 'نیاز منزل' آم کے باغ میں سے جھانکتی تھی۔ کچی سنسان سڑک کے آخر میں جج بشیر کی کوٹھی اور اس سے ذرا فاصلے پر تھی 'امیر منزل'۔ درختوں میں چھپی یہ کوٹھیاں کسی واٹر کلر پینٹنگ کا دھندلا سا منظر معلوم ہوتی تھیں... مجھے یاد ہے کہ ابو کے پڑھنے کی میز عین اسی کھڑکی کے نیچے ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ کھڑکیاں کھول کر سوتے تھے، بند کمروں سے ابو کو وحشت ہوتی تھی۔ چند برس پہلے تک میرا بھی یہی حال تھا، جب تک یہ بھیانک کوڑے کا ڈھیر میرے گھر کے سامنے نمودار نہیں ہوا تھا۔ ہمارے گھر کے اطراف نئے مکانوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر رک نہیں پایا۔ دیکھتے دیکھتے خالی میدان مکانوں سے بھر گیا.. مجھے پھر غصہ آنے لگا، آخر بیگ صاحب کو یہاں مکان بنوانے کی ضرورت ہی

کیا تھی۔ رہتے تو ہیں نہیں کبھی اس مکان میں ... گورنمنٹ کی نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد سب مسلمانوں کو علیگڑھ آنے کی ہی کیا سوجھتی ہے۔۔۔ مکان مکمل ہونے سے پہلے ہی ان کی بیوی چل بسیں لہذا بیگ صاحب بمشکل چند مہینے یہاں رہے ورنہ کبھی مہینوں کے لئے بیٹے کے پاس چلے جاتے ہیں یا بیٹی سے ملنے روانہ ہو جاتے ہیں۔۔۔ ایک تو نہ جانے کیسا بے ہنگم مکان بنوایا ہے، ایک مستطیل ڈبہ جیسا مکان جس کے سامنے ایک تکونہ زمیں کا ٹکڑا دیوار سے گھیر دیا گیا ہے۔ شائد یہ تکونہ لان بنوانے کا ارادہ ہو۔ اس تکونے بے تکے لان میں ایک لوہے کا پھاٹک بھی ہے۔ جس میں ہمیشہ اک موٹا سا زنگ آلود تالا پڑا رہتا ہے۔ جب کبھی بیگ صاحب گھر میں مقیم ہوتے ہیں تو آمد رفت صحن کے پچھلے دروازے سے ہوتی ہے۔ ویسے بھی ان کے یہاں آتا جاتا ہی کون ہے۔ اب ہمارا محلّہ سرسید نگر کہلاتا ہے۔ ہر خالی پلاٹ پر مکان بن چکے ہیں اور جب گھروں کا کوڑا پھینکنے کے لئے کوئی جگہ نہیں بچی تو بیگ صاحب کا تکونہ لان دھیرے دھیرے اجتماعی کوڑے دان بنتا گیا۔ بیگ صاحب کی غیر موجودگی محلے والوں کے لئے نعمت ثابت ہوئی۔ پچھلے سال وہ چند ہفتوں کے لئے بیٹے کے پاس سے آئے تھے تو اپنے گھر کے سامنے کوڑے کا یہ ڈھیر دیکھ کر خوب واویلا مچائی۔ محلے کے معتبر لوگوں سے ملے، مگر ان کی سنتا کون ہے، اکیلے ضعیف آدمی جو ٹھیرے۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا، ارے پروفیسر ثاقب تم سمجھتے کیا ہو خود کو۔۔۔ لوگوں نے آپ سے میونسپل کمیٹی کا الیکشن لڑنے کے لئے کہا تو آپ غصہ ہو گئے۔

''میں اب ان لونڈوں لپاڑوں کے مقابلے الیکشن لڑوں۔ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوگا.... ثاقب صاحب کا نشان 'سائیکل' ہے۔ سائیکل کو کامیاب بنائیے۔ اور اگر بفرض محال میں الیکشن جیت بھی گیا تو وہاں میونسپل کمیٹی میں بنیے اور ٹھیکیداروں کے ساتھ سر کھپاؤنگا.... لاحول ولاقوۃ۔''

ٹھیک ہے پروفیسر صاحب... میں نے خود سے کہا، تو اب مارئے جھک بند کھڑکی کے پیچھے یا یونیورسٹی میں ان لڑکے لڑکیوں کو اردو ادب پڑھائیے جنہیں کم نمبروں

کی وجہ سے کسی اور مضمون میں ایم اے کرنے کے لئے داخلہ نہیں مل سکا۔ آپ کو کیا غرض اپنے اطراف پھیلے کوڑے کی ڈھیریوں سے، کھلی ہوئی نالیوں سے، آپ تو انٹیلیکچوئل ہیں۔

میں خود سے الجھتا ہوا نیچے اتر آیا۔ برآمدے میں چائے کی ٹرے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میری پسندیدہ گرین لیبل چائے کی خوشبو، میری مخصوص نازک چینی کی پیالیاں، امی کے ہاتھ کی کڑھی ہوئی ٹی کوزی، یہ مانوس چیزیں دیکھ کر میرے دل کو ذرا قرار آ گیا۔ میں اپنی چائے کی پیالی اور اخبار لے کر لان میں نکل آیا۔ آج اتوار کا دن تھا، سڑک پر ٹریفک کی آواز بھی کم تھی۔ ستمبر کی یہ صبح کافی پرسکون لگ رہی تھی... کیاریوں میں لگے پھول، ہموار گھاس، دیوار پر چڑھی بوگن ویلیا کی بیلیں، یہ تو میری دسترس میں ہیں... پچھلے کئی برسوں سے میں اپنا زیادہ تر وقت اسی لان کی دیکھ بھال میں صرف کرتا ہوں۔ ایک پارٹ ٹائیم مالی بھی آتا ہے۔ صبح شام میں اسی لان میں ٹہلتا ہوں۔ گھر کے باہر ٹہلنے کی اب کوئی جگہ بھی تو نہیں ہے۔ جاؤں تو جاؤں کہاں۔ مجھے ابو کی یاد آنے لگے۔ وہ بتاتے تھے سستے زمانے میں انہوں نے تین ہزار گز زمین لے کر ڈال لی تھی۔ جب یہ جگہ بالکل ویرانہ تھی۔ یونیورسٹی کے اطراف میں آبادی تھی ہی نہیں۔ اسی لئے یہ زمین ڈیڑھ روپے گز مل گئی تھی۔ ابو کے وسائل محدود تھے، یونیورسٹی کے استاد کو تنخواہ ہی کتنی ملتی تھی اس زمانے میں۔ زمین تو ابو نے خرید لی تھی لیکن مکان بنانے کے لئے یونیورسٹی سے قرض لینا پڑا تھا۔۔۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا، ہوادار، سادہ سا مکان بنایا تھا۔ سامنے کی خالی زمین پر ابو نے گل مہر، نیم، املتاس وغیرہ کے درخت لگا دئے تھے۔ اب یہ پورے معتبر درخت ہو گئے ہیں۔ اور اب میرے سر کے آدھے سے زیادہ بال بھی تو سفید ہو گئے ہیں... میں نے خالی زمین کے ایک چھوٹے سے حصے کو مہندی کی باڑھ لگا کر ایک لان کا روپ دے دیا تھا۔ باقی حصہ یوں ہی پڑا رہتا تھا۔ نیم، املتاس، اور گل مہر کے درختوں کے نیچے محلے کے بچے آ کر کھیل لیا کرتے ہیں۔ تین ہزار گز زمین کے اطراف چہار دیواری بنوانا میرے مالی وسائل میں ممکن نہیں تھا اس لئے میں نے لوہے کے کانٹے دار تاروں کی باڑھ لگوا دی تھی اور ایک چھوٹا سا لکڑی کا پھاٹک بھی لگوا دیا تھا جو میرے اور

باہر کی دنیا کے درمیان حد بندی کرتا تھا۔ محلے کے بچوں نے کانٹے دار تاروں کو موڑ کر اپنے آنے جانے کا راستہ خود بنا لیا تھا میں ان بچوں کے مداخلت کو نظر انداز کر دیتا ہوں... آخر یہ بچے اب کھیلیں تو کہاں کھیلیں۔۔ میری بیگم اکثر غصہ ہو جاتی ہیں کہ کیا مصیبت ہے، ہمارا ہی گھر رہ گیا ہے چوپال بننے کے لئے۔ مجھے یاد ہے!۔۔۔ بچپن میں ہم لوگ دن کا زیادہ حصہ گھر کے باہر ہی گزارا کرتے تھے۔ گلی ڈنڈا، کرکٹ، پتنگ بازی، درختوں پر چڑھنا، چاندنی راتوں میں آنکھ مچولی، کیا کیا نہیں ہوتا تھا، ہمارے بچپن میں تھوڑی تھوڑی دور پر اکا دکا کوٹھیاں بننا شروع ہوگئی تھیں۔ سڑک تب بھی کچی ہی تھی۔ خوب دھول اڑا کرتی تھی، درختوں کے نیچے باجی ہنڈکلیا پکاتی تھیں۔ میری بیٹی تو شاید جانتی بھی نہیں کہ ہنڈکلیا کیا ہوتی ہے، اس کا زیادہ تر وقت تو انٹرنٹ اور ٹی وی کے سامنے گزرتا ہے۔ مجھے بے اختیار باجی کی یاد آنے لگی۔۔۔ تین سال ہو گئے ان سے ملے ہوئے۔ پچھلی بار جب وہ چھ سال بعد امریکہ سے آئی تھیں تو انہیں اپنے شہر کا بدلہ ہوا نقشہ دیکھ کر کیسا شاک لگا تھا۔ مکان ہی مکان آبادی ہی آبادی۔ ہر طرف شاپنگ سینٹر، نالیاں، کیچڑ۔ وہ امیر منزل کے سامنے لگے پرانے پیپل کے درخت کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ جس کے نیچے سے گزرتے ہوئے بچپن میں وہ ڈرا کرتی تھیں کیونکہ سنتے تھے پیپل پر چڑیل اور پچھل پیریاں رہتی ہیں۔ باجی امیر منزل والے نواب صاحب کی پوتی کے ساتھ کھیلنے جاتی تھیں جو ان کی ہم جماعت تھی۔

آج کتنے دن بعد امیر منزل والے نواب صاحب یاد آ گئے۔ ان کی پر رعب شکل، وضع قطع، گرجدار آواز، بڑی بڑی مونچھیں اور ان کے پورٹیکو میں کھڑی پرانی فورڈ جو کبھی چلتی نہیں تھی، ان کے گول ڈرائینگ روم میں سجی تلواریں، قالین اور شیر کا سر ہمارے لئے افسانوی چیزیں تھیں۔ نواب صاحب کا پوتا جب چھٹیوں میں دہرہ دون کے اسکول سے آتا تھا تو ہم لوگ اس کے ساتھ کاؤ بوائے کا کھیل کھیلتے تھے۔ وہ بھی سنا ہے اب امریکہ میں آباد ہے۔ ہاں... تو جب باجی پچھلی بار امریکہ سے آئی تھیں تو پوچھ رہی تھیں۔

''بھیا مکانوں اور دکانوں کے اس جنگل میں وہ گھنا پیپل کا پیڑ نظر نہیں آتا جو امیر منزل کے گیٹ کے پاس تھا۔'' ''اوہ ہو تم پیپل کا پیڑ ڈھونڈھ رہی ہو باجی'' میں نے آہستہ سے کہا.... ''امیر منزل ہی اب کہاں ہے۔'' ''امیر منزل کہاں گئی۔''

میں نے سامنے لگے بورڈ کی طرف اشارہ کیا تھا جس پر 'امیر منزل بلڈنگ کامپلیکس' کا بورڈ لگا ہوا تھا اور نیچے زیر تعمیر فلیٹوں کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ امیر منزل ختم ہو چکی تھی۔ فلیٹوں کی بنیادیں کھد چکی تھیں اور چاروں طرف لوہے کے سریے، اینٹیں اور مزدوروں کی جھگیاں بکھری ہوئی تھیں۔ سیکڑوں کی تعداد میں بہاری مزدور آ کر ہمارے شہر میں بس گئے ہیں۔

باجی کے چہرے کی وحشت مجھے آج تک یاد ہے۔ میں باجی کو کیا بتاتا کہ پورے تین مہینے یونیورسٹی آتے جاتے میں نے امیر منزل کو کیسے آہستہ آہستہ معدوم ہوتے دیکھا ہے۔ آخیر میں ڈرائینگ روم والا پتھر کا آتشدان توڑنے میں سنا ہے مزدوروں کو بہت مشکل ہوئی تھی۔ وہی آتش دان جس کے اوپر لگا شیر کا سر دیکھ کر ہم بچپن میں ڈر جاتے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ پچھلے ہفتے باجی کا خط آیا ہے امریکہ سے کہ وہ اس سال دسمبر میں ہندوستان آئیں گی۔ اور اس بار عین ہمارے گھر کے سامنے یہ تکونا، بے ہودہ کوڑے دان ان کا استقبال کرے گا۔ بلا ارادہ میری نظریں سڑک کی طرف اٹھ گئیں۔ سڑک کے پار کوڑے کا ڈھیر اب جاگ گیا ہوگا۔ میں نے اپنے گھر اور سڑک کے درمیان بوگن ویلیاں کی بیلیں ایک لوہے کے جنگلے پر چڑھا کر پھولوں کی ایک دیوار سی بنا دی تھی تا کہ صبح شام ٹہلتے وقت اس دیوار کے پیچھے جو بھی ہو رہا ہو وہ میری نظروں سے اوجھل رہے۔ بیل میں گہرے عنابی پھول شبنم میں ڈوبے ابھی جاگ ہی رہے تھے۔ اف وہ کوڑے کا ڈھیر بھی اب جاگ گیا ہوگا۔ جھگیوں میں رہنے والے مزدوروں کے بچے اس ڈھیر پر سے پلاسٹک کی تھیلیاں چن رہے ہونگے.... مجھے خیال آیا۔ مجھے اس خیال نے پھر ایک بار بے چین کر دیا.... یہ بدتمیز، اڑیل، بدوضع پلاسٹک کی تھیلیاں ہر جگہ موجود ہیں، آج کل دکانوں میں، سڑکوں پر، گھروں میں ہر جگہ موجود ہیں یہ۔۔ میں دکاندار سے

جیسے ہی کوئی انقلابی سوچ اقتدار پر قابض ہوگا تو عورت پر جبر خود بخود ختم ہو جائے گا۔ در حقیقت جب مرد اور عورت کے درمیان حقیقی انسانی رشتے کے قیام کے لیے سماجی حالات پیدا ہونگے تب ہی طبقاتی اور جنسی بربریت کی نفسیاتی باقیات پر قابو پایا جا سکے گا۔ جب تک انقلابی نئی سوچ پدرسری سوچ کو اُکھاڑ کر ایک صحت مند غیر طبقاتی سماج کے حصول کے لیے حالات پیدا نہیں کرتی تب تک عورت کی حقیقی آزادی ممکن نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ خواتین اپنے مسائل کے حل کے لیے اس طرح کے انقلاب کا صرف انتظار کرتی رہیں اور اس دوران امتیازی سلوک، ذلت اور مردانہ جبر کو برداشت کرتی رہیں۔ اس کے برعکس انھیں موجودہ سماج میں آگے بڑھنے کے لیے روزمرہ جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس جدوجہد کے بغیر سماجی انقلاب کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ فکری اصلاحات کے لیے جدوجہد لازمی شرط ہے۔ جدوجہد کے ذریعے ہی سماج بحیثیت مجموعی سیکھتا، اپنے شعور کو آگے بڑھاتا، اپنی طاقت کا احساس کراتا اور عظیم تاریخی فرائض سے آشنا ہوتا ہے۔ خواتین کے حقوق کی بازیابی کے لیے جدوجہد کرنے سے ہی بہت ساری خواتین سماجی تبدیلی کی ضرورت سے آشنا ہوتی ہیں۔ انھیں پدرسری سماج میں عورت کے ساتھ بربریت پر مبنی ناانصافی کا شدید احساس متحرک کرتا ہے۔ اس طرح ایک ایسے پدرسری سماج کی اصلیت واضح ہوتی ہے جو منافقانہ طور پر جمہوریت اور انصاف کے راگ تو الاپتا ہے لیکن عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک برتتا ہے۔ اور آدھی سے زیادہ انسانیت کو ذلت آمیز، غیر مساوی، امتیازی سلوک اور ہر طرح کے جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عورتوں کے ایسے بہت سے مطالبات ہیں جن کے لیے انھیں ابھی جدوجہد کرنی ہے۔ مثلاً کام کی جگہ اور سماج میں ہر طرح کے امتیازی سلوک کو غیر قانونی قرار دینا، ایک جیسے کام کے لیے تنخواہ میں تفریق، اسقاط حمل اور طلاق کا حق، الگ والدین (Single Parents) سے امتیازی سلوک کا خاتمہ، مردانہ تشدد سے عورت کا تحفظ، جنسی آزار، زیادتی اور گھریلو تشدد کے خلاف اقدامات، ہر کسی کے لیے گھر اور ملازمت کا حق، اطفال کی نگہداشت کے لئے اعلی معیار کی سہولتوں کی مفت

الجھ پڑتا ہوں کہ کیوں اتنی زیادہ پولیتھن کی تھیلیاں برباد کرتے ہو۔ میری بیگم کہتی ہیں کہ میں جھکی ہو گیا ہوں، وہ کہتی ہیں کہا گر میرا بس چلے تو میں ان کے ہاتھ میں گنوارو، پرانے فیشن کا کپڑے کا تھیلا دے کر شاپنگ کرنے بھیج دوں... ہاں اگر میرا بس چلے تو...وہ کہتی ہیں کہ آپ نے کیا ٹھیکہ لے رکھا ہے ہر مسئلے کا...ٹھیک ہی تو کہتی ہیں بیگم۔ میرے پھاٹک کے سامنے اک نئی لال رنگ کی ماروتی زین کار آ کر رک گئی اور اس میں سے ٹھیکے دار سمیع اللہ صاحب اور ان کے ساتھ ایک صاحب سفید چمکیلے سوٹ میں ملبوس اترے۔

''اسلام علیکم ڈاکٹر صاحب''۔۔سمیع اللہ نے دور سے آواز لگائی۔

''چہل قدمی ہو رہی ہے باغیچے میں، بہت ٹھیک ٹھاک جگہ بنائی ہے آپنے۔'' انہوں نے قریب آ کر کہا۔

میرے لان کی تعریف 'ٹھیک ٹھاک' کہ کر ٹھیکے دار سمیع ہی کر سکتے ہیں۔ میں نے سوچا۔

''آپ سے ملئے آپ ہیں عبدالباری صاحب۔'' سمیع اللہ نے دوسرے حضرت کا تعارف کرایا۔ برسوں سے دبئی میں ہیں۔ یہاں آ کر سیٹل ہونے کا ارادہ ہے...بڑی پارٹی ہیں۔''

عبدالباری نے انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ میں نے اندر چل کر بیٹھنے کے لئے کہا تو وہ بولے۔''یہیں باہر بیٹھتے ہیں اچھی جگہ ہے۔''''شکریہ۔''میں خوش ہو گیا۔۔۔۔ یہ دیکھئے میں نے گلاب کی ایک خاص ورائٹی منگوا کر لگائی ہے۔ ''باغبانی اور باغیچہ ہی اب میری زندگی ہے۔''میں نے کہا۔

عبدالباری صاحب نے لان میں پڑی بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''صاحب یہی تو بات ہے۔آپ تو سمجھئے سونے کی کان پر بیٹے ہیں۔''

میں اس جملے کے کاروباری پن میں ہی الجھا ہوا تھا اور وہ کہے جا رہے تھے۔

''آجکل آپ کے علاقے میں زمین تو سونے کے بھاؤ ہے یہی زمانہ ہے لوگ اپنی قسمتیں بنا رہے ہیں۔''''کس کی؟''میں چپ نہ رہ سکا''اپنی قسمت یا زمین کی قسمت۔''

''ہاہاہا...'' قہقہہ لگاتے ہوئے باری صاحب بولے۔''خوب آپ ادبی لوگ بھی بات کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب'' سمیع اللہ ذرا سرگوشی کے لہجے میں جھک کر بولے۔

'' آپ تو سمجھئے لکھ پتی ہیں۔اس علاقے میں جس کے پاس زمین ہے، وہ تو سونے کی کان پر بیٹھا ہوا ہے۔اتنی بہت سی فالتو زمین پڑی ہے، آپ کے گھر کے اطراف۔عبدالباری صاحب مارکیٹ سے زیادہ دام دینے کو تیار ہیں کیونکہ موقع کی زمین ہے۔''

مجھے یقین سا نہیں آیا سمیع اللہ یوں بے دھڑک سودے کی بات کر ڈالینگے۔میں نے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نارمل آواز میں پوچھا۔''گویا آپ میرا گھر خریدنے آئے ہیں۔باری صاحب فوراً بولے۔۔۔''ہاں اگر زمین کے ساتھ اپنا مکان بھی فروخت کرنا چاہیں تو واہ واہ۔۔ بلکہ یہی بہتر ہوگا، میں اس کے بدلے بلڈنگ کامپلیکس میں آپ کو بہترین فلیٹ دونگا۔۔۔آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔''

''تشریف لے جایئے''۔۔غصے کے مارے میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔''آپ دونوں کی ہمت کیسے ہوئی میرے گھر کے دام لگانے کی۔''

عبدالباری صاحب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔''صاحب ہم تو آپ کے بھلے کی بات کر رہے تھے۔مارکٹ سے ڈبل پیسے دے دینگے۔''سمیع اللہ نے عبدالباری کا ہاتھ پکڑا اور کار کی طرف چل پڑے عبدالباری کی آواز میرے کانوں میں آئی۔''یہی تو وجہ ہے ہماری قوم ترقی نہیں کرتی۔''''اجی چھوڑیئے۔۔''یہ ٹھیکے دار سمیع کی آواز تھی۔

''دبائے بیٹھے رہیں اپنی زمین ڈاکٹر صاحب۔سامنے والا تکونا کوڑے دان تو اب بھر چکا ہے اور شاید بیگ صاحب نے یہ جگہ بیچ بھی دی ہے۔کوڑے دان کے لئے اب ڈاکٹر صاحب کے ہی احاطے کی باری ہے اور کوئی خالی جگہ تو بچی نہیں آس پاس۔''

☆☆

نگار عظیم

ایکوریم

آبائی وطن۔ مراد آباد
مقیم۔ دہلی
وہ رسائل و جرائد جس میں افسانے شائع ہوئے۔ آجکل، ایوان اردو، اوراق، شاعر، نیا ورق، استعارہ، پہچان، صدا۔
تصنیفات۔ ا۔ عکس، ۲۔ گہن، ۳۔ عمارت، (افسانوی مجموعہ)
منٹو کا سرمائیہ فکر و فن۔ (تنقید)، بہادر شاہ ظفر۔ (حیات اور شاعری)، مونوگراف اور گرد آوارگی (سفرنامے)، شعری مجموعہ اور تنقیدی مضامین زیر ترتیب۔

.....

پہلی مرتبہ اس سکھ سے آشنا ہوئی تو سرشار ہوگئی۔ پیار، محبت، دلجوئی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ... جو ہم نے پچیس برسوں میں اسے دیا تھا شاید وہ پچیس دن میں ہی لوٹا دینا چاہتا تھا۔ ممکن ہے یہ پچھلے چھ ماہ کی جدائی کا اثر ہو۔

دراصل بیٹے کو ایک اچھی فرم میں ملازمت ملی تو اسے دہلی چھوڑ کر بمبئی شفٹ ہونا پڑا۔ اس کی جدائی سے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے جسم کا کوئی حصہ کٹ گیا ہو۔ اس کے بار بار بلانے کا اسرار ناراضگی میں بدلنے لگا تو ہم دونوں نے فاصلے ختم کئے اور بمبئی پہنچ گئے۔ یاری روڈ پر ایم۔ این۔ او سوسائٹی کے ایک خوبصورت فلیٹ میں وہ رہائش

پذیر تھا۔ دیکھ کر یقین نہیں آیا۔ وہ کب اور کیسے جینے کا سلیقہ سیکھ گیا۔ ملازمت کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ گھر کے آرام آسائش اور زیبائش پر اس نے پوری توجہ صرف کی تھی۔ اس نے باپ اور ماں دونوں کی خواہش کا پورا پورا احترام کیا تھا۔ باپ کے لیے کمپیوٹر اور نئی کتابیں۔ ماں کے لیے۔۔ ماں کی ایک بہت پرانی خواہش کو پورا کیا تھا اس نے۔ ڈرائنگ روم میں ایک بڑا سا ایکوریم۔ رنگ برنگی چھوٹی بڑی خوبصورت مچھلیاں اس میں تیر رہی تھیں۔

''ماں یہ آپ کے لیے'' جب میں آفس رہوں گا تب آپ ان مچھلیوں سے باتیں کیجئے گا۔'' اس کی اس معصومیت پر میں مسکرا پڑی۔

بیٹے کی محبت فرماں برداری اور اس کی اچھوتی خواہشات سے دن اور رات پلک جھپکتے بیتنے لگے۔ اس روز اتوار تھا۔ وہ صبح سے ہی ہمارے ساتھ تھا۔ مجھے مچھلیوں کی طرف متوجہ پا کر خود بھی میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ''ماں۔ ان مچھلیوں سے آپ کی جان پہچان ہوئی؟؟''

''کچھ کچھ..... یہ کالی چوڑی مچھلی ایک آنکھ سے دیکھتی ہے مجھے۔''

''یہ..... یہ اینجل فش ہے۔''

''اوہ..'' ... میں حیران ہوئی کیونکہ اس میں اپنے نام کی تمام صفات موجود تھیں۔ وہ دوسری مچھلیوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس کی عادات مزاج یہاں تک کے تیراکی میں بھی ایک قسم کی سچائی، پاکیزگی اور بھولپن تھا۔ نہ کسی سے لڑائی نہ جھگڑا۔ اینجل فش کے دو جوڑے تھے۔ ایک بالکل سیاہ اور دوسرا کالی سفید دھاری والا۔ ''یہ وہائٹ مولی ہے۔ اور یہ گولڈن مولی''۔

''لیکن بیٹا یہ گولڈن مولی جتنی ہشاش بشاش چست اور پھرتیلی ہے وہائٹ نہیں۔''

''ہاں، وہ اکیلی ہے نہ۔ اس کا میل مر گیا۔ آپ کے آنے سے ایک روز پہلے۔''

''اوہ...'' میرا دل بجھ سا گیا۔

''آپ نے دیکھا ہوگا یہ گولڈن مولی اپنے میل کو اس کے پاس پھٹکنے نہیں دیتی۔''

''ارے... یہ تو میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔''

''اور یہ لال مچھلی؟ اس کا کیا نام ہے؟ یہ تو بہت زبردست رقص کرتی ہے۔ اس قدر تھرکتی ہے مانو سینکڑوں جل ترنگ ایک ساتھ بج اٹھے ہوں۔''

''یہ ریڈ ہیڈ ہے۔ جیسے جیسے بڑی ہوتی جائے گی اس کا سر کا حصہ بڑا ہوتا جائے گا۔ جسم سے ذرا بڑا۔ اور رنگ گہرا۔ یہ بہت سمجھدار ہوتی ہے۔ خطرہ بہت جلدی بھانپ لیتی ہے۔''

ایکوریم کی سب سے بڑی اور منفرد مچھلی سامنے سے گزری تو میں نے پوچھا۔

''یہ کالی سب سے بڑی مچھلی بھی بہت ہی خوبصورت ہے۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے مانو پورے ایکوریم کی سردار ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟''

''یہ فائٹر فش ہے۔''

''فائٹر فش؟؟ یہ لڑاکی ہے کیا؟؟''

''ہوں...!!''

''لیکن میں نے اسے لڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''اکیلی ہے نہ اس لیے۔ خود کو شیر سمجھتی ہے۔ ابھی اس میں دوسرا میل چھوڑ دیا جائے تو دونوں لڑلڑ کر مر جائیں گی۔''

''کمال ہے؟؟ لیکن وہ سب سے چھوٹی کالی مچھلی؟؟ مستقل اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہتی ہے۔ بڑی خاموش۔ وہ دیکھو اب بھی اسی کے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔ بڑی مچھلی گھوم کر بار بار اسے پُش کرتی ہے لیکن وہ پھر پیچھے چل دیتی ہے۔''

''وہ اس کی فی میل ہے۔ بیٹا مسکراتے ہوئے بولا۔''

''ارے یہ اتنی سی؟؟ میل اتنا خوبصورت اور فی میل اتنی معمولی۔ یہ تو زیادتی ہے بھئی... کیوں؟''

''ارے ماں... وہ معمولی ہے اسی لیے تو اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔''

نہیں یہ بات تمہاری بالکل غلط۔ معمولی ہونا الگ بات ہے۔ آخر وہ اس کا میل ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اس سے بہت محبت کرتی ہو — محبت؟ بیٹے نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر نہانے چلا گیا۔ اس کا جملہ اور پھر قہقہہ میرے وجود کو چیرتا چلا گیا۔ لمحہ بہ لمحہ اندر ہی اندر مجھے درد گھٹن اور بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ میری نگاہوں میں نہ جانے کیوں مسز کمار کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔ یہ پروفیسر کمار ہندی لٹریچر سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر وقت لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرے رہتے تھے۔ ساٹھ کے ہونے کو آئے تھے۔ لیکن خود کو ایسے رکھتے تھے کہ پچاس کے بھی نہیں لگتے تھے۔ کرشن لیلاؤں پر لیکچر دیتے تو کہیں سے کہیں بہہ جاتے۔ کئی ریسرچ اسکالران کی ہمنوا بن چکی تھیں۔ کئی سے ان کے تعلقات..... خدا جانے۔ زندگی کے ایک ایک پل سے وہ آسودگی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے وضع قطع کئے نظامِ زندگی میں بیوی کو کبھی مخل ہوتے نہیں دیکھا۔ اس کے باوجود پروفیسر کمار جب اپنے قریبی دوستوں خاص طور پر لڑکیوں کے درمیان ہوتے تو اپنی زندگی کی محرومیوں، مجبوریوں کا اس طرح ذکر کرتے کہ سب کے دل پسیج جاتے۔ مسز کمار بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ مناسب خط و خال رکھتی تھیں۔ لیکن گھر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ تو بس شوہر کی آسودگی میں ہی اپنی آسودگی حاصل کر لیتیں۔ وہ جتنی دیر گھر میں رہتے وہ ان کے پیچھے پیچھے پھرتی رہتیں۔ یہ کھا لیجئے اور یہ پہن لیجیے۔ اگر کبھی مذاق میں انہیں کوئی چھیڑتا تو وہ مسکرا کر بس اتنا ہی کہتیں ''ارے نہیں پروفیسر صاحب ایسے نہیں ہیں۔'' شاید انہیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر وہ اپنا روٹین بدل دیں گی تو مسٹر کمار کی اس توجہ سے بھی محروم ہو جائیں گی۔

میں نے ایکوریم کی مچھلیوں کو غور سے دیکھا۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ ایسا محسوس ہوا مسٹر کمار فائٹر فش ہیں اور مسز کمار ان کی فی میل۔ گھٹن اور گھبراہٹ نے میرے دل و دماغ کو اس شدت سے جکڑ لیا کہ میرا سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ ایسا لگا مسز کمار میرے اندر داخل ہو گئی ہیں اور میں کسی ایکوریم میں بند ہو گئی ہوں۔ فائٹر فش آگے آگے اور میں اس کے پیچھے پیچھے۔ تبھی ایکوریم کی فائٹر فش نے مڑ کر اپنی فی میل کو پُش کیا۔ میرا دل

چاہا ایک ڈنڈا لے کر چھنا کے سے اس ایکوریم کو توڑ دوں اور ساری مچھلیوں کو آزاد کر دوں۔ گھبرا کر میں نے گھر کے در و دیوار کو دیکھا اور وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھلی ہوا میں سانس لینے کے لیے میں بالکونی میں چلی گئی۔ کچھ دیر پہلے دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ آسمان صاف شفاف اور نیلا تھا۔ لیکن اب موسم بدل چکا تھا۔ آسمان کو سرمئی بادلوں نے ڈھک لیا تھا اور اجالا مدھم ہو گیا تھا۔ ناریل کے اونچے اونچے درخت خاموش اپنا وزن اٹھائے کھڑے تھے۔ اور میری خاموشی نے میرے اندر ایک طوفان اٹھا رکھا تھا۔ اچانک شیراز نے پیچھے سے سرگوشی کی۔

''بیگم صاحبہ بندے کو ایک کپ چائے ملے گی؟''

میں نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ میرا کرب، میرا درد، تڑپ اور اندر کا تلاطم شاید سب سوالیہ نشان بن گئے تھے۔ میرے چہرے پر۔

کیوں کیا ہوا؟؟

کچھ نہیں۔ لیکن چائے آپ بھی بنا سکتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کوئی جواب سنے بغیر میں فلیٹ سے نیچے اتر آئی اور کمپاؤنڈ میں ٹہلنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں بیٹا میرے قریب آیا۔ ''کیا بات ہے ماں؟''

کچھ بھی نہیں!

وہ میرے جسم کا حصہ تھا۔ میری کھوکھلی مسکراہٹ اس کو مطمئن نہ کر سکی۔ گلے میں باہیں حمائل کرتے ہوئے بولا آپ بہت سینسٹو ہیں ماں۔ چلئے میرے ساتھ بازار چلئے۔ میں کچھ بولے اور کچھ پوچھے بغیر اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ راستے بھر اپنی باتوں سے مجھے بہلاتا رہا اور میں راستے بھر اپنے اندر کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے آنسو پیتی رہی۔ یہ عجب مچھلی بازار تھا۔ بس ایک چوک سا تھا۔ جس میں چھوٹے بڑے تخت چاروں طرف لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں بھی کئی تخت تھے۔ ہر تخت پر کئی قسم کی مچھلیاں اور ان کے خریدار۔ جس سے بھی نظریں مل جاتیں اس کی پوری کوشش ہوتی کہ مچھلی اسی سے خریدیں۔

تمہیں مچھلی خریدنا ہے؟ جی..... وہ مسکرایا۔ اور آگے بڑھ گیا۔

بیٹا اپنی پسند کی پمفلٹ مچھلی تلاش رہا تھا اور میں اس مچھلی بازار کو دیکھ کر حیران تھی۔ مچھلی فروش صرف خاتون تھیں۔ بالکل الگ طرح کی۔ گہرا چمکدار رنگ۔ مچھلی کی طرح چکنی چکنی کھال۔ کسے ہوئے بال۔ ناک میں بڑی سی لشکارا مارتی سنہری لونگ ماتھے پر چمکتی لال بندی بالکل ایسی جیسے سمندر کے ماتھے پر شام کا سورج۔ رنگ برنگے ملبوسات گلے اور کانوں میں کوئی نہ کوئی زیور۔ میں اسے دیکھنے میں اتنی منہمک تھی کہ اس کی بات کا جواب بھی نہ دے سکی۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

لے لو... تاجی ہے بالکل تاجی۔

ماں دیکھیے یہ پمفلٹ کیسی ہے؟؟

میں نے چھو کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ تازہ ہے۔ ٹھیک ہے۔ لے لو۔

کیسے دی ہیں؟؟ میں نے اس سے پوچھا۔

ساٹھ کا جورا۔ دو۔ اس نے دو انگلیاں دکھائیں۔ ساٹھ روپیہ کی دو بہت مہنگی ہیں۔ اتنی چھوٹی چھوٹی ہیں۔

نیا نیا مال۔ ابھی ابھی لایا۔ اچھا ہے۔ لے لو۔ اس نے اپنے مال کی کھل کر تعریف کی۔ دو روپیہ کم دے دینا۔ کتنا لینا ہے؟؟

میں آگے بڑھنے لگی تو اس نے روکا۔ کتنا لینا ہے؟؟

تین جوڑی بیٹے نے جواب دیا۔

لے لونا۔ پچاس کا لینا ہے؟؟

اسے میری بات اور مجھے اس کی بات سمجھنے میں خاصی دقت ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی مچھلی کی پھر تعریف کی۔ بیچ سمندر کا ہے۔ چاندی کے رنگت مافک۔ کہیں نہیں ملے گا۔ وہ نیلے رنگ کا مچھلی ہے کنارے کا۔ وہ اچھا نہیں ہوتا۔ اس نے برابر کی دوکان والی مچھلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

بیٹے نے تین جوڑے کا آرڈر دے دیا۔

کانٹا نہیں۔ بس بیچ میں ایک چیرا لگانا ہے۔ مصالحہ بھرنے کے لیے۔ میں نے

اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ بہت مشاقی سے مچھلی بنا رہی تھی۔ اور میں دوسری خواتین کو دیکھ رہی تھی جو اپنے اپنے گاہکوں میں مصروف تھیں۔ اچانک دو بچے گرتے پڑتے دوڑتے آئے اور اس کی گردن میں لٹک گئے۔ ایک کی عمر چھ سات برس ہوگی دوسرے کی بہت سے بہت نو دس۔ وہ خود کو نہ سنبھالتی تو یقیناً تخت سے نیچے لڑھک پڑتی۔ بچوں کے پیچھے پیچھے ایک لمبا تڑنگا آدمی سیاہ رنگ پر چوڑی گھنی سیاہ مونچھیں گول گول چمکدار آنکھیں۔ ہاتھ پکڑ کر وہ بچوں کو گھسیٹنے لگا۔ ہماری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا لیکن وہ سمجھ چکی تھی۔ عورت مچھلی چھوڑ کر چاپڑ لے کر تن کر کھڑی ہوگئی۔ اس دیو قامت آدمی کے سامنے تخت پر کھڑی ہونے کے بعد بھی وہ ذرا سی لگ رہی تھی۔

''کھبر دار جو بالکن کو ہاتھ لگایا۔ ان ہاتھاں کے ٹکرے ٹکرے نہ کردی تو ہمری نام نئیں۔ ان پر تو حک بتانے آیا ہے۔؟؟ تیرے کو ان کی کمائی کھانا۔؟؟ جا کر اس چھنال رنڈی کنے سو جسے تو لے کر آیا میری چھاتی پر۔ اِدھر کا رُکھ کرنے کا نئیں۔ سمجھا... حرامی... بدجات... ہمری گا بکی کھراب کرنے آیا تو؟؟

عورت کی آنکھوں میں سرخ سیلاب امڑ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا اگر وہ آدمی بچوں کا ہاتھ نہ چھوڑتا تو واقعی وہ جسم سے اس کا ہاتھ الگ کر دیتی۔ اب تک کئی لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔ لہٰذا اس سیاہ فام آدمی نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔

بچے اس کی ٹانگوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ انہیں الگ کر کے وہ تیزی سے پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

''مائی۔ یہ ساری پمفلٹ دے دو۔''

سگلی.....؟؟ عورت نے حیرت سے پوچھا۔

ہوں۔ سگلی۔

بیٹے نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ماں یہ بہت ہیں۔ اس نے گنتی کی... نو جوڑے... اٹھارہ پمفلٹ—؟؟؟

ہاں— سب لے لو— آج تمہارے سب دوستوں کی دعوت—!

انجم قدوائی

صدیوں نے سزا پائی

آبائی وطن۔شہرِ لکھنؤ کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں "بہار پور"
مقیم۔علیگڑھ، انڈیا
خواتین بزم ادب علیگڑھ کی ایک فعال رکن
انشاء اور لاریب قوس قزح، ادبِ اردو اور بزم ادب جیسے ادبی جریدے میں شائع ہونے کے ساتھ فیس بک پر بھی لکھتی ہیں۔
کتاب۔افسانوی مجموعہ زیرِ ترتیب

.....

کئی برس گزر گئے اِس حویلی کے پیچھے والے باغ میں کھڑا ہوں اور بچپن سے اس جگہ کی سرگرمیاں دیکھ رہا ہوں۔جب میرا قد چھوٹا تھا تو اچک اچک کر حویلی کے آنگن میں جھانک لیا کرتا تھا۔ایک خوبصورت، چمکتی دمکتی لہراتی، قہقہے لگاتی دلھن کو دیکھا تھا میں نے۔۔۔۔۔جب وہ لہرا کر چلتی تو اسکی پازیب چھن چھن بولتی، یہ مدھر آواز پوری حویلی میں گونج جاتی۔۔۔کتنی بے فکر زندگی تھی۔۔۔اسکی بھی اور میری بھی۔۔۔۔۔۔۔۔

ٹھریئے۔۔۔۔۔! آپ سے اپنا تعارف نہیں کروایا میں نے میں ایک یوکلپٹس کا پیڑ ہوں۔تھوڑا لمبا ہوا تو میرے احساسات بھی بدل گئے۔انِ خوشبو دار پتّوں میں جب ہوائیں سرسرا کر مجھے گدگداتیں تو ایک سرور کا احساس ہوتا میں لہراتا.....

فراہمی وغیرہ۔ یہ سب بہت ضروری عوامل ہیں۔ تاہم عورت کی آزادی کی جدوجہد ایک ایسے سماج میں کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوگی جہاں آبادی کی اکثریت پر پدرسری سوچ مسلط ہو۔ عورت پر جبر کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ پدرسری سوچ اور جنسی تفریق کا خاتمہ کیا جائے۔ عورت کی آزادی کی جدوجہد نامیاتی طور پر انقلابی سوچ کی جدوجہد سے جڑی ہوئی ہے۔ اور انقلابی سوچ کے لیے ضروری ہے کہ سماج اور اس کی تنظیموں کو بلاتفریق زبان، قومیت، نسل، مذہب اور جنس کے متحد کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف سماج کو جبر اور استحصال کی ہر شکل کے خلاف جدوجہد میں شامل ہو کر سماج کی تمام مظلوم طبقوں کی رہنمائی کرنی چاہئے اور دوسری طرف طبقاتی تقسیم کی ہر کوشش کو مسترد کر دینا چاہئے۔ چاہے یہ کوشش مظلوم طبقات کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو۔

یہ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم تمام تر جبر کے خلاف لڑیں۔ تحریک نسواں کا مقصد نئی سرحدیں بنانا نہیں بلکہ تمام سرحدوں کو ایک عالمی پروگریسو سوچ میں ضم کرنا ہے۔ بورژوائی پدرسری سوچ طبقے کو جنسی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا مہلک کردار ادا کرتی ہے۔ اور سالہا سال کے امتیازی سلوک اور جبر سے جنم لینے والے نفرت کے جذبات کو استعمال کرتی ہے۔ انقلابی مفکرین نے اس بات کی ضرورت پر زور دیا کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد میں تمام انقلابی سوچ کو متحد کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں پروگریسو سوچ بھی ان مسائل کو خاص طور پر طبقاتی نظر سے دیکھتا ہے۔ عورت پر جبر کی طرف بھی پروگریسو سوچ کا یہی رویہ ہے۔ ہر طرح کے امتیازی سلوک اور جبر کے خلاف لڑائی کے دوران مسئلے کو مرد اور عورت کی جنگ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش شاید فیصلہ کن ثابت نہیں ہوتی۔ سماج میں ہر طرح کی تقسیم (مثلاً مرد اور عورت کے درمیان، کالے اور گورے کے درمیان، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ، شیعہ یا سنی کے درمیان) صرف مجبور اور مظلوم کے مفادات کو نقصان پہنچا کر ان کی غلامی کو مزید طول دیتی ہے۔ درحقیقت انقلابی تحریک کی تمام تر تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ طبقاتی سوال بنیادی ہے اور

اور لہراتا۔۔میرے۔لمبے اور نرم پتے جھوم جھوم کر حویلی کی چھتوں تک پہنچنے لگے تھے، ساتھ ہی کئی بزرگ درخت بھی ہیں مگر وہ زیادہ خوش نہیں رہتے۔۔۔جیسے میں رہتا ہوں۔۔۔ ہمیشہ خوش۔۔۔ہلکی آواز میں گنگناتا۔۔۔جھومتا۔۔۔لہراتا۔۔۔۔دل چاہتا کہ ان سے پوچھوں۔۔آپ خوش کیوں نہیں۔۔۔۔اتنے افسردہ کیوں رہتے ہیں؟

مگر وہ مجھے منھ کہاں لگاتے۔۔۔اونچی ہواؤں میں اڑتے مجھ سے کئی گنا بڑے اور تجربہ کار ہیں۔۔بقول ان کے دنیا دیکھی ہے۔۔۔تو میں اس نئی نویلی دلھن کی ہنسی اور پازیب کی جھنکار سن کر مسرور ہو جاتا۔۔۔۔میرے اندر شگوفے پھوٹنے لگتے۔ صبح صبح جب اندھیرا پوری طرح ختم بھی نہ ہوتا، میں اٹھ جاتا ہوں۔اپنے پیدا کرنے والے کی حمد وثنا کرتا ہوں، اس کا شکر ادا کرتا ہوں جو مجھے زمین کے اندر سے غذا دیتا ہے جو ہواؤں اور بارش سے مجھے سیراب کرتا ہے جو دھوپ میں میری پرورش کرتا ہے، وہ مجھے دیکھتا سنتا اور سمجھتا بھی ہے۔میرے بزرگ پیڑوں نے مجھے عبادت کرنا سکھایا مجھے بے حد سکون ملتا ہے جب خاموش ہو کر سناٹے میں اس کو یاد کرتا ہوں۔

اذان ہوتے ہی وہ نئی نویلی دلھن بھی بیدار ہو جاتی ہے۔ وضو کرتی تو اسکی چوڑیاں اور کنگن کھنکتے۔۔اس کی دبی دبی ہنسی تب بھی سنائی دے جاتی۔بہت کوشش کرتا کہ اسے دیکھ لوں مگر ان آوازوں پر ہی گزارا کر لیتا۔

جب اس کے کوئی مہمان آتے اور باغ کی طرف والا دروازہ کھولا جاتا اور وہ انھیں سواری سے اتارنے کے لئے ہنستی کھلکھلاتی آ کھڑی ہوتی۔۔۔پھر سب سے گرم جوشی سے گلے ملتی، تب اس کو بہت دیر تک دیکھتا رہتا۔۔۔اسکے لمبے گھنے کالے بال جو دوپٹے کے اندر سے کمر تک جاتے دیکھائی دیتے، اسکا چمکتا دمکتا گلاب چہرہ اندرونی خوشی سے تمتمایا رہتا لمبا قد بھرا بھرا جسم، اس کی جگمگاتی خوبصورت کالی آنکھیں سرخ ہونٹ۔۔۔

کئی دن تک اسی سرور میں رہتا تھا۔

شام ہوتے ہوتے چراغ جل جاتے۔باغ میں بڑے سے حوض کے چاروں

طرف قندیلیں روشن ہو جاتیں۔ ہر جانب نرم اور مدھم سا اُجالا پھیلنے لگتا۔ میری شاخیں مجھے میں سمٹنے لگتیں۔۔ تب میں باغ کے پاس والے کمرے سے دبی دبی ہنسی کی آوازیں سنتے سنتے سو جایا کرتا۔

راجہ لوگوں کی بڑی باتیں۔۔ دروازے پر دو ہاتھی کھڑے رہتے، گھوڑوں کے اصطبل سے کئی گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں آتی رہتیں، لوگ باتیں کرتے جس سے پتہ چلتا کہ کئی رنگ و نسل کے گھوڑے وہاں موجود ہیں۔

راجہ صاحب کبھی ہاتھی اور کبھی گھوڑوں پر سیر کو نکلتے۔ انکے جاتے وقت جب نئی دلھن انکے بازوئں پر ستاروں بھرا امام ضامن باندھتی تو اس کی ہنسی رُک جاتی۔ اسکے ہونٹوں پر دعائیں لرزنے لگتیں۔ آنکھیں نم ہونے لگتیں، راجہ صاحب اس کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر بہلاتے۔ تب میں دعا کرتا کہ وہ کبھی کہیں بھی نہ جائیں نئی نویلی دلھن کی پلکیں کبھی نہ بھیگیں۔

وہ میرے پتے مٹھیوں میں بھر لیتی، مجھے لگتا ان مٹھیوں میں میرا دل دھڑک رہا ہے، وہ اپنی ہتھیلیاں ناک کے پاس لیجا کر میری خوشبو اپنی سانسوں میں اتارتی، تو میرا دل ناچنے لگتا۔ نرمی بڑھنے لگتی خوشی کے فوارے سے پھوٹتے اور اسکی آنکھیں خوابناک ہو جاتیں۔

مگر میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی شادی کو پانچ برس کا عرصہ گزر گیا تھا، ہنسی کی آواز اب شاذ و نادر ہی سنائی دیتی۔ اندر سے بڑی رانی صاحبہ کی سرگوشیاں بڑھ گئی تھیں۔ اس خوبصورت رانی دلھن کو اولاد کے طعنے ملنے لگے تھے۔ جسے سن کر وہ باغ والے کمرے میں آ کر گھنٹوں درختوں پھولوں اور حوض کے شفاف پانی کو تکتی رہتی شاید دل ہی دل دعائیں کرتی ہوگی۔ اللہ کو کیا منظور تھا یہ کون جان سکتا ہے۔ میں نے ایک دن اپنے بزرگ پیڑ سے بات کرنی چاہی، دراصل وہ آپس میں بات کرتے تو مجھے تجسّس ہونے لگا تھا۔

ان لوگوں کی باتوں میں مجھے پُر اسرار سرگوشیاں سنائی دیتیں۔ وہ باتیں راجہ

صاحب کے دادا کے بارے میں تھیں۔ جنکو اولاد نہ ہونے کی بد دعا ملی تھی۔

انکے ایک ہی بیٹے تھے جو اِن راجہ صاحب کے والد تھے، انکے باقی دونوں بچّے عالمِ جوانی میں ختم ہو گئے۔۔۔بس ایک یہی تھے جو سارا انتظام دیکھ رہے تھے۔

پرانے قصّے کیا تھے وہ میں سمجھ نہیں پا تا تھا۔۔۔ مگر اپنے برابر والوں سے یہی سنا تھا کہ بد دعا زبان سے نہ بھی دی جائے تو دل سے نکل کر عرش پر پہونچ جاتی ہے، کچھ لوگوں کے ساتھ اس قدر ظلم ہوا تھا کہ وہ گھر سے بے گھر کر دیے گئے اور تو اور وہ ان کے اپنے سگے بھائی تھے، معصوم تھے اپنی اور اپنے بچّوں کی جان بچانے کیلئے وہ در در بھٹکنے پر مجبور ہوئے تھے۔

یہ ساری باتیں اکثر بزرگ پیڑ کرتے رہتے تھے، مجھے ان کی باتوں سے ڈر محسوس ہوتا، کئی دن سہما رہتا تھا۔ بڑی رانی صاحبہ اپنے خدمت گاروں پر بہت ظلم کرتیں، کڑی دھوپ میں انکو ننگے سر اور ننگے پیر کھڑا رہنے کا حکم دے دیتیں۔ ایک بار تو میں نے خود دیکھا تھا کہ انھوں نے اپنی خادمہ کے ہاتھ پر جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا تھا جس سے اس کا ہاتھ مدتوں زخمی رہا تھا وہ نوکروں کو غصّے میں عجیب وہ غریب سزائیں دیتی تھی۔ کسی کے ہاتھ کو جلاتیں، کسی کے ہاتھوں کو بھاری بھرکم مسہری کے پائے کے نیچے دبا دیتیں اور اسپر دوسری لحیم شحیم عورت کو کھڑا ہونے کا حکم دیتیں۔۔۔ انکی آواز سے سارے خادم کانپتے تھے۔۔۔

ایک دن اچانک جب باغ والے دروازے پر گاڑی آ کر رکی تو مجھے ایک بچّے کے رونے کی آواز آنے لگی۔۔ رانی دلھن کی گود میں ایک ننھا سا وجود دیکھ کر میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔ حویلی میں اچانک رونق اور چہل پہل دکھائی دینے لگی لوگ بھاگ دوڑ کر رہے تھے غریبوں میں کپڑے بانٹے جا رہے تھے، صدقے دیے جا رہے تھے۔ رانی دلھن کی ہنسی کے فوآرے چھوٹ رہے تھے۔ مگر بڑی رانی صاحبہ کی سرگوشیوں کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔

یہ ہمارا خون نہیں ہے، بیوی کی باتوں میں آ کر نہ جانے کسے اٹھا لائے ہیں"

حویلی سجائی گئی تھی رشتہ دار عزیز سب تہنیت دینے آئے ہوئے تھے۔ کچھ خفا اور کچھ خوش نظر آرہے تھے۔ مگر بچہ ایسا تھا کہ سب کو پیار آرہا تھا۔۔۔ اور تو اور جب وہ سرخ کپڑوں میں ننھی سی ٹوپی لگائے ہمک کر بڑی رانی کی طرف آیا تو انھوں نے بھی گود میں لیکر کلیجے سے لگالیا۔

وہ گول مٹول پیارا سا بچہ جس کی صورت یہاں کسی سے نہیں ملتی تھی، وہ اپنی شکل آپ تھا۔

جب کچھ بڑا ہوا اور باغ میں کھیلنے آنے لگا تو میں اپنے سفید پھول اور نرم پتے اسپر نچھاور کرتا۔۔۔ رانی دلھن دوڑ کر اسکو پکڑتی اور وہ کھلکھلا کر میرے سائے میں دوڑتا بھاگتا۔۔۔ کبھی حوض کے کنارے کبھی کسی درخت کے نیچے اور کبھی آکر مجھ سے لپٹ جاتا۔۔۔ مجھے بہت سکون سا محسوس ہوتا تھا۔ حویلی کے حالات بدلنا شروع ہوگئے تھے۔ ہاتھی تو کب کے دروازے سے غائب ہوگئے تھے اور اب گھوڑے بھی کم ہوگئے ، راجہ صاحب نے جیپ خرید لی تھی وہ اکثر شام کو بچے اور اپنی دلھن کے ساتھ باہر گھومنے جاتے وہ ہنستی مسکراتی اپنے آپ کو بڑی سی گلابی چادر میں لپیٹ کر، بچے کو سینے سے لگائے جیپ میں آکر بیٹھ جاتی۔ باغ کا دروازہ کھول دیا جاتا اور جیپ باہر نکل جاتی۔۔۔ میں اپنے سفید پھول ان پر وار دیتا اور ان کی دائمی خوشیوں کی دعا کرتا۔

وقت رکتا نہیں وہ تو بہے جاتا ہے ابھی رات کا اندھیرا باقی تھا میں اپنے پتوں میں چھپا آرام سے سویا ہوا تھا، اک چیخ سے میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے گھبرا کر حویلی کے اُوپر سے جھانکا تو روشنیوں کو ادھر اُدھر جاتے دیکھا، سب کے پریشان چہرے دیکھے۔ وہ اس حویلی میں راجہ صاحب کا آخری دن تھا۔۔۔ وہ کئی دن سے بیمار تھے اور پھر نہ جانے کیا ہوا۔۔ رانی دلھن کی چوڑیوں کے ٹوٹنے سے میں لہولہان ہوگیا، تن بدن میں خراشیں پڑ گئیں، انکا سرخ چمکتا روپہ اُتار کر سفید سوتی چادر میں لپیٹ دیا گیا۔ وہ حویلی کے صحن میں بچے کو سینے سے لگائے سسک سسک کر رو رہی تھیں۔ میرے اندر گرم گرم سیال سا ابل رہا تھا مگر میں پیڑ ہوں رو نہیں سکتا۔

پھر موسم بدلنے لگا تیز آندھیاں آتیں میرے ڈھیروں سوکھے پتے حویلی کے آنگن میں اور باغ والے کمرے کے سامنے بکھر جاتے۔کام کرنے والے کم ہو گئے تھے۔۔۔کئی کئی دن صفائی نہ ہوتی۔پتے یونہی ادھر اُدھر اڑتے رہتے۔

بزرگ پیڑ اب جھکنے لگے تھے ان کی زبانی بہت کچھ سنا میں نے ،انھوں نے یہاں کے بہت سرد و گرم دیکھے، بدعا تو عرش کے پائے ہلا دیتی ہے نہ جانے کتنا ظلم ہو چکا تھا، جس کا خمیازہ اب یہ معصوم بھگت رہے تھے۔وہ ظلم و زیادتیاں پرانے درختوں نے دیکھی تھیں اسی لئے وہ کبھی نہیں ہنستے تھے۔انکے اندر دکھ کی دیمک لگ چکی تھی۔انھیں نہ ٹھنڈی ہواؤں سے سرور آتا اور نہ پانی کی بوندوں سے گدگدی محسوس ہوتی۔ایک دربان کی طرح حویلی کی اوٹ میں کھڑے کھڑے بوڑھے ہو رہے تھے۔

میں بھی اب تھکنے لگا تھا۔میری شاخیں بھاری ہو کر بوجھ بن گئی تھیں۔برابر کے بزرگ پیڑ بھی کم ہو گئے تھے۔

رانی دلھن اب بوڑھی ہونے لگی تھیں۔بڑی رانی بھی چل بسی تھیں.....وہ بہت تکلیف اٹھا کر گئی تھیں انکی دلخراش آوازیں مجھے سہما دیتی تھیں.....

وقت اور آگے بڑھ آیا۔وہ بچہ بڑا ہونے لگا تھا،اس کی تعلیم کے لئے نئی دلھن نے بہت کوششیں کیں مگر ناکام رہیں.....وہ اپنا اثاثہ فروخت کرتا رہتا تھا۔اس بات سے گھر میں کافی تکرار رہتی۔

انسانوں کے جنگل کی یہ عام بات ہے۔خون چوس کرا لگ ہو جانے والی جوکوں نے انکو گھیر لیا تھا۔اور چھوٹے راجہ ان لوگوں کے لئے ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھے۔

وہ رانی دلھن کی کسی نصیحت پر کان نہ دھرتا ،اپنا اقتدار واپس پانا چاہتا تھا مگر اب زمانہ بدل چکا تھا حکومتیں بدل چکی تھیں، وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

تیز آندھیوں میں کئی بزرگ درخت زمیں بوس ہو چکے تھے۔۔۔ان کی لکڑی کاٹنے کی آواز میرے اندر خراشیں ڈال تی تھی۔

میری سماعت رانی دلھن کی آواز کو ترستی تھی۔تب ایک دن وہ پھر ہنس رہی

تھیں۔۔۔آنسوؤں میں بھیگی ہنسی سے در و دیوار سج رہے تھے، اپنی جیسی سرخ کپڑوں میں لپٹی ایک نازک سی دلھن ان کے بازوں میں تھی، چھوٹے راجہ کی دلھن آ گئی تھی۔

میں نے بھی اپنا کمزور ہاتھ اٹھا کر اسے خوش آمدید کہا۔ اپنے کچھ نرم پتّے اس پر نچھاور کئے.....کچھ دنوں تک حویلی میں گہما گہمی رہی، باغ والے کمرے کا دروازا کئی بار کھلا۔۔رانی دلھن نے کئی مہمانوں کو خوشی خوشی سواری سے اتروایا اور پھر شادی کے بعد رخصت بھی کیا۔ انکی پرانی چال جیسے لوٹ آئی تھی وہ بے پناہ خوش تھیں۔ مگر کچھ دنوں بعد پھر وہی خاموشی سی چھا گئی نئی دلھن اکثر میکہ میں رہتیں۔

باغ والے حوض کے کنارے اب قندیلیں نہیں جلتی تھیں، اندھیرا ہی رہتا۔ حوض کا پانی بھی نہیں بدلا جاتا تھا پہلے جب رانی دلھن اپنے راجہ صاحب کے ساتھ شام کی چائے وہاں پیتی تھیں تو حوض کا شفاف پانی ہلکورے لیتا، ایک ٹک ان دونوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ مگر اب اس گدلے پانی میں تھرّ یاں پڑنے لگیں تھیں۔

کبھی کبھی دن بھر کی تھکی چڑیاں وہاں بیٹھ کر ہاتھ منھ دھولیتیں، گھونٹ بھر پانی پی کر پھر پھراتی ہوئی آسمان کی وسعتوں میں کھو جاتیں۔ رانی دلھن کو اب کم دیکھائی دینے لگا تھا۔ تھر یوں بھرا چہرا لئے کبھی کبھی آنکھوں پر انگلیوں کا چھجّا سا بنا کر صحن کے کونے سے مجھے دیکھتیں۔ شاید وہ مجھے پہچانتی تھیں۔ باغ والے کمرے کا دروازہ کھول کر اکثر خاموش کھڑی رہتیں۔

شاید ان کے رنج کا ساتھی میں ہی تھا، کم علمی کی وجہ سے انکا بیٹا ٹھوکریں کھاتا اور وہ تڑپتیں ایک روز جب یہ خبر آئی کہ شہر کی ساری جائیداد پر کچھ لوگوں نے زبردستی قبضہ کرلیا ہے تو وہ سنبھل نہ سکا۔

اس دن بہت تیز آندھی آرہی تھی، میں بار بار خود کو سنبھال نے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس آندھی کے شور میں اچانک کئی شور شامل ہو گئے۔

وہ بچّہ جو رانی دلھن کی گود میں پلا تھا، اپنا دل نہ سنبھال سکا اپنی ننھی سی بچّی کو اپنی دلھن کی گود میں چھوڑ کر لڑکھڑایا اور اچانک ڈھے گیا۔ آندھیوں کا شور بڑھ گیا۔۔۔

میرے سارے پتّے میرا ساتھ چھوڑ گئے۔۔۔۔رانی دلھن کی چیخیں میرے اندر خراشیں ڈال رہی تھیں چھوٹی دلھن کے آنسو مجھے تڑپا رہے تھے۔انکا درد ساری کائنات پر پھیل رہا تھا۔ان کے دونوں ہاتھ خالی تھے،دل خالی تھا۔۔۔میں کیسے برداشت کرتا۔۔۔ایک چیخ سنی اور پھر کچھ یاد نہیں میری شاخیں کلہاڑی سے کاٹ کر باغ والے کمرے کے سامنے سے ہٹائی جارہی تھیں میں وہاں چت پڑا تھا میرے بدن پر آریاں چل رہی تھیں اندھیرے میں ڈوب رہا تھا۔۔۔انجانے میں اس بددعا میں میں بھی شامل ہو گیا جو گھر والوں کے لئے تھی۔۔اندھیرا گہرا اور گہرا ہو گیا۔

☆☆

ڈاکٹر نگہت نسیم

بیل فلاور

مقیم۔سڈنی، آسٹریلیا
آبائی وطن. پاکستان
وہ ادبی جریدے جن میں افسانے شائع ہوئے
تسطیر۔(پاکستان)، ثالث۔(انڈیا)، شاعر۔(انڈیا) فنون۔
کتاب۔مطبوعہ تصانیف:.1 گرد باد حیات (افسانوں کا مجموعہ)
کتاب۔ مطبوعہ تصانیف : .1 گرد باد حیات (افسانوں کا مجموعہ) . .2 مٹی کا سفر (افسانوں کا مجموعہ) . .3 سفید جھیل (نظموں کا مجموعہ) . .4 یہی دنیا ہے یہیں کی باتیں (کالموں کا مجموعہ)۔

....

یکم جنوری 1986

آج میں بہت اداس ہوں، گزرتے وقت کا کوئی لمحہ بھی ایسا مجھے یاد نہیں آرہا جس میں کچھ الگ ہوا ہو۔۔کبھی کبھی سوچتی ہوں سال کا پہلا لمحہ ہو یا آخری کچھ بھی تو نہیں بدلتا سوائے کلینڈر کے۔۔۔یہ روزانہ کی ترتیب والی زندگی سے وحشت ہونے لگی ہے۔ کبھی تو کچھ ایسا ہوا کرے جو نا ہوا ہو کبھی!

5 جنوری 1986

آج کئی دنوں بعد ڈائری لکھنے بیٹھی ہوں۔ پر سوچ رہی ہوں کیا لکھوں۔۔؟ کیسے لکھوں۔۔؟ دل پر کیا قیامت گزر گئی۔ بی بی جی کو بیٹھے بٹھائے جانے کیا ہوا، باتیں کرتے کرتے ایکدم سے گر گئی اور پھر خاموش ہوگئی۔۔ اف میرے خدا ہسپتال میں ان کا داخلہ اور ان کی بے بسی۔۔ اتنی تکلیف دہ اور مایوس سے دن اور رات۔ بی بی جی یوسف اور مجھ پر جان چھڑکتی ہیں، اگر انہیں کچھ ہو گیا تو۔۔؟ اف مجھ سے اس سے آگے کچھ نہیں سوچا جا رہا۔۔!

ہمارے گھر کا سنگھار ہماری بی بی جی تھیں، ساری محبتیں انہیں کی برکتوں سے تھیں۔ امی جی کہتی ہیں کہ جب وہ بیاہ کر آئی تھیں تو انہوں نے دہلیز کے کناروں پر شگون کا تیل ڈالتے ہوئے ان کا ماتھا چوم کر کہا تھا ''تم میری بہو نہیں، بیٹی ہو''۔ اس دن کے بعد سے آج تک کوئی دن ایسا نہ تھا جب انہوں نے ماں بن کر اپنی بیٹی کو چاہا نا ہو۔ ان کی محبت جو دیکھتا حیران رہ جاتا۔ امی جی آج کتنی بیقراری سے بی بی جی کے ہاتھ اپنی آنکھوں کو لگا رہی تھیں تو کبھی انہیں چوم رہی تھیں۔۔ ابا جی سے دیکھا نا گیا تو انہیں زبردستی یوسف کے ساتھ انہیں گھر بھیج دیا۔ یوسف مجھ سے دو برس ہی تو چھوٹا تھا کیسی ذمہ داری سے ابا جی کے ساتھ ہسپتال کے لمبے لمبے برآمدوں میں بھاگتے بھاگتے آج اچانک بڑا ہو گیا تھا۔

بی بی جی کہا کرتی ہیں ''محبت ایثار ہے، چاہے کسی سے ہو''۔۔۔۔۔۔

میرے آنسو دعا بن کر ایک تواتر سے بہہ رہے ہیں۔۔۔ ''اللہ میری بی بی جی کو اچھا کر دے''۔۔

12 جنوری 1986

بی بی جی کو ہسپتال داخل ہوئے آج پورا ایک ہفتہ ہو چکا ہے پر ان کی بیماری میں رتی بھر سدھار کی صورت دیکھائی نہیں دے رہی۔ جانے کیوں میری چھٹی حس وہ بات کہہ رہی ہے جو میں سوچنا نہیں چاہتی۔ ڈاکٹر امان کو نہیں چاہیئے کہ ہر بات کھول کر بتا

دیتے۔۔شاید اس لیئے کہ سچ، امیدوں کے سفر کو تھکا جو دیتا ہے۔ پر سچ نہ کھلے تو انسان حقیقت کو ماننے میں خود کو تھکا بھی سکتا ہے۔۔کچھ بھی ہو، کیسے بھی ہو کچھ رشتے سب کے پاس ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کی جدائی کو دل مانتا ہی نہیں ہے۔۔گھر کے بزرگ چپ ہو جائیں تو زندگی کتنی ویران سی لگتی ہے۔۔لگتا ہے جیسے گھر سے برکتیں اٹھ گئی ہوں۔

ہائے۔۔کیا ہمارے گھر سے بھی برکتیں اٹھنے والی ہیں۔۔۔۔۔۔۔؟

20 جنوری 1986

15 جنوری کا دن کتنا تاریک طلوع ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔

گھر سے برکتیں اٹھ گئیں۔۔

محبتیں ہجرت کر گئیں۔۔۔

ہمارے گھر کا سب سے بڑا اور اہم ستون گر گیا۔۔۔۔

ہائے۔۔۔۔۔۔۔میری بی بی جی سپرد خاک ہو گئیں

کوئی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

کوئی تو بولے۔۔۔پناہوں میں بے گھری کیسی لگتی ہے؟

27 فروری 1986

بی بی جی کا چہلم بھی ہو گیا۔۔۔کاروبار زندگی پھر سے ویسے ہی رواں ہو گئے جیسے پہلے ان کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔۔ہاں ابا جی کی مسکراہٹ بی بی جی کے جانے کے بعد مسکرانہ سکی۔۔بی بی جی تو ان کی ماں تھیں پر وہ ہم سب کی سب سے اچھی اور بڑی ماں تھیں۔امی جی لحاف دھوپ میں ڈالتے ہوئے کئی بار چپکے چپکے اپنے کاسنی دوپٹے سے آنسو پونچھ چکی تھیں۔۔یہ کام کئی برسوں سے وہ بی بی جی کے ساتھ مل کر کیا کرتی تھیں۔۔

مجھے یاد آیا ابا جی کے خالہ زاد بھائی انکل حمید جو سدا سے اسلام آباد میں آباد تھے، سردیوں پر جان دیا کرتے تھے۔پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم سب ان سے ملنے گئے تھے۔بیزار سی صورت بنائے بار بار کہہ رہے تھے'' جانے خدا کو گرمیوں سے اتنا عشق

ایکوفیمینزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ

نسترن احسن فتیحی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

انقلابی تبدیلی کے لیے جدوجہد کرنے والے مظلوم طبقات کی خواتین اور ان خواتین پر ہونے والے جبر کے مسئلے کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ عورتوں نے ہمیشہ ظلم اور جبر کے خلاف آواز بلند کی ہے اور شدومد کے ساتھ ہر طرح کے ظلم و جبر کی مخالفت کرتی آئی ہیں۔ کچھ مثالیں اس نقطے کی وضاحت کے لیے کافی ہیں۔

انقلاب انگلستان اور خواتین.

انگلستان کے انقلاب میں خواتین نے بھرپور شرکت کرتے ہوئے شہنشاہیت کے خلاف جدوجہد کی اور جمہوریت اور مساوی حقوق کیلئے آواز اٹھائی۔ ۱۶۴۹ء میں لندن شہر کے خواتین کی پیٹیشن میں یہ کہا گیا کہ ''جیسا کہ ہمیں یقین ہے کہ خدا نے ہمیں اپنی ہی مشابہت میں پیدا کیا ہے اور اس بات پر کہ مردوں کے مساوی ہی حضرت عیسیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس دولت مشترکہ میں حاصل آزادی پر برابر کا حق رکھتے ہیں۔ ہمیں حیرت اور دکھ ہوتا ہے کہ آپ ہمیں نیچ سمجھتے ہیں اور اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس ایوان کے سامنے اپنی گزارشات یا مسائل پیش کرسکیں۔ کیا اس ملک کے قوانین میں موجود آزادی اور تحفظ پر اس قوم کے مردوں کی طرح ہمارا حق نہیں ہے۔''

خواتین انقلابی تحریک کی بائیں جانب ریڈیکل گروہوں اور مذہبی فرقوں میں سرگرم تھیں۔ ان کا مؤقف تھا کہ خواتین مبلغ اور وزیر بن سکتی ہیں۔ مثلاً میری کیری 'پانچویں شہنشاہیت' کی ریڈیکل تحریک کے ساتھ منسلک تھی۔ ''نئے یروشلم کی عظمت'' میں وہ لکھتی ہے کہ ''وہ وقت آرہا ہے جب مذہبی بزرگان روحانیت کا ماخذ ہوں گے۔ ان میں صرف بوڑھے ہی نہیں جوان بھی شامل ہوں گے، صرف برتر ہی نہیں کم تر بھی شامل ہوں گے، صرف یونیورسٹیوں کے پڑھے ہوئے ہی نہیں بلکہ ان پڑھ بھی، حتیٰ کہ نوکر اور گھروں میں کام کرنے والی ملازمائیں بھی۔''

J.O'FaolainandLMartines, NotinGod'sImage, pp.266-7

کیوں ہے''۔۔اور آنٹی سلمی انہیں اللہ میاں کی خفگی سے ڈرانے کے لئے ہر بار کہتیں'' توبہ کریں جی'' اور انکل حمید جھلاتے ہوئے ان کے پاس سے اٹھ جاتے، دن میں کئی کئی بار نہاتے اور رات کو ہم سب کو آئیس کریم ضرور کھلاتے۔ یوسف جسے امی جی لاکھ سمجھا کر ساتھ لائی تھیں، وہ ان کی ہاں میں ہاں ضرور ملاتا'' انکل جی گرمی کے موسم کو'' جہنم کی پریکٹس'' کہتے ہیں۔۔امی جی کے بعد جب میں بھی اسے گھورتی تو وہ دبی آواز میں کہتا'' کیا ہے آپا'' اور ادب میں کچھ دیر چپ رہتا۔۔۔۔ پھر وہی انکل حمید کی باتوں پر اس کی من مانیاں ہوتیں۔

شاید موسموں کی اسی بے ادبی سے بچنے کے لیئے امی جی کو بھی بی بی جی کی طرح سارے موسم ہی اچھے لگتے تھے۔ اس قدر شوق اور لگن سے اس کی پذیرائی کرتیں کہ موسم کبھی کبھی ٹھہر ہی جایا کرتے تھے۔۔۔۔

مجھے بھی بی بی جی، امی جی کی طرح بے ادب اور گستاخ ہونا اچھا نہیں لگتا ۔۔۔۔۔۔انسان اور موسم مہمان ہی تو ہوتے ہیں۔

30 مارچ 1986

آج کل ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ مجھے پیلے گلاب ہمیشہ سے بہت اچھے لگتے ہیں۔ آج رضوان نے کتنی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ'' پیلے گلاب نفرت کی نشانی ہوتے ہیں؟''۔۔۔تو بہ میری آواز احتجاجا کیا اونچی ہوئی کہ امی جی نے مجھے ہی ڈانٹ دیا۔'' اچھا نہیں لگتا بیٹی''۔ ارے کیا اچھا نہیں لگتا۔۔اب اگر وہ ابا جی کے جگری دوست انکل خالد کا اکلوتا ہے۔۔۔ ہوسٹل میں رہتا ہے۔۔ مجھ سے بڑا ہے تو ہوا کرے۔۔ پر امی جی کو تو ہر اس کے آنے جانے سے لے کر کھانے پینے تک کی فکر رہتی تھی۔۔ اور یوں وہ کچھ زیادہ ہی گھر پر نظر آتا تھا اور پھر یوسف کے ساتھ مل کر صرف شرارتیں ہوتیں، جسے امی جی رونق سے تعبیر کرتی تھیں۔۔ ارے یاد آیا چار دنوں بعد رانی کی سالگرہ ہے اور ابھی مجھے اس کے لئے تحفہ بھی لینا ہے۔۔ رانی کی دوستی ایک خوشگوار جھونکے کی طرح تھی۔۔ جس سے مل کر ہر پل یادگار ہو جاتا تھا۔۔۔۔

میں اس سے ضرور پوچھونگی" کیا رنگوں اور پھولوں کو نفرت کرنا آتی ہے؟
بھلا پیلے گلاب نفرت کی نشانی کیسے ہو سکتے ہیں۔۔؟

4اپریل1986

میرے خدا۔۔۔آج تو حد ہی ہوگئی۔۔رانی کی سالگرہ سے واپسی پر رضوان ہی مجھے لینے آیا ہوا تھا۔۔۔کتنے سکون کہہ رہا تھا'' تم دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہی ہو پر موڈ سے ڈریکولا لگتی ہو''۔۔۔میرے چپ رہنے پر اسے مزید موقع مل گیا۔۔کہنے لگا۔۔'' زندگی کو خوشی خوشی گزارنا سیکھو لڑکی۔۔مشکل بننے سے زندگی بدصورت ہو جاتی ہے''۔۔ گھر آچکا تھا۔۔میں گاڑی سے اتر ہی رہی تھی کہ اس نے دروازہ تھام لیا۔۔اور بڑی رازداری سے کہا'' سنو لڑکی مجھے تمہارے ساتھ اپنی باقی کی ساری زندگی گزارنی ہے''۔۔ میں نے حیرانگی سے اسے دیکھا،اف اس کی آنکھوں کی بولیاں مجھے برف کر رہی تھیں۔۔ بڑی مشکل سے اپنے کمرے تک پہنچی۔۔۔۔۔۔'' جواب ادھار رہا''۔۔وہ جاتے جاتے کہہ گیا تھا۔۔اور میں جواب کی بجائے یہ سوچ رہی ہوں کہ میں مشکل نہیں ہوں۔۔۔بات یہ ہے کہ کوئی لڑکی کو سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔۔شاید تم بھی عام انسانوں کی طرح عورت کے ماتھے کے پیچھے چھوٹا سا سر دیکھنا چاہتے ہو یا پھر ایک ایسا روبوٹ چاہتے ہو جس کا معاشی،جسمانی،جذباتی کنٹرول تمہارے ہاتھ میں ہو۔

لیکن سنو۔۔میرے ماتھے کے پیچھے دماغ ہے جو اپنی ایک سوچ رکھتا ہے، میرے چہرے پر دو آنکھیں ہیں جو سارے موسموں کی رازدار ہیں۔۔۔میرے پاس دل ہے جو پھولوں کے دکھ تک سے واقف ہے۔۔میرے پاس زبان بھی ہے جو اپنے اور دوسروں کے حق کا دفاع کر سکتی ہے۔میرے پاس تعلیم بھی ہے جو مجھے بلندیوں پر لے جا سکتی ہے۔

رضوان تمہاری بات پر میں سوچ میں پڑ گئی ہوں۔۔کیا پڑھی لکھی لڑکیاں واقعی ''مشکل'' ہوتی ہیں۔۔۔۔؟

کاش تم نے یہ پوچھا ہوتا'' کیا تم اپنی باقی کی ساری زندگی میرے ساتھ گزارنا

پسند کرو گی۔۔؟"

30 اپریل 1986

سارے صفحے خالی پڑے تھے۔۔۔۔۔ میری زندگی کے خالی صفحوں کی طرح۔۔ میں ابھی تک حیران ہوں کہ امی جی اور ابا جی نے مجھ سے پوچھے بغیر رضوان کے ساتھ میرا ساتھ کیسے طے کر دیا۔۔۔ میں گم صم بیٹھی خود سے ہی پوچھ رہی ہوں۔۔ کیا میں رضوان کو قبول کر سکونگی۔۔؟ کیا یہ تعلق انسیت میں رچ بس کر محبت میں ڈھل سکے گا۔۔؟

کم از کم امی جی کو مجھ سے بات تو کرنی چاہیئے تھی۔۔۔۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ شاید۔۔۔

6 مئی 1986

خدایا میں کتنی خوش تھی کہ بایولوجی کے امتحانات ختم ہوتے ہی یونیورسٹی میں جاب مل گئی تھی۔۔۔ آج جب گھر واپس آئی تو رضوان ڈرائینگ روم میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں کھانا لے کر وہیں آ گئی۔۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے کتنے سکون سے مجھے کہہ دیا ''تمہیں جاب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔'' اور یہ بھی کہ ''شادی کے بعد کونسی نوکری کرنی ہے۔۔۔'' پھر یہ بھی کہ ''مزید پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔'' لیکن میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتی ہوں اور۔۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی بات مکمل کرتی وہ یوسف کے کمرے میں جا چکا تھا۔۔

میں سوچ رہی ہوں۔۔

نوکری کیا کسی معاشی کمی کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔۔؟

کاش رضوان تم نے ایسا نہ کہا ہوتا۔۔۔ میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔۔۔۔

میں سوچتی تھی تم مجھے کبھی بھی اپنے معاشی پروں میں چھپا کر ایک ہی موسم میں قید نہیں کرو گے۔۔ مجھے جذباتی آسودگی سے کبھی محروم نہیں کرو گے۔۔ پر ایسا کچھ نہیں ہوا، تم نے بھی نہیں سمجھا، عورت بہت مضبوط ہونے کے باوجود بہت کمزور بھی ہوتی ہے۔

آج بھی اسے وہی گھونسلے اچھے لگتے ہیں جسے اس کے مرد نے تنکا تنکا جمع کر کے اس کے لئے بنائے ہوتے ہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں تم نے مجھے چیلنج کی طرح قبول کیا ہو اور اب اپنی جیت کی فکر ہو۔۔ پر سنورشتے ایسے نہیں بنتے۔۔

لڑکیاں ''بیلوں'' جیسی نازک ہوتی ہیں۔۔ انہیں ان کی زمین سے جدا کرو گے تو وہ مرجائیں گی۔۔ انہیں خود سے اپنے گرد لپٹنے نہیں دو گے تو مرجھا جائیں گی۔۔

مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں دوریوں کے کہرے میں مجھ سے تمہارا روشن چہرہ گم نا ہوجائے۔۔۔۔۔۔

13 مئی 1986

آج رضوان کو مجھ سے خفا ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔۔ سوچتی ہوں اگر میری نوکری اور پڑھائی تمہاری عزت کا مسئلہ نا بنتیں تو یہ مسئلہ اتنا سادہ تھا کہ صرف باہمی بات چیت سے ہی سلجھ جاتا لیکن تم نے تو اپنی رفاقت کی شرط ہی یہی رکھ دی تھی۔۔۔ جانے مجھے کیوں لگ رہا ہے جیسے میری ڈگریاں، جدائیاں خریدلائی ہیں۔

یکم جون 1986

یکم جون مجھے ہمیشہ اپنی دوست فوزیہ کی جدائی کی یاد دلا جاتا ہے۔۔ دو برس پہلے شادی کے بعد وہ امریکہ کیا گئی جیسے کالے پانی کی سزا ہوگئی ہو۔۔ کبھی جو مڑ کر دیکھا ہو۔۔ سوچ رہی ہوں کہیں اس کو بھی کسی رضوان سے واسطہ نہ پڑ گیا ہو۔۔ یا اللہ خیر۔۔

4 جولائی 1986

پتہ نہیں کیوں گھر اور باہر کی مصروفتیں بڑھتی ہی جارہی ہیں۔۔ یوسف بھی کہہ رہا تھا کہ میں کسی کا خیال نہیں رکھ پارہی ہوں، سو مجھے نوکری چھوڑ دینی چاہئے۔ میں نے حیرانگی سے اسے دیکھا" کیا؟ پر اس کی آنکھوں میں ایک حتمی سا فیصلہ رکھا ہوا تھا'' جو وقت آپ نوکری میں گزارتی ہیں وہ ہم سب کو دیجئے نا آپا''۔۔ ارے۔۔ میرا ملک بھی تو میرا گھر ہے، میں اسے بھی سنوارنا چاہتی ہوں، خود کفیل بنانے میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتی

ہوں۔۔ پر یوسف میری بات سنے بغیر جا چکا تھا اور میں کتنی ہی دیر تک ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتی رہی جہاں آوازوں کے چہرے اگ رہے تھے۔۔ میری طرف بڑھ رہے تھے۔۔ یوسف کیا تم بھی۔۔؟ میں شاید بے یقینی کے عالم میں تھی۔۔۔۔ یا شاید ساکت ہو گئی تھی۔۔۔۔۔

کیا اس شہر میں صرف رضوان اور یوسف بستے ہیں۔۔ جو عورت کے شعور سے خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں کھولنے کی بجائے اسی کی آنکھیں بند کر دینا چاہتے ہیں۔

2 اگست 1986

بڑے دنوں بعد انکل حمید کی بیٹی جویریہ کا خط کیا آیا کہ دل کا موسم خوشگوار ہو گیا۔۔ ان کے گھر کے دالان میں باہر کی طرف کھلنے والے دروازے کے بائیں جانب لگی دیوار سے لپٹی بیل یاد آ گئی جس کا نام vintrumpet تھا پر ہم سب اس کے گھنٹی جیسے پھولوں کی وجہ سے "Flower"Bell کہتے تھے۔۔ بہت حسین بیل تھی، بہار میں ہوا کی ہلکی سی سرگوشی پر ایسے بل کھاتی کہ ڈھیروں ہلکے گہرے نارنجی پھول زمین پر گر جاتے۔۔ انکل حمید کو نارنجی پھولوں کا گرنا ''گند'' لگتا تھا۔۔۔ پھر آئے دن بیل فلاور کے سوکھ جانے سے بھی تنگ رہتے تھے۔۔۔ ان کے خیال میں بکھیڑے بڑھانے والی کسی چیز کو گھر میں تو کیا زندگی میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ خط کے آخر میں جویریہ نے لکھا تھا'' ابو جی نے بیل فلاور کو بھری بہار میں جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔۔ اب یہ الگ بات کہ وہ اس کے بعد بے حد اداس رہنے لگے ہیں۔۔ کہتے ہیں کہ بیل فلاور نہیں ہے تو لگتا ہے جیسے کوئی کام ہی نا بچا ہو۔۔ آج کل گھر کی بے رونقی ختم کرنے کی ہر ممکن تدبیریں کرتے رہتے ہیں۔۔۔ دعا کرو ہم سب بیل فلاور کی جدائی کے عادی ہو جائیں۔۔

ہائے۔۔ مجھے کیوں ایسا لگ رہا ہے جیسے بیل فلاور'' میں'' ہوں اور انکل حمید کی طرح سب میرے ہلکے گہرے نارجی پھولوں کی بہار کو بکھیڑا سمجھ کر جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔۔!

20 اگست 1986

بی بی جی کے بغیر یہ پہلا رمضان تھا۔۔ اور ہم سب ان کے بغیر ادھورے اور اداس تھے۔ کتنے اہتمام سے وہ سحر سے شام کرتی تھیں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے ان کے جانے کے بعد سورج نے ہنسنا اور چاند نے مسکرانا چھوڑ دیا تھا۔ سارا میل سنگ جیسے ختم سا ہوتا جا رہا تھا۔۔ کیا واقعی ہمارے گھر سے برکتیں اٹھ رہی تھیں۔۔۔ مجھے پیار سے گلے لگا کر اکثر کہا کرتیں'' میری بیٹی پڑھ لکھ کر بہادر بنے گی''۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔۔ ہائے میری بی بی جی۔۔ وہ جان ہی نا پائیں کہ پڑھی لکھی لڑکی اور بہادری میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔

بی بی جی کو کیسے بتاؤں کہ ابا جی نے بھی انکل حمید کی طرح مجھے بیل فلاور کی طرح جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ کاش آپ ہوتیں تو بیل فلاور کو بچا لیتیں۔۔

5 ستمبر 1986

ابا جی کی سالگرہ میں رضوان کئی ہفتوں بعد گھر آیا تھا۔۔ کئی بار اس نے مجھے شاکی نظروں سے دیکھا۔۔ مجھے یوں لگا جیسے کہہ رہا ہو'' مرد کے لیئے عورت کی برتری تسلیم کرنا سب سے مشکل ہوتا ہے۔۔۔ مان جاؤ۔۔ پلیز۔۔ ورنہ میرے اندر کا آدمی ''جدائی'' لکھ دے گا۔۔۔ شاید وقت بھی یہی لکھ رہا تھا جب ہی تو تمہیں میری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔۔ میں تم سے کہہ رہی تھی'' اگر میں ہار گئی تو کوئی بیل فلاور کو اپنے گھر بسنے نہیں دے گا''۔۔۔

20 ستمبر 1986

امی جی بتا رہی تھیں تمہارے گھر والے امریکہ سے ہمیشہ کے لئے واپس آ رہے ہیں اور وہ ہمارے رشتے کا باقاعدہ اعلان کرنا چاہتے ہیں۔ مگر پتہ نہیں کیوں یہ اعلان بار زیست لگ رہا ہے۔۔۔ سوچ رہی ہوں جب دو لوگ مل کر اپنا گھر بناتے ہیں تو ان کے دکھ سکھ سانجھے کیوں نہیں رہتے۔۔ ہر بار بیل فلاور کو ہی کیوں جڑ سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے۔۔؟

25 ستمبر 1986

کچھ دن پہلے یوسف بتا رہا تھا کہ رضوان نے گلشن اقبال میں گھر لے لیا ہے اور آجکل اسے بڑی محنت سے سجا سنوار رہا ہے۔جس کی اس نے بہت تعریف کی تھی۔آج یونیورسٹی سے واپسی پر رضوان کو گھر پا کر کچھ خوشگوار سی حیرت ہوئی۔۔میری مبارکباد پر شکریہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے ہی مخاطب تھا۔۔''پھر تم نے کیا سوچا ہے''۔۔میں پہلے تو چونکی پھر جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی اور کہہ دیا

''وہی جو پہلے سوچا تھا''۔۔

''سنو تم اس کو اپنی ضد بنا رہی ہو''۔۔رضوان کی ترش آواز پر میرے حلق تک کرواہٹ اتر آئی تھی۔۔

تمہیں یاد ہے رضوان تم نے کبھی کہا تھا'' پڑھی لکھی لڑکیاں گھریلو نہیں ہوتیں، نوکری انہیں بدتمیز اور گستاخ بنا دیتی ہے،اور بلاوجہ کی خود اعتمادی انہیں مغرور کر جاتی ہے، اس لئے وہ کبھی اچھی بیوی اور دوست نہیں بن سکتیں''۔۔۔۔۔۔میرے لہجے کی کاٹ نے تمہاری آواز کو نگل لیا تھا۔۔''لیکن وہ باتیں تمہارے لئے نہیں تھیں۔۔'' تم نے آہستگی سے کہا اور خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔۔رضوان۔۔مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتبار ہی نہیں ہے۔۔بے اعتباری سے دوستی اور محبت کی دیواریں نہیں اٹھائی جاسکتیں۔۔۔بیل فلاور کی جڑیں کاٹ دو گے تو پھول کیسے برسیں گے۔۔۔نوکری اور تعلیم میری انا کا مسئلہ نہیں ہے۔۔میرا مسئلہ تمہاری دورخی ہے۔ایک طرف تم کہتے ہو عورت کی'' حیا'' چادر اور چار دیواری کی محتاج نہیں ہے اور جب اپنی باری آتی ہے تو کہتے ہو نوکری'' بے حیائی'' سکھاتی ہے اور'' زیادہ تعلیم'' گستاخ بنا دیتی ہے۔خدا کے لئے مجھے سولہ سو سال پرانی عورت نا بناؤ۔۔مجھے زمین میں زندہ مت گاڑو۔۔مجھ سے میرے ہونے کا یقین مت چھینو ورنہ مجھے عورت کی حیا۔۔اور اس کے وقار و اعتبار کے لئے تمہیں چھوڑ کر کسی ایسے شخص کا انتظار کرنا ہوگا جو میری سوچ کے ساتھ پرواز کرے۔۔مجھ سے نظریاتی مفاہمت رکھے۔۔مجھے وہ عزت دے جس کی میں حقدار ہوں۔۔

سچ شاید یہی تھا کہ میں تمہاری ''مشرقی بیوی'' کے معیار پر پورا نہیں اترتی۔۔ سوچونا۔۔ پھر یہ بات کیسے ممکن ہو۔۔؟

10 اکتوبر 1986

میرے انکار کی آہ و بکاہ میلوں میل پھیل چکی تھی۔۔۔ نہیں جانتی رضوان میرا دل کیوں بیٹھے جا رہا ہے۔ جس حوصلے سے میں تمہیں چھوڑ آئی ہوں اتنی ہی شدت سے اب رونا چاہتی ہوں۔۔ محبتوں نے کب کوئی دلیلیں مانی ہیں۔۔ اس کے رواج تو صدیوں سے ایک ہیں۔۔

20 نومبر 1986

آج میں سب کی مخالفت کے باوجود کینیڈا میں ''بیل فلاور ریسرچ'' کے لئے اپلائی کر رہی ہوں۔۔ امی جی نے حتمی رائے دیدی کہ وہ مجھے کبھی اکیلا نہیں جانے دیں گی۔۔ اور میں فارم بھرتے ہوئے ہنس پڑی ہوں۔۔ ہم پڑھی لکھی لڑکیاں واقعی گھر والوں کے لئے عذاب ہی تو ہیں۔۔۔

3 دسمبر 1986

انکل حمید کا خط آج ایک عرصے کے بعد آیا تھا، پڑھ کر حیران ہی تو رہ گئی۔۔ انہوں نے لکھا تھا'' تم بہت یاد آتی ہو۔۔ تمہارے ساتھ ہنگامے جو چلے آتے ہیں۔ اب تو گارڈینا کی باڑ بھی قد میں تم سے بڑی ہوگئی ہے۔ موتیا گلاب بھی تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔۔۔۔ پر انکل جی آپ نے بتایا نہیں بیل فلاور کو جڑ سے اکھاڑ کر آپ کو کیا ملا۔۔؟

کاش۔۔ ہم درختوں، پودوں، پھولوں، بیلوں کی حفاظت کر پاتے۔۔۔۔ تو۔۔۔ ہماری دنیا کتنی مہکی اور خوش رنگ ہوتی۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔ عورت بھی اس دنیا کا خوش رنگ حصہ ہوتی۔۔۔

10 دسمبر 1986

دو دن بعد مجھے کینیڈا کے لئے روانہ ہونا ہے۔۔ امی جی کئی دنوں سے چپکے

چپکے روئے جا رہی ہیں۔ اور کئی بار کہہ چکی ہیں ''اولاد آزمائش ہی تو ہے''۔۔ سچ کہا امی جی۔۔ پر میرے لئے بھی یہ فیصلہ کچھ آسان نا تھا۔۔ یوں جیسے دو دھاری تلوار پر چلی ہوں۔۔ کل یوسف نے کتنی محبت سے کہا تھا'' آپا اچھے لوگ کیوں جدا ہو جاتے ہیں؟''۔۔ میں اسے بتانا چاہتی تھی ''ناقدری'' کا دوسرا نام جدائی ہی تو ہے۔۔ پر کہہ نا پائی۔ جیسے جیسے جانے کا وقت قریب آ رہا ہے، میں جیسے ہمت ہارتی جا رہی ہوں پر مجھے جانا ہے۔۔ ان لوگوں سے ملنا ہے جو بیل فلاور کو اپنے گھروں کی رونق بناتے ہیں۔۔ کاش میں اپنے لوگوں کو یہ بات سمجھا پاتی کہ ہمیں خوش اور خوشحال رہنے کے لئے بیل فلاور کو خوشدلی سے اپنے گھروں میں جگہ دینی ہوگی۔۔۔

ارے۔۔ آپ کے پاس آپا کی ڈائری۔۔۔۔ یوسف نے حیرانگی سے رضوان کے ہاتھوں میں ہلکے میرون کور والی ڈائری دیکھی جس کا آخری صفحہ کھلا ہوا تھا

یوسف اپنی آپا کے جانے کا مجھے کیوں نہیں بتایا۔۔؟ رضوان کی آواز جیسے کہیں ڈوب رہی تھی۔

انہوں نے منع کر دیا تھا۔۔ وہ لاپرواہی سے بولا اور اس کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اچھا کیا تھا اس نے۔۔ رضوان نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔۔ پر خاموش رہا میرا خیال ہے کہ لنچ کے لئے باہر چلتے ہیں۔۔ رستے میں آپا کو ان کی ڈائری بھی پوسٹ کر دیں گے۔۔ جب بات کرتی ہیں، تاکید کرتی ہیں۔ یوسف نے طویل ہوتی خاموشی کو بڑے سلیقے سے توڑتے ہوئے کہا اور ڈائری لے کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ رضوان خاموشی سے اٹھا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر دھیرے سے مسکرا دیا اور یوسف کے کمرے کی طرف منہ کر کے اسی تازگی سے آواز لگائی جیسے پہلے لگایا کرتا تھا۔۔'' جلدی کریار۔۔ تم کو پوسٹ آفس ڈراپ کرنے کے بعد مجھے بیل فلاور کے بیج بھی خریدنے ہیں۔۔۔ یوسف اس کی پہلے جیسی زندگی سے بھرپور آواز سن کر خوشی سے دوڑتے ہوئے گاڑی میں آ کر اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے رضوان سے پھر پوچھا'' آپ کو آخر آپا کی ڈائری ملی کہاں سے۔۔۔؟"

رضوان نے گردن موڑ کر ایک سیکنڈ کے لئے اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ اپنی نظریں سڑک پر جماتے ہوئے آہستگی سے کہا'' کیا فرق پڑے گا یار اب یہ سب جان کر۔۔۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ ڈائری ملی، پر ملی بڑی دیر سے''۔۔

☆☆

انقلاب فرانس اور خواتین:

انقلاب فرانس کے وقت تک حالات بہت تبدیل ہو چکے تھے۔ انقلابی سوچ کے ساتھ سماجی شعور بلند ہو چکا تھا۔ ہر انقلاب کا عمومی قانون یہ ہے کہ جب تک انقلابی تحریک تھک کر پیچھے کی جانب چلنا شروع نہیں کرتی زیادہ بنیاد پرست رجحانات، اعتدال پسند رجحانات کی جگہ لیتے ہیں۔ یہ ہر بورژوا انقلاب کا ناگزیر مقدر ہے۔ عوامی جوش و ولولہ اُس وقت ختم ہو جاتا ہے جب اُن کی غلط فہمیوں اور تحریک کی حقیقی طبقاتی نوعیت کے درمیان تضاد واضح ہو جاتا ہے۔ فرانس کی انقلابی تحریک میں طبقاتی تفریق شروع دن سے ہی واضح تھی۔ گرونڈنز Girondins بورژوا رجحان کی نمائندگی کرتے تھے جو ادھورا انقلاب کر کے، بادشاہ کے ساتھ معاہدہ کر کے آئینی بادشاہت قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ انقلاب کے لیے جان لیوا ثابت ہوسکتا تھا کیونکہ عوام نے میدان میں آ کر انقلابی طریقہ کار کے ذریعے رجعت کے ساتھ حساب بے باق کر کے ہی برتری حاصل کی تھی۔ یہ عوامی بیداری ہی تھی، جس نے پرانے نظام کو ختم کر کے انقلاب کی فتح کو ممکن بنایا۔ عمومی طور پر یہ بات محسوس نہیں کی جاتی کہ انقلاب فرانس اور انقلاب روس دونوں میں خواتین نے قائدانہ کردار ادا کئے۔ عورتوں نے اپنے طبقے پر ہونے والے جبر کے خلاف بغاوت کی تھی۔ پیرس کی عام اور نیم پرولتاری خواتین جنہوں نے 1789 انقلاب کا آغاز کیا تھا، اگرچہ روٹی کے مسئلے پر اُٹھی تھیں نہ کہ عورت پر ہونے والی جبر کے مسئلے پر۔ لیکن بعد میں انقلاب کے دوران فطری طور پر یہ مسئلہ بھی اُٹھایا گیا۔ اگرچہ عام سوسائٹیز اور کلبوں میں خواتین کو شامل نہیں کیا گیا تھا لیکن اُنہوں نے بغاوتوں میں بہت اہم کردار ادا کئے۔ خاص طور پر اکتوبر 1789ء، 10 اگست 1792ء اور سب سے بڑھ کر 1795ء کی بغاوت میں۔ حتیٰ کہ بنیاد پرست خواتین نے بھی ووٹ کے حق کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ اٹھارویں صدی میں رائج جنسی امتیاز کے وہ حالات تھے جو مردوں کو گھر سے باہر اور عورتوں کو نجی معاملات تک محدود کرتے تھے۔ اُنہوں نے خواتین کی مقبول عام انجمنیں

شاہین کاظمی

پانچواں موسم

آبائی وطن۔ پاکستان
مقیم۔ سوئٹزرلینڈ
پیشہ۔ درس وتدریس

پاک وہند کے کئی معتبر رسائل وجرائد فنون، ادبِ لطیف لاہور، اجراء کراچی، ماہِ نو لاہور، سرگزشت کراچی، آبشار پاکستان، استفسار انڈیا، ثالث انڈیا اور چند ہندی جرائد میں افسانے شائع ہوئے، ریڈیو سے بھی کئی افسانے نشر ہوئے، انڈیا سے محترم شموئل آحمد کی کتاب ''پاکستان ادب کے آئینے میں'' میں چنیدہ نثر نگاروں کے سولہ افسانے شامل کیے گئے ان میں ان کا افسانہ ''برزخ'' بھی شامل ہے۔

.....

بارش اب بھی زوروں پر تھی، اندھیرے میں بجلی کے کوندے زمین کی طرف لپکتے دکھائی دینے لگے، اس نے گہرا سانس لے کر روشن گل کی اور سونے کے لیئے کمرے میں چلی آئی، ہاتھ میں پکڑی کتاب بستر پر رکھ کر پردے برابر کرنے لگی، چاند پورا تھا نیند جانے کہاں رہ گئی تھی، اس نے بے خیالی میں ورق پلٹا

''پانچواں موسم،،

''زندگی میں پانچواں موسم اُترے تو اُس کا حسن معدوم ہونے لگتا ہے، راستہ

کوئی بھی ہو غبار اُٹھتا ہی ہے، انگور کی بیلوں پر سانپ چڑھ جائیں تو شراب زہریلی ہو جاتی ہے، شبِ فتنہ کب کٹے گی؟ میرے آنگن میں کھلے گلِ لالہ پر بارود کی راکھ پڑی ہے، تم چراغ بجھتے تک لڑتے رہنا،،

اس نے کتاب بند کر دی، ذہن کہیں اور بھٹک گیا تھا

،،تمہیں لڑنا ہوگا، میرے لئے، اِس مٹی کے لئے،،

اس کچے سے کمرے کے ایک کونے میں جھلنگا سی چارپائی پر پڑے وجود میں اگر کچھ زندہ تھا تو اُس کی نیلگوں سمندروں جیسی آنکھیں، یہ ماجد کی ماں تھی

،،مجھ سے وعدہ کرو تم لڑو گے، جب تک ساری بلائیں ختم نہیں ہو جاتیں تم لڑو گے،، بوڑھے سرد ہاتھ ماجد اور نوما کے ہاتھوں پر جمے ہوئے تھے، آنکھوں میں ابھرتی، ڈوبتی حسرت اور اُمید، ماجد کا سر بے اختیار ہاں میں ہل گیا،

،،ہم لڑیں گے ماں آخری دم تک لڑیں گے،، ماجد کی آواز سن کر بوڑھے نیلگوں سمندروں میں جوار بھاٹا اٹھنے لگا، ماجد جانتا تھا اِن نئے بدیسی بھیڑیوں سے لڑنا آسان نہ ہوگا، جبکہ دھرتی کے سینے پر روبل کی تال پر رقص کرتے سؤروں کے لگائے زخم ابھی تازہ تھے، سؤروں کو دھرتی سے باہر ہانک تو دیا گیا تھا، لیکن امن واپس نہ آسکا، چاند ابھرا تو نئے بھیڑیئے کھپاؤں سے باہر نکل آئے، اِن کے لے پالک نے جب ڈوریاں توڑ کر اپنے آزادانہ رقص کا آغاز کیا تو تانیکہ کی تیوری چڑھ گئی، اُس کی نظروں کا زاویہ بدلا تو وہی لے پالک جو بہت چنیدہ تھے نظروں سے گر گئے لیکن انھیں بھی پروا کب تھی، انھوں نے نئی تال چنی اور دھمال شروع ہو گیا، بندوقوں کے سائے میں ابھرتے نغموں میں سوز اُمڈ آیا، لہولہان دھرتی دم بخود تھی ہر طرف بہنے والا خون اپنا تھا۔

جنت کی اور جاتی پگڈنڈیوں پر جب موت اُگنے لگی تو ایک دن وہ اپنے بچے کی انگلی تھامے وہ وہاں سے نکل پڑی

،،چلو میرے ساتھ،، اس نے ماجد کا ہاتھ تھام لیا

،،نہیں جا سکتا،،

''کیوں؟،،

''ماں سے کیا وعدہ نبھانا ہے،،

''کس سے لڑو گے؟ جب دونوں اطراف اپنا ہی سینہ ہو بندوق کس پر چلے گی،، اِس کے لہجے میں دکھ تھا

لیکن وہ غلط تھی، بندوق کی نال شرارے اُگل رہی تھی، سؤروں کی جگہ بھیڑیئے شہر میں دندنانے لگے، اُس نے ایک بار مڑ کر دیکھا شہر ملبے کا ڈھیر تھا، اپنے آنسو چھپاتے ہوئے وہ قافلے کے ساتھ ہو لی، یہ اعلیٰ سالاروں کا قافلہ تھا ہو سمندر پار جا کر رکا، ماجد کے بغیر زندگی مشکل ضرور تھی ناممکن نہیں، جلد ہی زندگی میں رچاؤ آنے لگا

محبت کے شیریں ہونٹوں سے
پھوٹنے والے نغموں کی مدھر لے
آتش شوق بھڑکا دیتی ہے
جیسے خشک گھاس میں گرنے والی ننھی سی چنگاری
زخمی کونج کی پکار
روح میں اُتر رہی ہے
دن رات کے سینے میں جذب ہو رہا ہے
مجھے دیدار کی مے دو
کہ پیاس بڑھ رہی ہے
محبت اگر دلوں میں حلاوت نہ جگائے
تو اِس کے اجزاء میں پاکیزگی ترتیب
اُلٹ گئی ہے
چاند کی ساحر کرنیں
پھول پر منعکس ہیں
زیست انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی ہے

سچے سُر کے لئے من کا اُجلا ہونا ضروری ہے
من میں کدروتوں کا میل سُر گدلا کر دیتا ہے
اور وہ محض کانوں میں اٹک کے رہ جاتا ہے
اگر سُر من میں اُجالا نہ پھونکے
تو اِس کے اجراء میں پاکیزگی کی ترتیب اُلٹ گئی ہے،

نوجوان شاعر کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا، دھماکے سے در و دیوار لرز اٹھے تھے، وہ تیزی سے اٹھا اور پتھریلی دیواروں والے سرد تہہ خانے کے کونے میں دھری اکلوتی موم بتی گل کر دی، اچانک اُسے اپنے ہاتھوں پر ننھے ننھے سرد ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا، یہ نوما تھی اُس کی بھوری آنکھوں میں خوف تھا، جنگی جہاز سے گرنے والی موت نے زندگی سے موت کو جاتی سرحد پر بھیڑ جمع کر دی، بدن ٹکڑوں میں بٹنے لگے نوما کو سینے سے لگائے وہ ٹھنڈی دیوار سے ٹیک لگائے ساکت بیٹھا تھا، چھوٹے سے روشن دان کے ٹوٹے شیشے سے شمالی ہوا برف کے ذرات اندر اچھال رہی تھی، اُس نے ٹٹول کر پرانا کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا۔

اچانک خاموشی چھا گئی، شاید جہاز واپس جا چکے تھے، نوما بھی سو گئی تھی، اُس کے سانسوں کی ہلکی سی آواز تہہ خانے کے بھیانک ماحول میں بھلی لگ رہی تھی لطف اللہ نے اُسے بستر پر لٹا دیا، اُس کے گالوں پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ اس نے اپنی ادھوری نظم پھر سے لکھنے کی کوشش کی لیکن ذہن منتشر تھا ساتھ نہ دے سکا، کاغذوں کے پلندے میں بہت سی آدھی ادھوری نظمیں اور گیت مکمل ہونے کے منتظر تھے، بالکل اُس کی ادھوری زندگی کی طرح۔

''مجھے لکھنا ہے اِس سے قبل کہ وقت کے کھنڈر میں زندگی کی چاپ معدوم ہو جائے مجھے لکھنا ہے، وہ بہت تیزی سے صفحے الٹ پلٹ رہا تھا۔

''آنے والوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ ہم کس کرب سے گزرے ہیں، میں جانتا ہوں اچھا وقت دور نہیں، اس نے نوما کو دیکھا جو ابھی تک سو رہی تھی

''سوتی رہو میری گڑیا، دنیا دکھوں سے بھر گئی ہے، موت زندگی پر پنجے گاڑے ہوئے ہے، یہ سب کچھ تمہارے دیکھنے کے لائق نہیں ہے، سوتی رہو میری گڑیا'' اُس کی خود کلامی جاری تھی۔

''لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ دشمن دروازے پر بیٹھا ہو تو کیسا لگتا ہے، جب رگوں سے زندگی نچڑ رہی ہو تو سانس سینے میں اٹک جاتی ہے، میری باتیں ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی، تم زندگی کو اپنے انداز سے دیکھو گی لیکن نوشتہء دیوار بھی پڑھنا ہوگا، زندگیوں میں اندھیرے در آئیں تو اُمید مرنے لگتی ہے، کسی کو جگنوؤں کی کھوج میں نکلنا ہوگا''

سائیں سائیں کرتی ہوا مردہ تنوں کی باس لئے گلی کوچوں میں کرلا رہی تھی، وہ بس خالی خالی نظروں سے کاغذوں کو گھورتا رہ گیا۔

اُس کی آنکھ کھلی تو روشن دان سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آرہی تھی، اُس نے کھونٹی پر لٹکی میلی سی جیکٹ چڑھائی اور ملبہ ہٹاتے ہوئے باہر رینگ آیا، رات ہونے والی بمباری نے بہت تباہی مچائی تھی، ہر طرف گہرا سکوت تھا، کھانے کی تلاش میں جیسے ہی وہ نکڑ مڑا گلی کے کونے پر بکتر بند گاڑیوں کے ساتھ فوجیوں کا دستہ دیکھ کر ٹھٹھک گیا، وہ تیزی سے پلٹا لیکن فوجی اُسے دیکھ چکے تھے، تڑتڑ کی تیز آواز کے ساتھ اُسے اپنے شانے اور کمر میں آگ اُترتی ہوئی محسوس ہوئی، وہ وہیں ملبے پر ڈھیر ہو گیا، آخری خیال جو اُس کے ذہن میں آیا وہ نوما کا تھا۔

ہر شام اپنے گھونسلوں میں لوٹتی چڑیاں بہت شور کرتیں، وہ اِس شور کا عادی تھا لیکن کبھی کبھی جانے کیا ہو جاتا، شور اعصاب پر کوڑے برسانے لگتا، اور انتہائی بے چین ہو کر چڑیوں پر برس پڑتا، آج بھی اسی کیفیت کا شکار تھا، بیئر کا آخری گھونٹ گلے میں اتار کر اِس نے بوتل کو پوری طاقت سے درخت کے تنے کی طرف اچھالا اور گالیاں بکنے لگا، پارک کے داہنی طرف پرانے بینچ پر لیٹا ہوا بوڑھا ایک دم چونک کر اٹھا، کچھ ناقابل فہم انداز میں بڑبڑایا اور پھر سے لیٹ گیا، اندھیرا پھیلتے ہی چڑیوں کا شور تھمنے لگا، بوڑھا بھی

پرسکون ہو گیا، چاند نے ہولے سے زمین پر جھانکا تو چاندنی کھلکھلا کر گھاس پر رقص کرنے لگی، بوڑھے نے اپنے تھیلے سے پرانا سا وائلن نکالا اور بجانے لگا، اس کی ٹھٹھری ہوئی موٹی بھدی انگلیوں میں دبی وائلن کی سٹک بہت خوبصورتی سے تاروں پر رواں تھی۔

منڈیروں پر اونگتے چراغ بجھ جائیں تو موت کے مہیب سائے در و دیوار پر منڈلانے لگتے ہیں

مسافر راستہ کھوٹا کر لیتے ہیں
اُن میں لہو ڈالتے رہو
کہ روشنی
زندگی کی علامت ہے

بوڑھے کی آواز میں عجیب سا سوز تھا، اس کے سال خوردہ چہرے کا ملال بتا رہا تھا کہ زندگی نے اُس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا، یہ ملال وائلن سے پھوٹتے نغموں سے بھی عیاں تھا، گیت کی دھن بہت عام فہم نہ تھی، لیکن پارک سے گزرنے والے اُسے جانے کب سے سن رہے تھے، بوڑھے کے سامنے پڑے گلاس میں سکے گرتے رہے اجنبی دھن پر بجتے نغمے کے سُر فضا میں بکھرتے رہے، بوڑھے نے سکّوں والا خالی کیا اور دوبارہ وہیں رکھ دیا، وائلن درد اگلتا رہا، گھنے پیڑوں کی اوٹ سے افسردہ چاند جھانکتا رہا اور رات دھیرے دھیرے بھیگتی رہی۔

''مٹی کا نوحہ کون لکھے گا؟

جب بیٹے ماں کی چادر نوچ لیں تو کیا قیامت نہیں آئے گی؟
سفید پھولوں کے باغ میں سوَر چرنے لگے ہیں
چولہے پر دھرا کھانا پختہ ہونے کے انتظار میں ہے
لیکن آگ چولہوں میں نہیں شہروں میں بھڑک رہی ہے
مسافر تمہارا سفر کب تمام ہوگا؟

نہ ہی سفر تمام ہوتا ہے اور نہ ہی وحشت کبھی سیراب ہوتی ہے، اچانک اٹھنے

والی آندھی سب کچھ لپیٹ میں لے کر سارے منظر دھندلا دیتی ہے، اُس دن بھی لمبے انتظار کے بعد بھی لطف اللہ نہ پلٹا تو نوما اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل آئی، ہر طرف سؤر دندناتے پھر رہے تھے، بدن بدن بٹتے ہوئے محض دس سال کی عمر میں وہ بہت کچھ سمجھنے لگی تھی، وجود کی ناؤ کا ناہموار بہاؤ، ہچکولے انگ انگ توڑ دیتے ہیں، آنے والا ہر نیا مسافر ناؤ میں اپنے انداز میں سوار ہوتا ہے، جب تک لنگر آنکڑے میں پھنسا ہو ناؤ حرکت نہیں کر سکتی، وہ بھی جال میں پھنسی مچھلی کی طرح تڑپ سکتی تھی لیکن آزادی اُس کا مقدر نہیں تھی، لیکن پھر ایک دن اچانک لنگر اُٹھا دیا گیا، یا شاید گھاٹ بدل دیا گیا تھا، اب ایک مسافر تھا اور وہ، رات دن اُسے ڈھوتے ڈھوتے اُس کی ہمت ٹوٹنے لگی، کچے پھل سخت اور کڑوے ہوتے ہیں لیکن اِس کے باجود کچھ لوگ اِن میں دانت گاڑ دیتے ہیں چاہے بعد میں تھوکنا پڑے، لیکن نہیں وہ شاید کم عمری میں ہی گدرا گئی تھی، اس لئے تھوکنے کی نوبت کم ہی آتی، البتہ اِس نے تھوکنا سیکھ لیا، بھاری بوٹوں کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی اِس کی تھوکنے کی عادت نہ گئی، پھر ایک دن اچانک وہ اکلوتا مسافر ایک ایسے گھاٹ پر اُتر گیا جہاں سے آگے کا سفر ممکن نہ تھا، نوما نے اُس کے سرد بے جان چہرے کو دیکھا تو اُبکائی روکنا مشکل ہو گیا۔

''دیکھو چھوٹی لڑکی انجانی منزلوں کا سفر آسان نہیں ہوتا، پاؤں میں تھکن اُتر آتی ہے، لیکن چلنا تو پڑتا ہے، ورنہ چاند پورا ہونے پر بھیڑیئے اپنی اپنی گپھاؤں سے نکل آتے ہیں، انھیں تازہ نرم گوشت میں دانت گاڑنا پسند ہے اُن کی غرّاہٹیں سانسیں توڑ دیتی ہیں لیکن تم ڈرنا مت،، کہیں بہت قریب کوئی جانی پہچانی سرگوشی اُبھری، گ وہ بہت چھوٹی تھی لیکن ذہن کے کسی گوشے میں الفاظ جیسے پیوست ہو گئے تھے، اِس کی آنکھوں میں نمی اُبھرنے لگی، اُسے انجانی منزلوں کی طرف جانا تھا، ہوا میں خون اور بارود کی بُو رچی ہوئی تھی ''لیکن مجھے ڈرنا نہیں،،

وہ دھرتی کو اِس سؤروں سے پاک کرنے کے لیے مجاھدین سے جا ملی،

''میں اکیلا فیصلہ نہیں کر سکتا اِس وقت اپنے سائے پر بھی بھروسہ کرنا مشکل ہے

تم انتظار کرو''

''کب تک؟'' اُس کی آواز میں بیقراری تھی

''ربانی کے آنے تک'' امین وردک آگے بڑھ گیا

کئی چاند اُبھرے اور ڈوبے، سؤر کھیت کھلیان تارج کر رہے تھے، موت کا رقص جاری رہا، اندھیرے بڑھنے لگے، لوگ کم ہوتے جا رہے تھے، ربانی نے اُسے مجاھدین میں شامل ہونے کا عندیہ دے دیا تھا، کہ وہ بدیسی سؤروں کی زبان بہت روانی سے بولتی تھی لیکن اُس کی کوکھ میں پلتا بچہ جسے وہ سفید سؤر کا بچہ کہتی تھی اُس کی راہ روکنے لگا۔

گھپاؤں کے در بند کرنے ہوں گے
ورنہ اندر پلتی بلائیں آبادیاں نابود کر دیں گی
چاندنی کا سحر دماغ اُلٹ دیتا ہے
جنت کی طرف جاتی پگڈنڈیوں پر
موت اُگنے لگے تو
پہچان کم ہو جاتی ہے
وقت کے ہاتھ لکھنے میں مصروف ہیں
الفاظ شرمندگی میں ڈھلتے جاتے ہیں

شہر میں چاند اُبھر آیا تھا، بہت عجیب سا چاند، سحر زدہ کر دینے والا، لوگ بے سدھ ہونے لگے، ماجد ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اُس کے جسم میں تشنج اور اینٹھن تھی یکا یک اُس کی انگلیوں کے سروں پر نوکیلے ناخن نمودار ہونے لگے، چند لمحوں بعد اس نے اپنی لمبی تھوتھنی اوپر اٹھائی اور ہووووو کی لمبی آواز کے ساتھ آبادی کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، اُس کے تیز نوکیلے دانے چمک رہے تھے، اُس کے ساتھ اُس جیسے اور بھی کئی تھے، گھپاؤں کے در بند نہیں کئے جا سکے تھے، پھر ہر روز اُن میں اضافہ ہونے لگا، خونخواریاں بڑھنے لگیں صدیوں سے سیف الملوک میں رقص کرتی پریوں کے گھنگھرو توڑ دیئے گئے آدمی کی جون بدلنے لگی چاند پورا ہوتے ہی گھپاؤں سے نکلنے والے اپنے نوکیلے دانت اور پنجے نکال کر

بھیڑیئے بن جاتے اور اپنے ہی ہم جنسوں کو بھنبھوڑنے لگتے، قندھاری اناروں سے ٹپکتا لہو سیف الملوک میں بھرنے لگا، اب کی بار بھیڑیئوں کے جسم سے اٹھتی باس پرائی نہ تھی۔

اُس ڈھلتی شام پارک میں وائلن پر بجتی دھن نے اُس کے قدم روک لیے، دل اتنی زور سے دھڑکا کہ قیامت اُٹھا دی، وہ یہاں اِس شہر میں اپنے کسی پرانے ساتھی سے ملنے آئی تھی، اُس کا وطن میں رہ گئے ساتھیوں سے رابطہ کبھی نہیں ٹوٹا تھا، وہ اپنے بیٹے کو ساری عمر سفید سوٗر کا بچہ کہتی اور سمجھتی رہی، اور اُس روز اُس دوست کے کہنے پر اُسے بلا جھجھک آگ میں جھونک دیا، آج اُس کی موت کی اطلاع جانے کیوں اُسے بے چین کر گئی، تیسری نسل کا لہو بھی دھرتی کے چاک رفو نہیں کر پایا تھا، بوڑھا گا رہا تھا۔

''جب عہد فراموش کر دیئے جائیں
محبت مر جائے
یقین باسی ہو جائے
قدم اجنبی سمتوں میں اُٹھنے لگیں
مٹی سے دغا عام ہو جائے
تو جان لو
کہ زندگی کے اجزاء میں
پاکیزگی کی ترتیب اُلٹ گئی ہے

''لطف اللہ؟،، وہ دوزانو بوڑھے کے پاس بیٹھ گئی اُس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے، بوڑھے کی موٹی ٹھٹھری ہوئی انگلیوں میں دبی سٹک ہوا میں معلق رہ گئی

''کون؟'' اُس کی آواز میں لرزش تھی

''میں نوما'' سٹک گر چکی تھی بوڑھے کا پورا وجود زلزلے کی زد میں تھا

''نہیں میں اسماعیل خان، لطف اللہ تین گولیاں کھا کر کچھ دن زندہ رہ سکا

''لیکن تم نے یہ گیت کہاں سے سیکھا؟ یہ تو لطف اللہ کا لکھا ہوا ہے''

''یہ تمہاری امانت، لطف اللہ نے مرتے وقت تمہیں دینے کو کہا تھا'' بوڑھے

نے ایک پرانی ڈائری نوما کی طرف بڑھائی

''جانے کب سے لئے پھر رہا ہوں، لگتا نہیں تھا کہ میں امانت حق دار کو پہنچا سکوں گا'' اِس نے ڈائری تھام لی، ٹھنڈ اور اندھیرا تہہ خانہ اچانک روشن ہو گیا،

''چاچا''، ننھی نوما کے ہاتھ سرد اور آنکھیں خوف سے بھری ہوئی تھیں نو سال عمر ہی کتنی ہوتی ہے، ماں باپ اور بہن بھائیوں کی کٹی پھٹی لاشیں اُسے آسیب بن کر چمٹ گئی تھیں

''کچھ نہیں ہوگا میں ہوں نا'' لطف اللہ نے اُسے سینے میں چھپالیا، بابا کی مہک نتھنوں سے ٹکرائی تو آنکھوں میں نمی اترنے لگی

''تم کیا لکھتے ہو؟'' نوما کی گہری آنکھیں اُس پر مرکوز تھیں

''اپنی مٹی کا دکھ، اپنے لوگوں کا نوحہ،، وہ کچھ نہ سمجھی'' بڑی ہو کر اِسے ضرور پڑھنا، تمہیں معلوم ہونا چاہیے ہمارے خواب کیسے بکھرے''

نوما نے ڈائری کو کھولا'' پانچواں موسم،، لطف اللہ کے خوبصورت حروف کی سیاہی اُس کی پہچان کی طرح ماند پڑ رہی تھی،

''آؤ میرے ساتھ،، نوما نے بوڑھے کی طرف ہاتھ بڑھایا

''کہاں؟'' بوڑھے کی آنکھوں میں استعجاب تھا

''اپنے گھر، اپنی بیٹی کے گھر'' اُس کی آنکھیں چھلک پڑھیں

بوڑھے نے بیساکھی ایک طرف رکھی اور نوما کا سہارا لے کر اُٹھ کھڑا ہوا

☆☆

بنائیں جن میں سب سے مشہور 'انقلابی جمہوری شہریوں کی انجمن' تھی۔ لیکن یہ صرف مئی سے اکتوبر 1793ء تک چل سکی۔ اس کے باوجود جیسا کہ ڈومینک گوڈینو اور ڈارلین لیوی جیسے تاریخ دان کہتے ہیں کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خواتین مردوں کے سیاسی اور معاشی مطالبات سے متفق نہیں تھیں۔ خواتین نے نہ صرف مردوں کی حمایت کی بلکہ اُن کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ وہ مقبول عام انجمنوں کے دالان میں بیٹھتی تھیں۔ وہ روٹی کی دکانوں، مارکیٹوں اور گلیوں میں اپنی سیاسی سرگرمیاں کرتی تھیں۔

انقلاب سماج کی گہرائیوں تک سرایت کر جاتا ہے۔ انقلابات عوام اور ہر مظلوم طبقے کے سوئے ہوئے احساسات اور ارمانوں کو جگا دیتے ہیں۔ اس لیے عورت کی آزادی کے مطالبے نے شدید اہمیت اختیار کر لی۔ لیکن اس مطالبے کو مختلف رجحانات نے مختلف انداز میں سمجھا جس کی بنیادی وجہ مختلف طبقات کے اپنے اپنے مفادات تھے۔ یہ کوئی حادثہ نہیں تھا کہ پیرس کی غریب پرولتاری اور نیم پرولتاری خواتین نے تحریک کی قیادت کی۔ وہ سماج کی سب سے مظلوم ترین عورتیں تھیں جن کو طرح طرح کی اذیتیں بھی برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ ان کو سیاسی جدوجہد اور تنظیم کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس مرد زیادہ احتیاط پسندی، ہچکچاہٹ اور قانونی پابندیوں کا شکار تھے۔ یہ تفاوت اُس وقت سے اب تک کئی بار دیکھنے کو ملتا رہا ہے۔ بہت سی ہڑتالوں، جن میں خواتین بھی شامل تھیں، وہ مردوں سے زیادہ پُر اعتماد اور باہمت تھیں۔ واضح طور پر یہ جنسی تفریق کا سوال تھا جس کی وجہ سے خواتین حرکت میں آئیں۔ یہی بات سو سال بعد پیٹروگراڈ میں بھی سچ ثابت ہوئی۔ انقلاب فرانس کے ہر اہم موڑ پر نچلے طبقات کی خواتین نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ اکتوبر 1789ء میں جب آئین ساز اسمبلی والے ممبران اصلاحات اور آئین کی نہ ختم ہونے والی رٹ لگا رہے تھے، اُسی دوران پیرس کی غریب خواتین، مچھلی منڈی کی محنت کش عورتیں، دھوبن، کپڑوں کی سلائی کرنے والی، دکانوں میں کام کرنے والی خواتین، ملازمائیں اور مزدوروں کی بیویاں خود اُٹھیں۔ بائیں بازو کی ان بنیاد پرست خواتین نے سستی روٹی کے مطالبے کے لیے ایک مظاہرے کا اہتمام کر کے پیرس

سیمیں درّانی

وجود

آبائی وطن۔ پاکستان
مقیم۔ کراچی
وہ رسائل و جرائد جس میں افسانے شائع ہوئے۔ فنون، اجراء، (پاکستان)۔ ثالث، دربھنگہ ٹائمس،
تصنیفات۔ بہت سی اردو، انگریزی، پنجابی نظمیں اور اردو افسانے غیر مطبوعہ ہیں۔

.....

خالی پن اس کی ذات میں اتنا بھر چکا تھا کہ اس کی نس نس چیخ رہی تھی..... وہ اپنی خاموشی کے ذریعے اپنے خالی پن کو چُپ کروانے کی کوشش کرتی۔ یہ اس کے وجود کا وہ حصہ تھا کہ اگر باہر ابل پڑھتا تو اتنا تعفّن پیدا ہوتا کہ شاید کوئی سونامی بھی اس کو نہ مٹا پاتا ..... زیتون کا قصور اور جرم صرف یہ تھا کو اس کو عورت تخلیق کیا گیا تھا..... وہ سوچتی، عورت بولے تو زُبان دراز ..... نہ بولے تو گھنی و کم عقل، عقل استعمال کرے تو حرافہ اور اگر چالاکی سے کام لے تو ڈائین..... اور ان الفاظ کا مذکر تو ڈھونڈنے سے نہیں ملتا..... مونث میں تو ایسی بہت سی مثالیں مل جائیں گی کہ آخر وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ.....

زیتون کی ماں ایک خاموش طبع عورت تھی ..... باپ ایک کامیاب وکیل

تھا، اور پسند نہ کرتا تھا کہ گھر کی عورت کی آواز سنائی دے.....اس کی ماں اس کو شروع سے ہی میرا شیر کہہ کر پکارتی، اور وہی شیر جب گھر کے باہر اپنے سے دوسرے حیوانوں کا مقابلہ نہ کر پاتا تو سٹپٹا کے، گھر کے اندر رکھی ہوئی بکریوں پر دھاڑ کر اپنی انا اور سرشت کے سکون کا سامان کرتا۔ گھر کی بکریوں کی اوقات ہی کیا تھی، منمنا کے ایک کونے سے جا لگتیں۔ اور لگ جاتیں اپنی پکائی دال کے دانے گننے۔.....

جب بیاہ کی نوبت آئی تو ابا نے اس کو خاموشی سے جمال کے ساتھ باندھ دیا، زیتون کو بالکل فرق محسوس نہ ہوا۔ صرف کھونٹا تبدیل ہوا تھا اور دوسرے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ، اب وہ جسمانی فرائض کی ادائیگی کی بھی پابند تھی، نا چاہتے ہوئے بھی... دادی نے تو یہی سمجھایا تھا جب دلہن بن رہی تھی۔۔۔ دادی نے آ کر سب سہیلیوں کو کمرے سے نکال باہر کیا اور بولی، دیکھ زیتون، اپنے شوہر کو کبھی ''نہ'' مت کہنا، بیٹا، وہ تیرا مجازی خدا ہے.....انکار گناہ ہے گناہ.....چل توبہ کرا بھی سے۔

اور اس بیچاری نے کچھ جانے بوجھے اور کئے بنا ہی توبہ بھی کر ہی ڈالی۔

جمال ایک بینک میں ملازم تھا، سارا دن نوکری پر ہوتا، شام کو آ کر وقت اپنا وقت ''کلائنٹس'' کے ساتھ موبائل فون پر گزارتا، کہ اچھی سروس دینا اس کے بینک کی مشن اسٹیٹمنٹ تھی، اور اس کی بیشتر کلائنٹس فیمیل تھیں.....اس لیے جب بھی پوچھا جاتا تو بالکل سچ ہی جواب دیتا،۔۔۔۔۔۔کلائنٹ کی کال ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

.....زیتون کی ساس بہو سے پیار کرنے والی عورت نکلی، بیٹے کے تیور جانتی تھی اِس لیے بہو کو پیار دینا شروع کر دیا.....اکثر کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ رات بھر بھی جاری رہتی اور دادی کی وہ بات یاد آ جاتی کہ 'میاں کو کبھی انکار نہ کرنا،۔۔۔زیتون سوچتی، میاں کو انکار کیسے کرتے ہیں؟؟، کہ وہ جانتی ہی نہ تھی کہ شوہر پیار کیسے کرتا ہے .....اس کو تنہا کمرے میں دیکھ کر ساس کہتی، 'بڑا آدمی بننے کی کوشش میں ہے تیرا میاں۔۔عورت کو ایک سیڑھی بننا پڑتا ہے۔ یوں جمال زیتون کے وجود پہ قدم رکھتا گیا اور بڑھتا گیا، یہ جانے بغیر کے وہ کس طرح روندی جا رہی ہے۔

کب اور کیسے بیٹا ہوا..... بی بی مریم تو نا تھی .....شوہر یقیناً دفتری کاموں اور بڑے لوگوں سے اکتا کے، گھر کی پکی کھانے پر مجبور ہوا ہوگا..... باہر میسر نہ ہو تو گھر میں کسی کونے کھدرے سے روکھی سوکھی نصیب ہو ہی جاتی ہے، جو یقیناً دھول مٹی اور ہر قسم کی آلائش سے پاک ہوتی ہے۔

بیٹا ہوا تو وہ مکمل ہوئی..... پیار کے سوتے، جو پھوٹنے کے لیے بیتاب تھے ایک سمندر کا روپ اختیار کر گئے، جس میں وہ ڈوبتی چلی گئی۔ اب وہ ہوتی اور بیٹا ہوتا..... دن رات اس کی محبت میں اندھی۔ سوچتی..... ماں اور ہے ہی کیا؟۔ ایک مکمل عورت۔، عورت کا حقیقی روپ دیکھنا ہے، تو ماں بنا ڈالو۔ عورت کی تخلیق کا مقصد اس کو رحم دے کر اپنی رحمانیت کا جلوہ کرانا ہے..... ورنہ کیا کارخانہ چلانے کو مرد کم ہیں اس دنیا میں۔

اسی دوران ساس ک انتقال ہو گیا، زیتون بھی اب میاں سے بخوبی واقف ہو چکی تھی..... جمال بینک میں ایک اعلی عہدے پر فائز ایک مکمل بڑا آدمی تھا..... زیتون بیگم، وہی کی وہی رہی، ایک بے حیثیت اور بے معنی عورت ۔۔۔۔۔ ایک عورت ..... ایک بیوی اور ایک ماں۔ وہ سوچتی۔۔ سب عورتیں کالی، نیلی، پیلی اور گلابی ہیں..... ہمارا اپنا اصل رنگ کیا ہے نہیں جانتیں..... مگر پھر بھی ہم سب سے یہی گلہ ہوتا ہے کہ میرے رنگ میں رنگ جاتی..... ویسے یہ مرد کی ذات کا رنگ ہے کیا؟ یہ تو خود مرد بھی نہیں جانتے..... اگر جانتے ہوتے تو عورت سے کبھی اپنے رنگ میں رنگنے کو نہیں بولتے..... نہ ہی یہ جبر کرتے.....

مرد کی اپنے رنگ سے لاعلمی نے ہی یہ روگ اس کے دل میں ڈال دیا، جس پر بین کرتے کرتے اس کے رنگین آنسو عورت پر گرتے رہے، اور اس کا رنگ بدلتے رہے..... مرد نے ہر رنگ میں عورت کو رنگ کر، خود کو اسی رنگ میں کھو جا، مگر وہ خود کو کھوج نا پایا..... آج بھی اپنی تلاش میں متلاشی مرد عورت کو رنگنے اور بدلنے کے عمل میں مصروف ہے اور یہ جان نہیں پایا کہ وہ خود جس رنگ میں رنگ ہوا آیا تھا، وہ آنول نال کے پانی کا رنگ تھا، جو کہ عورت کے وجود کا حصہ ہے۔۔۔۔ فقط بابر بڑا ہوا تو اس کو بھی خاندان کا

نام اونچا کرنے اور کامیاب آدمی بنانے کے لیے جمال نے تعلیم کی غرض سے بیرون ملک بھیج دیا..... زیتون کیا بولتی۔۔۔تمام عمر شوہر کو بڑا آدمی بنانے کی غرض سے تعاون کرتی رہی تھی، اب تو اس کے اپنے لخت جگر کی باری تھی۔سوخاموشی سے سرتسلیم خم کر دیا۔ چُپ چاپ انتظار کی تصویر بنی..... کبھی بیٹے کا کمرا صاف کرتی، کبھی کتابیں سجاتی.....اور جب بس نہ چلتا تو بابر کی الماری سے اس کے جوتے نکال کر ان کو دوپٹے سے جھاڑ کے چوم لیتی ..... بیتاب ممتا نے اپنا اظہار تو کرنا ہی تھا..... اولاد کے پرانے جوتے ہی صحیح۔۔.....

تعلیم مکمل ہوئی تو بابر، ماریا، کے ساتھ واپس آیا..... دونوں کورٹ میرج کر چکے تھے..... گھر واپسی پر شادی کی رسم دھوم دھام سے باقاعدہ ادا ہوئی۔ زیتون، خوشی سے پھولے نہ سماتی۔ بابر اور ماریا کو ان کی اعلیٰ تعلیمی قابلیت اور جمال کے حسب و نسب کی بدولت جلد ہی نوکری مل گئی۔ ..... دونوں کی خوب تعریف ہوئی اور چرچے ہوئے۔ زیتون دونوں کو دیکھ کے پھولے نہ سماتی، ادھر ادھر سو چرچے پھیل گئے شاندار تربیت اور ماں باپ کی خوش نصیبی کے۔ جبکہ بیٹا اپنی زبان ہی بھول چکا تھا اور ماں اس سے دو گھڑی بات کو ترستی پھرتی۔ بابر پہ مغربی تعلیم اندر تک اثر انداز ہوئی اور وہ خدا کے وجود کے متعلق کنفیوزن کا شکار ہو چلا۔ زیتون نے جب اپنے خدشات کا اظہار کیا تو۔ جمال نے ہنس کے بیٹے کو ایتھیسٹ قرار دیا اور میٹنگ کا کہہ کر چلتا بنا۔ اور زیتون سوچ میں کھو گئی۔۔۔اس لادین اولاد سے تو اچھا تھا، ایک پودا ہی کہیں لگا دیتی۔ جاریہ تو چلتا رہتا۔ وقت گزرتا رہا اور سب کچھ ویسا ہی رہا۔

البتہ نہ چاہتے ہوئے بھی ماریا کا پیر بھاری ہو گیا۔ دونوں نے سر توڑ کوشش کی کہ ایک خوبصورت مستقبل کی سعی میں حائل اس رکاوٹ کو گرا دیا جائے مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ جو روح پھونک دی گئی تھی وہ وہیں کی وہیں رہی۔۔ اور دونوں کے یہاں حیدر کی پیدائش ہوئی۔ زیتون جو پہلے ہی پیاسی تھی اس نے فوراً حیدر کو گود لیا اور یوں ماریا کو ایک آیا رکھنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ جس کے لیے ماریا کئی غیر ملکی نیوز کے انٹرویو

کر چکی تھی ان تمام حالات و واقعات کے دوران زیتون کی روزے اور تہجد کی عادت مزید پختہ ہوتی چلی گئی۔.....دوسروں سے دور دور اور خدا کے قریب تر ہوتی چلی گئی..... حیدر دادی کی جان تھا اور اس کو دادی کے بغیر سانس نہ آتی تھی.....زیتون کو باغبانی کا بہت شوق تھا، وراگھر پھولوں سے سجا رکھا تھا.....ایک دن، حیدر کہیں سے زیتون کا پودا لے آیا اور بولا، یہ آپ ہیں.....''زیتون''۔وہ ہنس پڑی اور دونوں نے مل کر ایک گملے وہ زیتون لگا دیا.....چونکہ وہ حیدر کا لایا ہوا پہلا پودا تھا، لہذا وہ دونوں مل کر اس کی خاص دیکھ بھال کرتے.....پھر زیتون نے اس کو بتایا کہ قرآن پاک میں زیتون کی قسم بھی کھائی گئی ہے.....حیدر بہت حیران ہوا.....اور بولا، اِس پودے کا تو احترام بھی ہم پر فرض ہے.....یقیناً خوبی ہے تو مقام عطا ہوا ہے نا.....اور یہاں یہ ایک عورت کا نام ہے، میرے دادی کا نام۔۔۔زیتون نے پہلی بار شوہر سے فرمائش کی۔ سنئے مجھے عمرہ کے لئے جانا ہے۔ جمال بھونچکا رہ گیا۔مگر ٹالنا آسان نہ تھا۔ "دیکھتے ہیں" یہ کہ کر چلتا بنا۔

اب مسئلہ شروع ہوا محرم کی موجودگی کا۔شوہر اور بیٹا دونوں ہی دنیا بنانے میں دل و جان سے مصروف تھے اور عمر کی اس پیڑھی میں نہ تھے کہ خدا کو منانے کے جتن کرتے۔حیدر یہ سب کچھ دیکھ اور محسوس کر رہا تھا، بول اٹھا۔۔میں جاؤں گا دادی کے ساتھ۔سب حیرت سے ششدر رہ گئے۔ ماریا اور بابر نے بہت سمجھایا کہ تعلیم کا حرج ہوگا۔ابھی تو امتحان بھی سر پہ ہے، اور سب سے بڑھ کے، ابھی تو تمھاری عمر صرف 16 برس کی ہی ہے۔

مگر وہ نہ مانا اور سفر کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔تمام انتظامات سٹیٹس کے حساب سے کئے گئے۔

زیتون حیدر کے ساتھ، خانہ خدا میں حاضری کے لیے داخل ہوئی۔۔۔۔۔ بے زبان سی مورت۔اس نے تو کسی انسان کے سامنے زبان نہ کھولی تھی، ادھر کیا ادائیگی کرتی۔کبھی مجازی خدا کے سامنے نظریں نہ اٹھا پائی تھی، اور ادھر تو حقیقی خدا کا در تھا۔ نظریں جھکائے، کپکپاتی، لرزتی، زیتون آج تک ایک گونگی زندگی بسر کرتی آئی تھی۔

گونگے لفظ جب پیدا ہوتے ہیں تو ان کی یتیمی کا ماتم دیکھ کے ان کو جنم دینے والی کوکھ خود کو بانجھ کر ڈالتی ہے..... ایسے لفظ، زبان کو ترساتے پھرتے ہیں..... دنیا کی کوئی بھی زبان، ان کو ادا نہیں کر پاتی اور یہ یونہی کائنات کے در و دیوار سے ٹکراتے، بلکتے، سلگتے، اور شکست خوردہ حالت میں جب دوبارہ اپنی کوکھ میں پناہ لینے کو لپکتے ہیں، تو اس کو بانجھ پا کے، انکا وجود، دم توڑ جاتا ہے..... دل ان کو آنسوں سے غسل دے کے، سسکیوں کی نماز جنازہ کے بعد، یاد کا کفن اڑھا کے، اپنے نہاں خانوں میں جب سپرد کر دیتا ہے، تو یہ لفظ، مختلف صورت میں، ہماری زبان سے خود بخود جنم لینے لگتے ہیں جو کہ چاہ اور آہ کی صورت ادا ہوتی ہیں۔ سوزیتون کی تمام عمر کی ایک آہ نے اس کی چاہ کا دامن تھاما اور آسمان کی جانب لپکی۔ حیدر جو اس کا بازو پکڑے کھڑا سب کچھ محسوس کر رہا تھا، بول اٹھا۔ "دادی، آنکھیں کھولو۔ دادی کیا ہو گیا ہے، دادی، ریزیور گیز پلیز'' اس نے دادی کو جھنجھوڑ ڈالا۔ زیتون نے ایک لمحہ بھر نظر اٹھا کے خانہ کعبہ کو دیکھا۔ ''اللہ'' اور وہیں جان دیدی۔

خاندانی قبرستان میں تدفین کا انتظام کیا گیا، جہاں ذات پات، اور حسب و نسب کے حساب سے خوبصورت اور قیمتی کتبے آویزاں تھے۔ اب کنیادان میں بحث شروع ہوئی کہ کتبے پہ کیا لکھوایا جائے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ زیتون نے جس خاموشی سے زندگی گزاری ہے، اور ویسے ہی گزر بھی گئی سو، اس کا نام کتبے پہ لکھنا نامناسب رہے گا، نیک عورتوں کے نام کتبوں پہ اچھے نہیں لگتے۔ پھر صلاح آئی کہ حسب و نسب اور ذات کو مدنظر رکھنا اشد ضروری ہے۔ ماریا کے لیے یہ سب بہت اچھوتا اور ''انٹرسٹنگ'' تھا۔ وکیل صاحب نے فرمایا، بنت وکیل احمد لکھا جائے۔ جمال فوراً کہہ اٹھا۔ ''زوجہ جمال خان رئیس زادہ''۔ ماریا بھی کہیں سے سیکھ آئی اور بولی، ''ام حیدر''۔۔۔ بہت بحث ہوئی۔ کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اور پھوٹ پڑ گئی۔ سب کے سب ہٹ دھرم اٹھ چلے اور اپنے اپنے کتبے کا آرڈر دینے جا پہنچے، شہر میں ایک ہی بیش قیمت پتھر استعمال کرنے والا کتبہ ساز تھا، اس سے بات طے کر لی گئی۔ اس نے ایک ہی قبرستان کی مناسبت سے تینوں خاندانوں کو جمعہ

کی نماز کے بعد کا وقت دے ڈالا۔ اور قبرستان پہنچ کے ان سب کے انتظار میں جا بیٹھا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کے جب اس نے ان سب کو ایک ہی قبر کی جانب جاتے دیکھا۔ وہ تینوں کتبے اٹھائے وہیں چل پڑا۔ اپنی میں ضد پہ اڑے، وہ سب زیتون کی قبر پر پہنچے تو وہاں حیدر پہلے سے ہی موجود، ہاتھوں سے مٹی جھاڑ رہا تھا...... کتبے کی جگہ پر زیتون کا وہ پودا، جس کی حیدر اور دادی نے مل کر آبیاری کی تھی،، کتبے کی جگہ پہ لگا چکا تھا ......سب کی جانب متوجہ ہوا اور بولا...... ''دیرَشی از......زیتون'' ......

☆☆

نسترن احسن فتیحی

نسل

آبائی وطن۔ سمستی پور
مقیم۔ علی گڑھ۔ ہندوستان

وہ جریدے جس میں افسانے اور مضامین شائع ہوئے۔ شاعر، ثالث، خرمن، حیات، جمنا تٹ، قوس وقزح، لفظ ومعنی، ذکری، دربھنگہ ٹائمس، بزم ادب، کے علاوہ پاکستانی رسائل۔ خیال اور ادبیکا، پروگریسیو رائٹرز گلڈ کے تحت شائع ہونے والی کتاب ''اکیسویں صدی کے افسانے'' میں افسانہ شامل ہے۔

تصنیفات۔ لفٹ۔ (ناول)،
نوحہ گر۔ (ناول) زیر طبع
کال بیلیا۔ (ناولٹ) زیر طبع

.....

جدنی محتاط قدموں سے آفیسر زکیمپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔۔۔ سہمی ہوئی نظروں سے وہ چاروں طرف کسی کسی وقت دیکھ لیتا۔ جہاں کے ہر پیڑ و پودھے، ٹیلے اور میدان، چرند و پرند اس کے جانے پہچانے تھے۔ جہاں کی ہوا اس کی سانسوں کے ساتھ ہم آہنگ تھی، جہاں کے پانیوں کی کل کل اس کا آئینہ تھی۔ وہی علاقہ آج اس کے لئے کتنا اجنبی ہو گیا تھا۔۔۔ بلکہ اجنبی کر دیا گیا تھا۔

یہاں سے تاڑ کے پیڑوں کے جھنڈ کے بیچ بنی اس کی جھونپڑی صاف نظر آرہی تھی۔ بائیں طرف ایک ٹیلا اور دائیں طرف کچھ دور تک پھیلا ناہموار میدان۔۔۔ کچھ لوگوں کی زندگیوں کی طرح جس میں کوئی بھی قدم سیدھا نہیں پڑتا، حالانکہ پہرے پر بیٹھے سپاہیوں نے اسے کئی بار دھتکارا تھا۔۔۔

''ادھر بھول سے بھی پیر مت رکھنا۔۔۔ شکاری سمجھ کر گولی چلادی تو رونے کا بھی وقت نہیں ملے گا۔'' مگر ضرورتوں کے لاتعداد گھڑیال اپنے خوفناک پینے دانت دکھا دکھا کر اسے موت کے اسی کوئیں کی طرف دھکیلتے تھے۔ شاید اسی کوئیں سے اسے ایک چلّو پانی ملنے کی آس تھی۔ آفیسر زکیمپ کے پیچھے سے جنگل شروع ہوتا تھا جسے فی الحال احتیاطی تدابیر کے طور پر خاردار تاروں کی باڑ نصب کر کے محفوظ کیا گیا تھا۔ باڑ کے اس طرف دس بارہ فٹ گہرے گڑھے کھود دئے گئے تھے۔ یہ ساری حفاظتی کارروائی اس شیر اور شیرنی کو جوڑے کے لیے کی گئی تھی جو ایک کمیاب نسل تھی اور یہ نسل ختم ہونے پر آگئی تھی۔

سب سے پہلے پاس کے گاؤں والوں نے سمڈیگا سے ذرا دور جہاں جنگل شروع ہوتے تھے اس نسل کے ایک شیر کو مردہ پایا۔۔۔۔ سیدھے سادھے گاؤں والوں کو بھی اب ان حیوانوں کی اہمیت کا اندازہ تھا۔۔۔۔ اس لئے انہیں مردہ شیر کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور فکر بھی۔۔۔ شیر آخر مرا کیسے؟ یہاں کے باشندے اور جانور کبھی ایک دوسرے کی طرز زندگی میں مخل نہ ہوتے تھے۔ معاملات کی سنگینی کا اندازہ کر کے کچھ گاؤں والوں نے قریب کے تھانے میں خبر کر دی۔ پہلے تو پولس نے معمولی کارروائی کی پھر نہ جانے کیا ہوا پورے پولس کے عملے کے ساتھ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پھر اس صوبے کے گورنر سب حرکت میں آگئے۔

جدنی کو صرف اتنا سمجھ میں آیا کہ ایک شیر کی موت نے اس گاؤں کی کایا پلٹ دی تھی۔ وہی سڑک، وہی میدان، وہی جنگل، وہی آسمان اور وہی زمین۔۔۔ مگر حالات یکسر بدل گئے تھے۔ جب سے ان کے چہار طرف بکھرے قدرتی وسائل پر پابندی عائد کی گئی ہے علاقے میں وہ نظر بند تھے پھوک پھوک کر قدم رکھنا تھا۔ جنگل کا بڑا حصہ

خاردار تاروں سے گھیر دیا گیا تھا، انہیں ایک کونے میں سمٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ آزادی سے اب ندی کے کنارگھوم بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ شک کے گھیرے میں تھے۔۔۔۔ کہیں کوئی اس پانی کو زہر آلود نہ کر دے۔ نہ جانے کتنے لوگ ان حالات سے تنگ آ کر یہ علاقہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔ برسہا برس سے رہنے والے لوگ اگر جا رہے تھے تو دوسری طرف آفیسرز کیمپ لگائے جا رہے تھے۔ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ کالے کالے ننگ دھڑنگ وجود کی جگہ، رنگ برنگی پوشاکوں کے لہرانے کا سماں تھا۔ کڑوے کسیلے دھوئیں کے ساتھ ابلتے ہوئے بھات (چاول) کی جگہ، سرخ شعلوں کے درمیان بھونے جانے والے گوشت کی بو فضاؤں میں بکھر رہی تھی۔۔۔ ساتھ ہی میوزک، قہقہے، پکنک۔۔۔ اور خیرہ چشم زیورات، قیمتی ملبوسات، چہرے سے زیادہ چمکتے ہوئے ہیرے اور کندن کے آویزے، گویا اسی طرح کی رنگ بھری اور امنگ بھری محفل۔ جدنی کی سمجھ میں کیا آتا۔۔۔ نہ جانے کونے تھے یہ لوگ؟ کیوں آئے تھے۔۔۔۔۔؟ جدنی نے تو کبھی ایسی دنیا نہیں دیکھی تھی۔۔۔ اس کی دنیا تو اس کی جھونپڑی میں تھی۔ جس کے لئے وہ اس ناسازگار ماحول کو چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا تھا۔ اسکی مہوا جو پیٹ سے تھی، دو قدم بھی چلنے سے قاصر تھی تو دو کوس کیسے چلتی؟ اس لئے وہ یہیں جما ہوا تھا۔ اور آج آس کی ایک ڈور تھامے اس اجنبی ماحول کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کیوں کہ اتنے دنوں میں اسے سبھاش بابو کا بڑا سہارا ہو گیا تھا۔ وہی سبھاش بابو جو سب لوگوں کے ساتھ شہر سے آئے تھے۔ لیکن اب اسے وہ سب کی طرح بالکل اجنبی نہیں لگتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔۔۔ 'کیمپ میں آئے ہوئے لوگوں کی چاکری (مزدوری) کر لو گے تو دو جوم (وقت) کے کھانے کا بندوبست ہو جائے گا۔ اور آج تو مہوا تکلیف میں تھی، سبھاش بابو سے سنا تھا اس نے کہ شہر سے دیونا (ڈاکٹر) بھی آیا ہے۔ وہی کوئی دوائی دے تو کچھ آرام مل جائے اس کی مہوا کو۔۔۔ مہوا کی تکلیف کا خیال کرتے ہی وہ تیز قدم اٹھانے لگا۔

مہوا نے اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھ سے تھام کر دیکھا۔۔۔ آج جیسے سارا بوجھ نیچے سرک گیا ہو۔ اسی لئے پیڑو اس بوجھ سے پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی اندر بیٹھا

کے ٹاؤن ہال تک مارچ کیا۔ اُنہوں نے ورسائی محل پر ہلہ بول کر مردوں کو بھی شرما دیا۔ خواتین نے بادشاہ اور ملکہ میں جنسی بنیادوں پر کوئی فرق نہیں کیا اور دونوں کو زبردستی پیرس لا کر نظر بند کر دیا۔ جارج روڈے نے اس منظر کو اچھی طرح سے بیان کیا ہے :

''اب خواتین کا اثر ورسوخ بڑھ رہا تھا۔ روٹی کا بحران خاص طور پر اُن پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ مردوں کی بجائے خواتین ہی تحریک کی قیادت کر رہی تھیں۔ ہارڈی نے لکھا ہے کہ 16 ستمبر کو چیلوٹ کے مقام پر خواتین نے غلے سے لدے پانچ چھکڑوں کو روکا اور انہیں پیرس کے ٹاؤن ہال میں لے آئیں۔ سترہ تاریخ کی دوپہر کو مشتعل خواتین نے ٹاؤن ہال کا گھیراؤ کیا۔ وہ نان بائیوں سے نالا تھیں۔ میونسپل کونسل اور باٹلی نے اُن کا استقبال کیا۔ ہارڈی کے مطابق ان خواتین نے علی الاعلان کہا کہ مردوں کو کچھ سمجھ نہیں آتی اور یہ کہ وہ تمام کام اب خود کریں گی۔ اگلے دن پھر ٹاؤن ہال کا محاصرہ کیا گیا۔ اسی شام خواتین نے غلے سے بھرا ایک چھکڑا روک کر اُسے مقامی ضلعی ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا۔ یہ تحریک 5 اکتوبر کے سیاسی مظاہرے کے بعد بھی جاری رہی۔''

اور پھر ''اس آغاز کے بعد خواتین ٹاؤن ہال میں جمع ہوئیں۔ اُن کا پہلا مقصد روٹی اور دوسرا غالباً اپنے مردوں کے لیے اسلحہ اور بارود حاصل کرنا تھا۔ ایک کپڑے کا تاجر، جو پرانی مارکیٹ کے قریب سے ساڑھے آٹھ بجے گزر رہا تھا، نے دیکھا کہ خواتین کے گروہ گلیوں میں اجنبیوں کو روک کر انہیں اپنے ساتھ ٹاؤن ہال تک جانے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ پہرے داروں کو غیر مسلح کیا گیا اور اسلحے کو خواتین کے پیچھے آنے والے مردوں کو دے دیا گیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ایک اور چشم دید گواہ جو وہاں کا خزانچی

آری چلا رہا ہو۔ وہ درد کی چبھن سے پریشان ہو کر جھونپڑی کی نم آلود زمین پر بیٹھ گئی اور دیوار کا سہارا پیٹھ کو دیتے ہوئے دونوں پیر پھیلا دیئے۔ اماں تو کہتی تھی کہ جب زچگی کے دن قریب آتے ہیں تو پیٹ لٹک جاتا ہے، مگر ابھی تو اسکا ان گنا مہینہ ہی چل رہا ہے۔۔۔ پھر۔۔۔ یہ تکلیف؟ اس نے ہاتھ سے پیٹ کو سہلایا جیسے درد کو اپنے چنگل میں کرنا چاہتی ہو۔ اور دوسرے ہاتھ کے ناخن سے لاشعوری طور پر زمین کی مٹی کریدتی رہی۔ اس کی نظریں بار بار جھونپڑی کی در کی طرف اٹھ جاتیں۔ جہاں نہ کوئی پردہ تھا نہ کوئی دروازہ۔ بس کھس اور پھوس کی دیواروں کے بیچ باہر اندر کرنے کے لئے تھوڑی کھلی جگہ چھوڑ دی گئی تھی اور اس کی بے چین نظریں اس طرف بار بار اٹھ رہی تھیں۔ وہ کسے پکارے؟ پانی کے لئے حلق خشک ہو رہا تھا۔ جدنی اسے تسلی دے کر گیا تھا کہ جلدی لوٹے گا پر ابھی تک۔۔۔ جبکہ اسے معلوم ہے کہ کاکی بھی چلی گئی، گاؤں سے لوگوں کے ہجوم روز ہی نکل جاتا ہے۔ سب کو اپنی پڑی ہے سب پولس اور شہری بابوؤں سے ڈرتے ہیں۔ ارے صاف صاف کہہ دیں ہم نے نہیں مارا شیر کو، بلکہ ہمارے یہاں پر رہنے سے شکاری لوگ ڈرتے ہیں جنگل کا رُخ کرنے سے۔۔۔ ہماری وجہ سے تو ان کی اور حفاظت ہوتی ہے۔۔۔ پر سب ڈرپوک ہیں سالے۔۔۔ اب مصیبت میں وہ کیسی تھی۔۔۔ جدنی کو لگ رہا تھا کہ زمین ان کے لئے اور سخت اور آسمان اور گرم ہو گیا ہے۔ انپٹ اکیلی رہ گئی۔ ہے۔۔ اس نے بے چین ہو کر سر سہلایا۔۔۔ "بوہسوتنا، (میرا سر درد کر رہا ہے) "اس کی بڑبڑاہٹ بڑی واضح تھی۔ خود ہی چونک کر ہنس پڑی۔ کسے سنا رہی ہے اپنی تکلیف۔ وہ اٹھی اور پانی کا لوٹا اٹھا کر حلق تر کیا اور جھونپڑی سے باہر نکلی۔ دور دور تک جدنی آتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ وہ کوئی پہلا بچہ تو جننے جا نہیں رہی تھی، یہ تیسرا تھا یہ اور بات ہے کہ اب بھی اس کی عمر اتنی کم ہے کہ شہری لڑکیوں کی شادی اس عمر میں کوئی سوچتا تک نہیں۔ اس کی شادی بھی تو جدنی سے تیرہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی اور سترہ سال کی عمر میں وہ پہلی بار ماں بن گئی، پھر یہ سلسلہ ہر سال چل پڑا، صرف انیس سال کی عمر میں وہ تیسری بار ماں بننے جا رہی تھی۔ اب یہ تیسرا بچہ تھا اس لئے اس تجربہ تو تھا ہی، اور وہ سمجھ

رہی تھی کہ اب یہ تکلیف رکنے والی نہیں۔۔۔اس ہون (بچہ) کو دنیا میں آنے کی بڑی جلدی ہے۔ جیسے اس کے ذات برادری والوں کو بھی ہر بات کی ہمیشہ جلدی رہتی ہے۔ شادی بیاہ کی جلدی۔۔۔بوڑھے ہونے کی جلدی۔۔۔اسی طرح مرنے کی جلدی۔اب ایک معمولی سے واقعے پر گاؤں چھوڑنے کی جلدی۔

جدنی کیمپ کے پاس پہنچا تو دیکھا۔سبھاش بابو کئی لوگوں کی ساتھ کرسیوں پر بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔وہ ایک کنارے کھڑا ہو گیا اور جب سبھاش کی نظر اس پر پڑی تو بڑے احترام سے اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دئے۔سبھاش نے سر کی جنبش سے جواب دے کر اشارہ کیا کہ وہیں بیٹھ کر انتظار کرے اور باتوں میں پھر سے لگ گیا۔جدنی تھوڑے فاصلے پر اکڑوں بیٹھ گیا اور بے دلی سے باتیں سننے لگا۔دراصل مہوا کا تکلیف سے سیاہ پڑتا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔اس نے بے چینی سے سبھاش کی طرف دیکھا۔مگر وہ بہت زور وشور سے کسی بحث میں مصروف تھا۔اور ساتھ ہی کچھ لکھتا بھی جا رہا تھا۔جدنی کو یاد آیا کہ سبھاش بابو نے بتایا تھا کہ وہ کسی اخبار کے دفتر میں کام کرتے ہیں اور آج کل یہاں کے خبروں کی رپورٹ تیار کر کے بھیجتے ہیں۔اس وقت بھی موضوع بحث وہی شیر تھا۔ایک صاحب کہہ رہے تھے۔'' یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ان تسکروں کا ساتھ یہاں کے کچھ مقامی لوگ دے رہے تھے کہ نہیں، کیونکہ اب شیر کی کھال کے علاوہ اس کی ہڈی، بون میرو اور چربی اور مختلف حصوں کی بڑھتی مانگ اور قیمتوں کی وجہ سے شیروں کا غیر قانونی شکار بڑھ گیا ہے، اور اگر مقامی لوگوں نے اس کام میں ان کا ساتھ دیا ہے تو ہم ان کے ذریعے ہی تسکروں کے اس گینگ تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔''

پر اب یہ کام بہت مشکل ہے زیادہ تر لوگ گاؤں چھوڑ کر جا چکے ہیں، کیونکہ یہاں کے مقامی لوگوں کی زندگی کا انحصار اس جنگل پر ہی تھا جہاں اب ہمارے اینٹی پوچنگ اسکوائیڈ کی تعیناتی کر دی گئی۔اور اس حصے میں داخل ہونا ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔'' سبھاش نے کہا پھر اسے جدنی کا خیال آیا تو اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

اس کے قریب پر آنے پر سبھاش نے کہا۔ ''صاحب لوگوں کو اپنا نام بتاؤ۔'' جدنی کی گھبراہٹ بھانپ کر اس نے پھر کہا۔ ''لتم لتم؟ (نام نام)۔

جدنی۔۔۔صاحب!'' اس نے بہ مشکل کہا۔ پھر سب اس سے تھوڑی دیر تک چند سوالات کرتے رہے اور وہاں سے اٹھ گئے۔ صرف سبھاش وہیں جما رہا۔ اور جدنی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جدنی نے کندھے پر اپنا انگوچھا برابر کیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا۔ سب ٹھیک تو ہے سبھاش نے نرمی سے پوچھا۔''

''نہیں صاحب۔ مہوا کی پیڑا (تکلیف) بڑھ رہی ہے۔ کوئی دوائی کا جوگاڑ (انتظام) ہو جاتا تو۔۔۔اب تو ہم جنگل سے جڑی بھی نہیں لا سکتے نا۔۔۔صاحب، اور ہمارے واسطے کونو (کوئی) کام بھی ہو صاحب تو۔۔۔۔''

ہاں، ہاں کیوں نہیں۔

''میں نے بات کر لی ہے، کچھ تو تم یہاں کا چائے، پانی کا کام دیکھ لینا۔ لیکن تمہارا ایک اہم کام یہ ہے کہ تم جنگل کے چپے چپے سے واقف ہو اس لئے جب گشت پر نکلنا ہوگا تم ہماری مدد کے لئے ساتھ رہو گے۔''

''بڑی کرپا (مہربانی) صاحب۔'' جدنی احساس تشکر کے بار سے دب گیا۔'' اور سنو یہاں ہم اپنے آدمیوں سے تمہاری پہچان کروا دینگے تم بھی نظر رکھنا کہ کوئی باہر کا آدمی ادھر آ کر شیرنی کو نقصان نہ پہنچائے۔ اسکو بچہ ہونے والا ہے، اگر اسے نہ بچایا گیا یہ نسل ختم ہو جائے گی۔ سمجھ گئے نا۔

''اچھا چلو اب تمہاری مہوا کو دیکھ آئیں، اور اس کے لئے کچھ دوا بھی میں اپنے دوست سے تمہیں دلوا دیتا ہوں۔'' پھر دونوں مہوا کا حال بتا کر چند دوائیوں کے ساتھ جھونپڑی پر واپس آئے تو دیکھا مہوا کا درد سے برا حال تھا۔ جدنی نے جلدی سے اسے درد روکنے کی دوا کھلائی اور سبھاش سے التجا کی۔۔۔'' صاحب۔۔۔ یہاں تو اکیلی یہ مر جائے گی، جنگل سے ہو کر ایک سیدھا راستہ جاتا ہے جو چھوٹا پڑے گا۔ آپ کی کرپا ہو تو ہمیں اس سے جانے کی انومتی (اجازت) دلوا دیں، پھر میں اسے اس کی ماں کے پاس

چھوڑ کر لوٹ آتا۔'' جدنی کی آنکھوں میں جو بے چارگی تھی اس نے ''سبھاش کو پگھلا دیا، اس کی نظر میں یہ ایک مشکل کام تھا مگر اس نے حامی بھر لی اور کہا تھوڑی دیر انتظار کرے وہ کاروائی پوری کروا کر آتا ہے۔ سبھاش کے جانے کے بعد جدنی نے اپنی کمسن بیوی کے سیاہ پڑتے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔۔۔ ''تھوڑا جوم (کھانا) لیگی''۔

''نہ رے۔ اس دوائی سے تھوڑا چین ملا ہے۔'' مہوا نے اپنی کمزور آواز میں کہا۔

''اچھا اب تھوڑا آرام کر۔۔۔ اماں کے پاس چلنے کے لئے تجھے ہمت کرنا ہے، ورنہ یہاں اکیلی کیا کرے گی اس گھڑی۔''

''یہ اتے سارے لوگ یہاں کیا کرنے آئے ہیں رے جدنی۔'' مہوا نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔''

''کیا کرے گی سن کر۔۔۔ وہی شیر جو مر گیا ہے نا اس کی نسل بچانے آئے ہیں۔ شیرنی گابھن ہے تجھے معلوم ہے سبھاش بابو بات کر رہے تھے کہ اس کے ایک بچے کی قیمت سات لاکھ (روپیہ) ہوگی۔ اگر کوئی چڑیا گھر والا اس کو پوسنے (پرورش) کے لئے لے جائیگا تو سرکار کو سات لاکھ روپیا دیگا۔''

سات لاکھ؟ باپ رے۔۔۔ ای سات لاکھ سمجھنے کے لئے تو ہمیں سات جنم لینے پڑیں گے۔ ہم تو جانوروں سے بھی برا بھاگ لے کر آئے ہیں رے جدنی۔'' مارے غم کے اس کی آنکھوں کے کور بھیگنے لگے۔

''ہاں! جانتی ہے ہم تو تو بتا بھی نہیں سکتے کہ ای ہمرا تیسرا بچہ ہے۔

''کا ہے۔۔۔۔''

سبھاش بابو نے منع کیا ہے بتانے سے۔۔۔ کہہ رہے تھے کہ قانون بن گیا ہے کہ جس گھر میں تیسرا بچہ جنمے گا اس کو نہ سرکاری کام ملے گا۔ نہ کوئی اور سہولت، نہ دوائی، نہ ڈاکٹر۔

اور او ہم کو کام دلوانے کا وعدہ کئے ہیں۔

''صدمے اور حیرانی سے مہوا گنگ رہ گئی۔''

ڈاکٹر ناہید اختر

ماں، پیڑ اور چھاؤں

مقیم۔ راولپنڈی۔ اسلام آباد، پاکستان
جن رسائل میں چھپے۔ ادبیات (اکادمی ادبیات پاکستان کا سہ ماہی ادبی مجلّہ) اور سیز انٹر نیشنل۔ اسلام آباد، اخبار وطن (لندن) قومی اخبارات کے ادبی صفحات، آبشار، ادبیکا اور دیگر بہت سارے تصنیف۔ ''وحشتیں ہمرکاب اپنے (شعری مجموعہ)''، مطبوعہ زیر ترتیب تصانیف۔ خوگران قفس (افسانوی مجموعہ) نظموں کا مجموعہ۔

.....

اماں آخر کو ایک درخت ہی تو ہے، کٹ گیا تو کیا ہوگا؟

''کٹ گیا۔ اتنا سخت لفظ۔۔۔۔۔۔۔ ایسے نہ کہو بیٹا۔'' اماں بے اختیار یوں کراہی جیسے عارف نے کلہاڑا درخت پر نہیں اس کے کلیجے پر چلانے کی بات کی ہو۔'' اتنی بڑی بات تو نے کتنی آسانی سے کہہ دی'' اماں جیسے تڑپ کر رہ گئی، ان کے چہرے پر ایسا کرب تھا ماں کو اولاد پر کوئی مصیبت پڑتے دیکھ کر ہوتا ہے'' یہ میرے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔ مانو، میرا ہی جسمایا ہوا ہے ترے ساتھ ساتھ ہی تو پلا اور بڑا ہوا ہے۔'' اماں کے لہجے میں گھر کے آنگن میں لگے پیڑ کے لیئے جیسے ممتا امڈ آئی۔ اماں!'' کیا یہ بے جان درخت تجھے مجھ سے بھی پیارا ہے'' عارف نے جیسے اپنی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیئے اماں کو امتحان میں ڈالنے کی کوشش کی۔'' عارف پتر، میری ممتا کو نہ آزما، اسے آزماتے ہوئے تو

سو ہنارب بھی رو دیتا ہوگا۔ تجھے کلہاڑا چلا ا ہے نا۔ درخت کے ساتھ ساتھ تو میرا بھی سینہ چیر دے۔ اف نہ کروں گی پتر۔'' اماں نے جیسے ہار مان لی۔ "دیکھ تو اماں، چڑیاں روز کتنا گند کھلیار جاتی ہیں، اوپر سے کوے سویرے سویرے کائیں کائیں کر کے کان پکا دیتے ہیں۔ کا کے کی اماں تو ان کی بیٹیں صاف کرتے کرتے اک گئی ہے۔'' عارف کے لہجے میں عجیب بیزاری تھی اس درخت کو دیکھ کر مجھے وہی آسودگی اور سکون ملتا ہے، جیسا تجھے ہرا بھرا شاداب دیکھ کر عارف پتر۔ مگر تو کیا جانے پگلے،'' تیرا باپ جب یہ گھر بنا رہا تھا تب میں نے اس سے فرمائش کر کے آنگن میں لگوایا تھا۔ آنگن میں جب دھوپ تپنے لگے تو آنگن کا پیڑ ہی چھاؤں کا احساس دلا سکتا ہے اور مجھے کیا پتہ تھا پتر، میرے گھر میں اتنی جلدی دھوپ میرا اپنڈا اجلانے لگے گی'' اماں جیسے ماضی کے ورقے الٹنے لگیں۔ تیرا ابا مجھے تیرے بچپن میں ہی چھوڑ کر چلا گیا تب اس کے اور میرے ہاتھ کا لگایا یہ پیڑ جیسے تیری ابا کی نشانی میرے لیئے دھوپ میں چھاؤں کا احساس بن گیا۔ اس درخت کے نیچے لٹا کر میں نے اس وقت تمہیں کڑی دھوپ کے احساس سے بچایا ہے، جب میرے پاس ایسی کوئی سہولت نہ تھی۔ غریب بیوہ عورت اور کر بھی کیا سکتی تھی'' اماں اس پیڑ سے جڑی یادیں دھراتی رہی اور عارف نے اماں کی کہانی پوری سنے بغیر لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔ اور کلہاڑا پیڑ کی جڑ میں دے مارا۔'' ہائے'' اماں کے منہ سے بے اختیار سسکی نکلی اور اور وہ دوپٹہ سے آنکھوں کو پونچھتی کمرے میں چلی گئیں۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ درخت کے ساتھ ساتھ اماں کا سایہ بھی عارف کو زمانے کی دھوپ میں تپتا چھوڑ گیا۔ جون جولائی تو ویسے ہی گرمی کے استعارے تھے۔ پر اب تو کچھ برسوں سے سورج بھی جیسے قہر و غضب کا دیوتا بن گیا تھا۔ لو چلتی تو شہر بھی ریگستانوں کی طرح جھلسنے لگتے۔ دن میں کمرہ حبس زدہ اور جہنم کی طرح دہکنے لگتا۔ عارف کی بیوی تو گرمی کی شدت سے گھبرا کر بچوں کو لے میکے جا بیٹھی تھی۔ عارف کام سے واپسی کے بعد اس جہنم زار میں بالکل اکیلا ہوتا۔ کمرہ جس کی چھت سنگل تھی تپنے لگتی۔ لو کے تھپیڑے عارف کو ایک پل چین نہ لینے دیتے ،تب وہ بے اختیار کمرے سے آنگن میں عین اس جگہ جا کھڑا ہوا جہاں اس کے امی ابا کے

ہاتھ کا لگا کبھی وہ پیڑ ہوتا تھا۔ جس کے نیچے چارپائی بچھا ہاتھ کا تکیہ بنا کر کتنی ہی دیر پرسکون سوتا تھا۔ عارف بے اختیار اس درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تلاش کرنے لگا، جسے اپنی اماں کی شدید مخالفت کے باوجود وہ اپنے کلہاڑے کی نذر کر چکا تھا۔ چڑیوں کی سویرے کی تسبیح اور کوؤں کی سماجی پیغام رسانی اسے بے طرح یاد آنے لگی۔ ''میرے جیسے جانے اور کتنے عارف ہوں گے جو فطرت کی نغمگی کو چڑیوں کی ہڑبونگ اور کاؤوں کی سماجی پیغام رسانی کو محض کائیں کائیں سمجھ کر ان سے جان چھڑانے کو ماں کے جیسی ٹھنڈی چھاؤں رکھنے والے پیڑوں کو کاٹ کر ہمیشہ کے لیئے سلگتی دھوپ میں آبیٹھتے ہوں گے۔

☆☆

نورالعین ساحرہ

اسنومین

آبائی وطن- پاکستان
مقیم - امریکہ

خرمن، مزگاں، ثالث، اردو دنیا، ادبیکا جیسے ادبی جریدے میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ملتان اور یوکے سے بیک وقت شائع ہونے والے بائی لنگوئل فیملی میگزین 30days کے علاوہ انڈیا سے شائع ہونے والے مشہور ادبی مجلّے (راوی) کی مدیرہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

....

باہر برف پڑ رہی تھی اور مسلسل پڑ رہی تھی۔ ایک گھر نما چار دیواری کے اندر ضمیر نے بڑبڑاتے ہوئے کمبل گھسیٹا اور اپنا منہ دیوار کی طرف کر کے خراٹے لینے لگا۔ کچھ ہی دیر پہلے یہ اندھیری رات برف اوڑھ رہی تھی اور زندگی ٹھٹھرتی سکڑتی زمین کی گود میں ستانے لگی تھی۔ ضمیر کی بیوی لحہ لحہ تنہائی اور اپنے شوہر کی مجرمانہ بے پروائی کے کرب میں سسک رہی تھی۔ وہ نشے میں دھت دھڑام سے آ کر بستر پر گرا۔ وہ ایک کونے میں لیٹی ہوئی ایک دم اٹھی اور اسے سنبھالنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ وہ ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔۔۔۔

''دفع ہو جا یہاں سے۔۔۔ کتنی بار کہا ہے سونے سے پہلے اپنے ہاتھ اچھی طرح صابن سے دھویا کرو۔ بدبودار عورت'' وہ منہہ ہی منہہ میں بڑبڑایا۔ ساری رات

مجھے بستر میں کبھی آئیوڈین اور کبھی لہسن پیاز کی بو آتی رہتی ہے۔ ویسے تو پہلے سے تمھارے ہاتھ اتنے کھردرے اور بوڑھے سے لگتے ہیں کہ دیکھ کر دل خراب ہو جائے اس پر اتنے بدبودار بھی رکھتی ہو'' اس نے کروٹ بدلتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنی نفرت کے تیر آرزو کی طرف اچھالے۔ آرزو چپ رہی۔۔۔۔۔ ''میری تو زندگی عذاب کر کے رکھ دی اس جاہل عورت نے۔ پتا نہیں کہاں سے ڈھونڈ لی گھر والوں نے، نہ شکل نہ عقل، پہننے اوڑھنے کا کوئی سلیقہ نہ جینے کے ڈھنگ سکھائے تمھاری ماں نے'' وہ بولے چلا جا رہا تھا۔

آرزو چپ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ماں نے اسے گرین کارڈ کے ساتھ بیاہ کر جب امریکہ رخصت کیا تھا تو یہی کہا تھا کہ شریف لڑکیاں جس گھر میں سرخ جوڑے میں داخل ہوتی ہیں وہاں سے سفید کفن میں رخصت ہوتی ہیں وہ ضمیر کی اس روز مرہ بک بک کے جواب میں چپ اپنی مخروطی انگلیوں کو اپنی تلیوں سے مسلتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کیا وہ آئندہ اپنی ساس کو آئیوڈین کی مالش کرنے سے اس لئے انکار کر دے کہ یہ آئیوڈین ضمیر کی اس سے دوری کا سبب تھی یا پھر کچن میں جانے سے صاف انکار کر دے کہ لہسن اور پیاز کی بو اس کے خاوند کو شراب کی بدبو سے زیادہ بری لگتی ہے۔۔

کس منحوس گھڑی تم میرے۔۔۔۔۔ پاکستان ہوتا تو بتیس روپے ہاتھ پر رکھ کر فارغ کر دیتا، مگر اس امریکہ میں آدھی جائداد اور روپیہ دے کر رخصت کرو۔۔۔ لعنت ہے ایسے ہیومن رائٹس پر۔۔۔۔۔۔" اس نے خود کلامی کرتے کرتے کروٹ بدلی،

آرزو پھر چپ!!!

''بولتی کیوں نہیں کچھ،،، یو۔۔۔ بچ۔۔۔ سالی۔۔۔۔۔ حرامزادی۔۔ اب کیا گونگی بہری بھی ہو گئی ہو،،،؟''

''دونوں بچے بہت بیمار ہیں،،،'' وہ سسکی۔ ''شرم آنی چاہئے تمہیں، کچھ بھی تو نہیں سنبھالا جاتا تم سے، نہ گھر نہ اپنا آپ نہ بچے،،،،'' ''کوئی وجہ بھی ہو گی ان کی بیماری کی،،،؟'' چیختے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''آپ نے ان سے کئی بار وعدہ کیا تھا،،، ایک دن ان کے ساتھ مل کر اصلی والا بڑا سنو مین بنائیں گے۔ دو مہینے ہو چکے مگر آپ کو تو شاید کبھی

فرصت نہیں ملے گی۔ آج بھی بہت ضد کر رہے تھے تو میں نے ان کو اکیلے ہی لان میں بنانے کی اجازت دے دی تھی''

''مطلب،،،تو کم عقل تو پہلے سے ہی ہے منحوس عورت۔۔۔۔آج اندھی بھی ہوگئی تھی کیا،،روکا نہ گیا ان کو برف سے کھیلتے؟

آرزو چپ رہی،،،،اسے اپنا گھر جو بچانا تھا۔اگلی صبح ضمیر نے دروازے سے اتنے زور سے آواز دی کی آرزو پراٹھا پلٹنا بھول گئی جو اپنی نند کے بچوں کے لئے بنا رہی تھی۔اسکی دونوں نندیں جاب پر جانے سے پہلے اپنے بچے یہی سٹنگ کے لئے اس کے حوالے کر جاتی تھیں اور ناشتے کے علاوہ شام کا کھانا بھی یہیں کھاتی تھیں۔اسی طرح بھاگ کر شوہر کی خدمت میں جا حاضر ہوئی۔''یہ سب کیا ہے،،،،؟'' آرزو نے چپ چاپ پہلے ضمیر کی طرف اور پھر اس طرف دیکھا جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔لان میں ایک سنو مین کا برفانی بت ایستادہ تھا جس کے اوپر ضمیر کی ٹائی،ٹوپی اور پرانے کوٹ کے بازو لٹک رہے تھے اور اس طرح نظر آرہا تھا جیسے بچوں نے اس کا کوٹ پہنانے کی پوری کوشش کی ہو۔''یہ کیا ہے،،،''اس نے تقریبا چیختے ہوئے پوچھا۔اپنی صفائی دیے بغیر وہ واپس کچن کی طرف مڑی۔آرزو یہ سب باتیں ضمیر کو بتانا چاہتی تھی مگر کب کیسے کہاں؟ ویسے بھی وہ اس کو دیکھتے ہی ایک ساتھ اتنی طرف سے حملہ کرتا کہ وہ دفاع کرنے سے پہلے ہی پسپا ہو جایا کرتی کہ آخر اکیلی کس کس محاذ پر لڑتی۔پھر بھی شکریہ کا ایک لفظ تو بہت دور کی بات ہر وقت ڈانٹ پھٹکار اور طعنے تشنوں کی منتظر ہی رہا کرتی۔آرزو کا دل چاہتا کہ دھاڑیں مار مار کے روئے،لیکن چپ کی قسم اسے چپ ہی رکھتی۔یہاں تک کہ اس کے دل میں فاصلے کی خواہش جنم لینے لگی۔ہزار بار سوچا تھا کہ فلاں بات کا فلاں جواب دے گی،یہ کہے گا تو وہ کہے گی لیکن وہ رات بھر سوچتی رہتی اور صبح ہوتے ہی اس کی بے ضرر معصوم سی بغاوت کا خیال دھواں بن کر چمنی کے راستے ہوا میں تحلیل ہو جاتا اور وہ ہر روز کی طرح پھر سے نئے زخم کھانے کو تیار ملتی۔

دوسری طرف ضمیر نے کبھی پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں تھا۔ایک کمرے میں سوتے

تھا، کہتا ہے کہ کس طرح ساڑھے نو بجے خواتین کی بڑی تعداد جن کے ساتھ مرد بھی تھے، عمارت پر چڑھ کر دفتروں میں گھس گئیں۔ ایک چشم دید گواہ نے کہا کہ اُن کے پاس ڈنڈے اور نیزے تھے جبکہ دوسرے کا کہنا ہے کہ اُن کے پاس کلہاڑیاں اور بندوقیں تھیں۔ ایک خزانچی، جس نے حملہ آوروں سے احتجاج کرنے کی ہمت کی تو اُسے بتایا گیا کہ ''ہم اس ٹاؤن ہال کے مالک ہیں۔ 'اسلحے اور بارود کی تلاش انھیں نہیں تھی۔ 3.5 ملین Livre سے زائد کی رقم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا اور غائب شدہ بینک نوٹوں کو چند ہفتے بعد اُسی حالت میں واپس کیا گیا۔ دستاویزات اور روزنامچے پھاڑ دیئے جب برج سے خطرے کی گھنٹی بجی تو مظاہرین گیارہ بجے Place Gred کے باہر جمع ہو گئے۔ اسی دوران میلارڈ اور اُس کے رضا کار موقع پر پہنچ گئے۔ اُس کے مطابق خواتین باٹلی اور لیفایٹ کو مار ڈالنے کی دھمکی دے رہی تھیں۔ اس طرح کے حادثے سے بچنے کے لیے 'وطن پرستوں' کے سیاسی عزائم کی خاطر میلارڈ نے ورسائی کی طرف بارہ میل کے مارچ کی قیادت کی تا کہ بادشاہ اور اسمبلی سے پیرس کے لیے روٹی کا مطالبہ کر سکے۔ جب سہ پہر کو وہ روانہ ہوئے تو اُنہوں نے شیطلے سے توپوں کو ہٹا دیا۔ ہارڈی لکھتا ہے کہ اُنہوں نے ہر طرح کی خواتین کو اپنے ساتھ شامل ہونے کی ترغیب دی۔''

یہاں ہمیں بالکل واضح نظر آتا ہے کہ پیرس کی محنت کش خواتین نے جدوجہد کو کس انداز میں دیکھا تھا۔ اپنے مردوں کی بے عملی سے تنگ آ کر وہ خود پر جوش انداز میں جدوجہد میں کود پڑیں اور سب کچھ بہا لے گئیں۔ لیکن کسی بھی لمحے اس انقلاب میں شامل عورتوں نے جدوجہد کو 'عورت بمقابلہ مرد' کی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ غریب اور مظلوم طبقات کی''

بھی وہ کئی سڑکوں، چوراہوں اور گلیوں بازاروں کے فاصلے پہ رہتا۔ ضمیر کی جاب اچھی تھی اور خواہش اس سے برتر۔ انہی خواہشات کی انگڑائیوں میں غلطاں وہ بھولتا جا رہا تھا کہ اس کا کوئی گھر بھی ہے جس میں بیوی بچوں کی خواہشات پہ برف پڑتی جا رہی ہے۔ دونوں بچے بڑے ہو رہے تھے لیکن بجائے سکول جانے کے وہ سارا دن کھیلتے رہتے یا لان میں پڑی برف سے سنو مین بناتے رہتے۔ کبھی باپ کا کوٹ کبھی اس کے جوتے اور کبھی اس کا سکارف اسکے گلے میں لٹکا کر کلکاریاں مارنے لگتے یا کھلکھلاتے۔ جب بھی ان کے سکول کی بات چھڑی ضمیر کا پارہ چڑھ گیا اور سارا گھر سہم کر سکڑنے لگتا۔ بات بات پہ سیخ پا ہونا اس کا معمول تھا۔ اس لئے آرزو نے اپنی روایتی چپ سے استفادہ کرتے ہوئے اسے اس کے حال پہ چھوڑنا شروع کر دیا۔ مگر جب اسے یہ احساس ہوا کہ ضمیر کی زندگی میں اس کا کوئی مقام نہیں اور نہ کبھی بنے گا تو اس نے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کے بارے میں خود سوچنا شروع کر دیا تھا۔ موسم کھل رہا تھا اور مقامی سکول بھی۔ ایک رات، بچوں کی خاطر، اسے بھی لہجے میں تبدیلی کرنی پڑی اور بچوں کے ایڈمشن کا ذکر کیا۔ اور یہ بھی کہا کہ وہ خود سکول جائے گی۔ ضمیر کو اور کیا چاہئے تھا اس نے تو شکر کا کلمہ پڑھا کہ یہ ذمہ داری بھی کم ہوئی اور خود تصور میں سوزن سے ہونے والی اگلی ملاقات کے بارے سوچنے لگا۔ سوزن اس کے آفس میں کام کرنے والی طرح دار حسینہ تھی۔ سنہری بال، سفید رنگت اور سبز آنکھیں اور کسا ہوا بدن، اس پر پڑنے والی ہر نظر پلٹنا بھول جاتی تھی۔ شکل کے ساتھ ساتھ اسکے ہاتھ بھی بہت خوبصورت تھے اور اس کی خوبصورت مومی انگلیوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ ضمیر کا دل بھی دھڑکا کرتا تھا۔ تصور میں وہ جب بھی اپنی بیوی آرزو کی کٹی پھٹی سخت انگلیوں کا موازنہ سوزن کی نرم و نازک انگلیوں سے کرتا تو اس کا دل اپنی بیوی کے خیال سے کراہیت سے بھر سا جاتا۔ پہلے سے بھی زیادہ اپنی بیوی سے نفرت محسوس کرنے لگتا۔

ضمیر اپنے خواب کی تکمیل اور سوزن کے خیال میں آج کل اتنا مدہوش رہتا کہ لڑنا بھی بھول گیا۔ سونے سے پہلے خیالوں میں وہ سوزن کی مومی انگلیوں کو یاد کرتا رہتا جو تیزی سے کمپیوٹر پر چل رہی ہوتی تھیں اور ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیلتی جاتی تھی۔

سب کو معلوم تھا وہ اس وقت چیٹنگ پر ایک ساتھ کئی بوائے فرینڈز کے ساتھ مصروف گفتگو ہے۔ ان میں سے کچھ تو قصہ پارینہ بن چکے تھے مگر جب بھی ان کی جیب بھاری ہوتی تو تجدید وفا کرنے کو سوزن کے پاس آدھمکتے، کچھ نئے عشاق حال کو بڑی خوشی سے سوزن کے ساتھ جی رہے تھے اور کچھ مستقبل میں اس کی خوبصورتی کو کیش کروانے والے تھے۔ وہ سب کو خوش رکھنے کا فن جانتی تھی۔ اپنی خوبصورتی اور اداؤں سے کئی ضرورت مند شادی شدہ مردوں کو ان کی بیویوں کے لئے برف کی سلیں بنا چکی تھی۔ خود سوزن کی محبت کسی انسان سے نہیں بلکہ صرف اس کے سامنے والے مرد کے ہاتھ میں پکڑا ہوا چیک ہی ہوا کرتی تھی جو اس کو مہنگی سے مہنگی شاپنگ کروا سکے یا اس کے بل ادا کردے۔ وہ خوشی خوشی کسی کے بھی ساتھ اس کے گھر رہنے چلی جاتی تھی یا کسی پیسے والے کو اپنے گھر رکھنے لے آتی تھی۔ بہت سے لوگوں کو ایک ہی وقت میں اپنی پکی محبت کا یقین دلا کر الو بناتی اور ان لوگوں سے پیسے بٹور کر اپنی رنگ رلیوں کے ساتھ ساتھ گاڑی اور گھر یلو قرضے کی قسطیں چکانے کے علاوہ خوب عیاشی کی زندگی گزار رہی تھی۔ جیسے ہی ان عاشقوں کے پاس پیسے ختم ہو جاتے تو ان کو اپنی زندگی سے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک دیتی تھی۔ ضمیر یہ سب اچھی طرح جانتا تھا مگر پھر بھی اس کے پاؤں تلے زمین سرکتی چلی گئی اور وہ بحر بے کنار میں ہچکولے کھانے لگا تھا۔ سارا دن اس کو آفس میں دیکھ دیکھ کر اس کی نظروں کی پیاس تو کیا بجھتی اب تو وہ ہر حال میں اس سے کچھ آگے کا سفر طے کرنا چاہتا تھا۔ اسکو سوزن کی قیمت اور پسند سب معلوم ہو چکا تھا اور وہ بھی اس بہتی گنگا میں ایک بار ہی سہی مگر ہاتھ دھونا ضرور چاہتا تھا۔ بیوی بچوں کی ضروریات سے بے نیاز ضمیر سوزن کی خوشنودی کے لئے آئے روز مہنگے کپڑوں، پرفیومز اور کئی ایسے تحفے تحائف لٹانے لگا جو اس کے گھرنے سالوں سے نہ دیکھے تھے۔ اگر کبھی بھولے سے بھی آرزو کسی بہت معمولی ضرورت کی چیز کی فرمائش بھی کرتی تو وہ اس کو بری طرح ڈانٹ دیتا، اس کو ماضی کی غربت اور اوقات کے طعنے دیتا اور وہی ازلی چپ اس کا مقدر ٹھہرتی۔ سب گھر والے اس تبدیلی کو محسوس کر چکے تھے مگر سماج میں جس طرح مرد کی پاکدامنی اور اخلاقیات پہ کوئی

سوال نہیں اٹھتا اسی طرح ساس سمیت سارے چپ ہو رہتے۔ الٹا آرزو کو سمجھاتے کہ خاموشی میں ہی بھلا ہے۔ چپ ہی عورت کا زیور ہے۔ یہ ضمیر کا چند روزہ شوق ہے۔ کچھ عرصے بعد خود ہی واپس آ جائے گا۔ موسم ایک بار پھر بگڑا، بارشیں بھی ہوئیں اور برف باری بھی۔ بچے ہر روز سنو مین تعمیر کرنے کے بارے میں سوچتے کہ یہی واحد دلچسپی ان کو میسر تھی لیکن طوفان تھمے تو باہر نکلیں۔ کبھی ماں اور کبھی باپ سے، کئی بار انہوں نے برفانی طوفان کے رکنے کا پوچھا تھا، باپ سے کئی بار وعدہ لیا وہ اس بار ان کے ساتھ مل کر بڑا سا اصلی سنو مین ضرور بنائے گا کہ وہ کھلونے والے سنو مین سے کھیل کھیل کر تھک چکے تھے۔ لیکن برف پگھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ہوا، پانی، سانسیں سب کچھ منجمد ہوتا جا رہا تھا۔ آرزو کا شدید دل چاہنے لگا کہ کہیں اور، کسی ایسی جگہ جہاں پرندوں کی سیٹیاں، ہرنوں کی قلانچیں ہوں، پھولوں کی کیاریاں اور رنگ برنگی تتلیاں ہوں، وہاں شفٹ ہو جائے۔ اس جمے ہوئے ماحول سے باہر نکلے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نوکری کرنے کی خواہش کا اظہار گھر میں بھی کر دیا تھا۔ جب ضمیر کے کانوں تک یہ خواہش پہنچی تو ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پہ پھیل گئی۔ جھٹ سے اس نے جواب دیا 'ہاں باہر جاب کر لو کہیں،،، کسی نزدیکی فیکٹری میں اور جو چاہتی ہو کرو۔ یہاں ہر عورت کام کرتی ہے گھر میں ہو یا باہر۔' سو دو دن بعد ہی آرزو نے جاب شروع کر دی، اسی دن کا تو شاید ضمیر کو انتظار تھا۔

سوزن کے بل اتنے بڑھ گئے تھے کہ گھر کے خرچے ادا کرتا تو سیدھا بلیک لسٹ ہو جاتا۔ کئی بنکوں سے کریڈٹ کارڈ بنوا چکا تھا جن پہ سود ایسے بڑھتا جا رہا تھا جیسے گھر کی در و دیوار پہ برف جم رہی تھی۔ سوزن تو پہلے سے ناراض بیٹھی تھی کہ اس نے نہ کوئی شاپنگ کروائی نہ کسی اچھے ہوٹل میں لے کر گیا۔ ضمیر بہت دنوں س بعد سوزن کو منانے کے چکروں میں جب اس پر ہزاروں ڈالر لٹا چکا تو سوزن اسے اپنے گھر لے جا کر کچھ دن رکھنے پر راضی ہو گئی اور محبت کے جھوٹے دعوے بھی کرنے لگی۔ اگلے دن آرزو جاب پہ تھی اور ضمیر اپنا سامان اٹھا کر سوزن کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو ہی گیا۔ دن رات سوزن کی مومی انگلیوں کو چھو چھو کر اپنے تشنہ آرزوؤں کو بہلایا کرتا۔ وہ سب سے زیادہ سوزن کی

انگلیوں کا ہی شیدائی تھا۔ وہ ان کو چھو کر خود کو جنت میں محسوس کرتا تھا۔ یہ نرم گرم انگلیاں جب اس کے جسم پہ اٹکیلیاں کرتیں تو وہ فتح کے نشے میں سرشار اپنے آپ پہ رشک کرتا۔ دن کے وقت وہ سوزن کے ساتھ دفتر میں اور رات اس کے ساتھ گھر میں موجود رہتا۔ مسئلہ اس وقت ہوا جب رقابت کی آگ اس کی شریانوں میں بڑھکنے لگی تھی۔ سوزن کا دل اس سے اچاٹ ہونے لگا اور وہ اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ راتیں باہر گزارنے لگی۔ ضمیر شراب پی کر وہیں پڑا رہتا۔ منہ میں بڑبڑاتا گالیاں بکتا اور اور اس کو بدچلنی کے طعنے دینے لگا۔ جن موی انگلیوں کو چوس چوس کر زندگی کا رس نکالتا تھا اب وہی اسے بدبودار محسوس ہونے لگیں۔ جب ساری جمع پونجی ختم ہوگئی اور قرض بڑھنے لگا تو سوزن کی نظریں بدلنے لگی۔ وہ بار بار اس کو ذلیل کرنے لگی۔ تب اسے اپنے گھر کے پکے پکائے کھانے، دھلے دھلائے کپڑے اور صاف ستھرے گھر کی یاد ستانے لگی۔ ہر وقت شراب اور شباب کے نشے میں دھت وہ کبھی یہ بھی اندازہ نہ کر سکا کہ اسے یہاں ٹھہرے کتنا عرصہ بیت گیا ہے۔ آرزو اس دوران اپنے قدموں پہ کھڑا ہونا، چلنا اور اس نئے معاشرے میں جینا سیکھ چکی تھی۔ اس نے اپنے اور اپنے بچوں کے تحفظ کی خاطر قانونی مشاورت بھی کر لی تھی۔ جس سکول میں اس کے بچے پڑھتے تھے وہیں کچھ اور پاکستانی فیملیز کے بچے بھی موجود تھے جن کے والدین سے کچھ نہ کچھ معلومات لیتی رہتی۔ ان کی وجہ سے بچوں کے پارک، شاپنگ سنٹرز اور گروسری کے مراکز سے بھی مانوس ہوگئی تو اس میں ایک خود اعتمادی پیدا ہونے لگی جس کا اس نے صحیح استعمال کیا اور چند ہی دنوں میں وہ آسانی سے بیرونی دنیا سے رابطے میں آ گئی۔ اور بچے،،، برف باری رکتی تو وہ گھر میں کھیل کود کرتے اور اپنے باپ کو یاد کرنے کے لئے سنو مین بنا کر باپ کے پرانے کپڑے پہنا دیتے۔

ایک دن تو حد ہوگئی جب شراب کے نشے میں چور ضمیر سوزن پہ ایسے گرجنے لگا جیسے وہ اسکی بیوی ہو۔۔ وہ آج بھی رات کو دیر سے لوٹی تھی۔ باہر اتنی تیز برفباری ہو رہی تھی کہ کوئی جانور بھی ڈھونڈے سے دیکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کا گھر شہر سے تھوڑا ہٹ کر ایک کم آباد علاقے میں تھا۔ رات کو بارش یا برف باری ہوتی تو یہاں کا سناٹا مزید

بھیانک ہو جاتا۔ آج کی رات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ کبھی ہلکی بارش اور کبھی تیز برف باری، درجہ حرارت ایسا کہ حرارت نام کی شے سرے سے غائب۔ ہر طرف گھٹنوں تک برف جم چکی تھی۔ رات کے وقت اس علاقے میں ٹریفک کم ہی ہوتی۔ اور گہری رات میں تو شاید ہی کوئی گاڑی ادھر آپاتی۔ سڑکوں سے برف صاف کرنے والا عملہ صبح اپنی گاڑیوں پہ پہنچتا اور برف ہٹانے کا کام شروع کرتا۔ سوزن کے گھر پہنچتے ہی وہ چیخنے لگا۔ اس دن تو اس نے ساری پاکستانی گالیاں بھی اس کے جسم میں اتار دیں جنہیں سوزن سمجھ تو نہ سکی لیکن 'بچ' کا لفظ جب اس کے کانوں سے ٹکرایا تو وہ اس کے سامنے آئی، اس کا بازو پکڑا اور باہر دروازے کی طرف گھسیٹنے لگی۔ مارے غصے کے وہ چیختی جا رہی تھی۔ جب ضمیر نے باہر نکلنے سے انکار کیا تو اس نے پولیس بلانے کی دھمکی دی۔ پولیس کے نام سے وہ ایسا گھبرایا کہ نشہ کافور ہونے لگا۔ سوزن نے اسے دھکے مار کر گھر سے نکال دیا۔ ضمیر بہت رویا پیٹا۔ اس نے سوزن کی بہت منتیں کیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی ''صبح ہوتے چلا جاؤں گا، اتنے طوفان اور رات میں کہاں جاؤں؟'' مگر سوزن نے ایک ناسنی اور 911 کو کال کرنے کی دھمکی دے کر اپنا دروازہ بند کر لیا۔ اسی دھکم پیل میں اسکا سیل فون بھی نیچے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ اس سناٹے میں وہ کہاں جاتا وہ بھی نشے کی حالت میں۔ سو وہیں کھڑا دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو لیکن اس کا سامان، کپڑے، ٹوپی اور اسکارف اس پہ پھینک کر سوزن نے دوبارہ لاک کر لیا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس کو اپنا گھر، اپنی بیوی، ماں اور بچے بہت یاد آنے لگے۔ اسکا دل تڑپ رہا تھا۔ اگر وہ اپنے گھر چلا جاتا تو آرزو یقیناً اس کے قدموں میں بیٹھ کر معافی مانگ لیتی۔ اپنا سامان اٹھائے وہ مین روڈ کی طرف بڑھنے لگا جہاں ذرا دور ایک بڑا شاپنگ مال تھا۔، ڈر تھا کہ اس حالت میں اسے پولیس نہ دیکھ لے۔ اسکارف سے اپنے چہرے پر پڑی برف صاف کرتا تھوڑے فاصلے پہ پہنچا تو اپنے قدم برف میں دھنستے ہوئے محسوس ہوئے۔ جوتے بھی ایسے نہیں تھے کہ اس کے پیروں، ٹخنوں اور ٹانگوں کو محفوظ رکھتے۔ اس کے پاوں سن ہونے لگے۔ اس نے پوری قوت لگا کر ابھی چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ گرنے لگا۔ اپنے ہاتھوں سے پکڑ

کر اس نے اپنے پاوں برف سے باہر نکالے۔ ایک قدم باہر نکلتا تو دوسرا برف کے اندر دھنس جاتا۔ وہ پھر قوت صرف کرتا اور گرتے پڑتے دوسرا نکالتا۔ اسی تگ ودو میں اس کا سانس پھولکیا اور ہاتھ بھی جمنے لگے۔ بار بار ٹوٹے ہوئے فون سے 911 کو فون کرنے کی کوشش کرتا مگر وہ کام کرتا نظر نہ آتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کا واسطہ اس خطرناک موسم سے تنہا پڑا تھا۔ گھر کی یاد تنگ کرنے لگی تو جلدی جلدی ہاتھ پاوں چلانے لگا لیکن اس کے منجمند پاوں اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ گھٹنے تھے کہ جیسے جان ہی نہیں۔ ہانپ کر بری طرح گرا اور اور پیر گھسیٹنے لگا۔ بڑی مشکل سے ان کو برف سے نکالا اور کہنیوں کے بل ایک قریبی لیمپ کی طرف رینگنے لگا۔ اس طرح چند فرلانگ اس نے طے کئے۔ برف اس کے گرد لپٹی ایسے تکلیف دے رہی تھی جیسے برفانی بھیڑئے کسی مردہ جانور کو نوچ رہے ہوں۔ ہر سانس کے ساتھ پچھتاوا بھی بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ برف پر گھسیٹتے ہوئے اس نے لیمپ کی طرف بڑھنا چاہا تا کہ سہارا لے کر کھڑا ہو سکے۔ اس کا یہ فیصلہ بھی غلط ثابت ہوا۔ سڑک کے کنارے نظر نہ آنے والی ایک ڈھلوان میں جا گرا۔ دیار غیر کی سفید برف اس کے اندازے سے کہیں زیادہ سرد نکلی۔ وہ اپنے ہاتھ اس برف سے بچانے لگا اور غور سے اندھیرے میں سن انگلیوں کو دیکھنے لگا۔ وہ بے جان ہو رہی تھیں اور ان سے ٹیسیں نکل کر اس کے دماغ کی شریانوں تک پہنچنے لگی تھیں۔ اسے اپنے آپ پہ بہت رونا آیا۔ سوزن کی مومی انگلیاں بھی یاد آئیں اور آرزو کی کھردری انگلیاں بھی۔ اس کا جی چاہا کہ زور زور سے آرزو کو آوازیں دے، چیخے چلائے۔ گھر کا گرم نرم بستر، بچوں کی کلکاریاں اور آرزو کے پراٹھے بناتے ہاتھ اسے یاد آنے لگے۔۔ کچھ بولنے کی کوشش کی تو محسوس ہوا کہ اس کی آواز بھی جم رہی تھی۔ ہر شے جم رہی تھی، نچلا دھڑ، سن ہو چکا تو اس نے اپنا اسکارف نکالا اور گرم سانس سے انگلیوں کو ٹکور کرنا چاہا، اب تو کہنیاں بھی جواب دینے لگیں۔ پھر بازو اور پھر سارا جسم۔ اوپر سے پڑنے والی برف بھی زوروں پہ تھی۔ اب تو کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہا۔ کچھ ٹوٹے ٹوٹے منظر خیال میں ابھرتے اور پھر برف کی سفیدی میں ڈوب جاتے۔ شریانوں سے ہوتی برف اس کے دل تک پہنچی تو اس نے ہمت ہار

دی۔ سردی کے مارے اسکی ہڈیاں چیختی رہیں اور وہ آخر کار ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا حتی کہ آہستہ آہستہ برف نے اس کو پوری طرح اپنے اندر چھپالیا۔

تین دن تک شہر میں ہر چیز بند رہی اور کاروبار حیات معطل رہا۔ اگلا دن اتوار کا تھا، ہر چھٹی کے دن بچے ماں سے ضد کرتے کہ شاپنگ پہ انہیں بھی ساتھ لے جائے۔ ''اچھا بابا ٹھیک۔ چلو میرے ساتھ''۔ آرزو نے صاف ہوتے موسم میں بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک بس میں سوار ہو چکے تھے جو مغربی علاقے سے ہوتی ایک شاپنگ سنٹر کی طرف جاتی تھی۔۔ آزرو کو کسی نے بتایا تھا کہ وہاں سے بچوں کے کپڑے اور دوسری ضرورت کی اشیا ایک نئے سٹور سے سستے داموں مل جاتی ہیں۔ آج اس نے سرخ رنگ کا لانگ کوٹ پہنا۔ اس کے سلم سمارٹ جسم پہ وہ خوب جچا تھا۔ وہ ایک پراعتماد عورت کی طرح زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چل رہی تھی۔ سفید برف سے پھسلتی روپہلی سورج کی کرنیں اس کے خوبصورت چہرے کو عجیب سی چمک دے رہی تھیں۔ بچے بھی خوش تھے کہ نئی جگہ دیکھنے کو ملے گی۔ کبھی سورج نکل آتا اور کبھی بادلوں کی اوٹ میں چلا جاتا۔ بس رواں دواں تھی کہ اچانک راستے میں ایک پول کے پاس کچھ لوگ دکھائی دینے لگے۔ وہ ایک جگہ کھڑے ہو کر کچھ دیکھ رہے تھے۔ آرزو اپنے خیالوں میں گم اپنے ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں کو دیکھ رہی تھی جن پہ مختلف انگوٹھیاں اس کی گندمی جلد کو حرارت دے رہیں تھیں۔ ایک گہری خاموشی سے اس نے اپنے ہاتھوں کو سونگھا۔ لہسن پیاز کی بو کا نام ونشان تک باقی نہیں تھا اور اس کو یہ احساس دلانے والا بھی تو کہیں نہیں تھا۔ بس مال کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس میں بیٹھے کچھ افراد نے اچانک چیخنا شروع کر دیا۔ وہ سب گھبرائے ہوئے باہر کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اس نے باہر ایک پول کے پاس کچھ پولیس والوں کو دیکھا جو برف میں دبی اکڑی ہوئی ایک لاش نکال رہے تھے۔ شیشوں کی طرف بچے بیٹھے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ دونوں خوشی سے چلائے۔'' ماما دیکھیں اصلی والا،،، بڑا اسنومین،،، جیسا پاپا نے بنا کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔

☆☆

شہناز یوسف

نیم کا پیڑ

مقیم۔اودے پور (راجستھان)
(یہ افسانہ سہ ماہی صدف میں شامل ہے)

.....

اکثر فجر کی اذان کے ساتھ میری آنکھیں تو کھل جاتیں لیکن ایک مکمل دن کا آغاز اس وقت تک نامکمل ہوتا کہ جب تک اپنی بالکونی سے باہر جھانک کر سامنے لگے وہ نیم کے پیڑ کو دیکھ نہ لیتی۔ جس پر ہر صبح چڑیوں کا چہچہانا میرے مزاج کو خوش فہم بنا دیتا۔ میں اکثر سوچا کرتی: کیا یہ پرندے بھی نماز پڑھتے ہیں؟ اور دل ہی دل میں مسکرا کر اپنے روزمرہ کے کاموں کی طرف بڑھ جاتی۔

دراصل اس نیم کے پیڑ کی بڑی ہی دلچسپ کہانی ہے۔ اس کا یونیفارم ہی یہی تھا، ہماری کالونی کے سامنے قریب کی بستی میں رہنے والی ''کانتا بائی'' جو پیشے سے بھنگن تھی مگر بڑی ہی صاف ستھری۔ صبح صبح وہ سفید ساڑی پہن کر آتی، جو کہ ان کا ڈریس کوڈ تھا اور جس میں چھوٹی چھوٹی لال بوندکیاں تھیں۔ دور سے سر پر کچرے کا ٹوکرا اٹھائے ایسے چلی آتی جیسے سماج میں پھیلی ساری گندگیوں کو اپنے ٹوکرے میں بھر کر سڑکوں کو اپنی ساڑی کی مانند اجلا کر دیگی۔ یقیناً وہ ایسا کر بھی دیتی تھی۔ میں اکثر اس کے ماتھے پر چمکتی بڑی سی لال بندی جو کہ ان کے چہرے کی سرخی کو دوبالہ کر دیتی دیکھ کر چھیڑا کرتی۔

''کیا بات ہے کانتا بائی، قیامت ڈھاتی ہیں آپ تو۔'' میرے اس جملے پر وہ شرما جاتی لیکن اسی دم سنبھل کر منھ بنا کر کہتی ۔۔''چپ رے موئی، جدی دیکھو مسخریاں سوجے تھنے۔''

کانتا بائی کا اکلوتا بیٹا تھا سونو، بڑا ہی شریر۔ ایک دن پتنگ کی ایک ڈور پکڑنے کے چکر میں چھت سے گر پڑا۔ کانتا بائی کا رو رو کر برا حال تھا۔ آخر شرابی شوہر کی وجہ سے زندگی سے بیزار کانتا بائی کا سونو ہی آخری سہارا تھا۔ ہم سبھی کانتا بائی کو حوصلہ دینے لگے۔ مختلف درختوں اور پودوں کی عبادت ان کے مذہبی عقیدت کا حصہ تھی اور اسی لئے کانتا بائی نے اپنے گھر کے باہر چھوٹا سا چبوترہ بنایا تھا جہاں لگائی تلسی کی وہ روز صبح پوجا کیا کرتی تھی۔ لہٰذا اس بار بھی پوجا ہوئی اور پوجا گیا نیم کا پیڑ۔ دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ سونو چھت سے گرنے کے سبب چلنے پھرنے سے قاصر تھا اور کانتا بائی اس کی تیمارداری میں کوئی کمی نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ لہٰذا اپنی منت کو ایک دھاگے میں باندھ نیم کے ساتھ لٹکا دیا۔ ان کے اس عجیب عمل پر میں نے سوال اٹھاتے ہوئے کہا۔'' کانتا بائی، یہ کیا اندھ وشواس ہے۔ ڈاکٹر کی دوائی سونو کو جلد اچھا کر دیگی۔ اور چلئے اگر آپکو اس سے سکون ملتا ہے تو ٹھیک ہے لیکن آپ تو پیپل پر منت باندھتی ہو نا، پھر یہ نیم کا پیڑ کیوں؟''

کانتا بائی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔'' اب اٹے پیپل کٹوں لاؤں۔ مندر بھی دور پڑے اور میں چھورا نے چھوڑ نی جا سکوں اور ویسے بھی ہر پیڑ پودھا میں اسور نواس کرے اگر ماری پراتھنا چاوے گا تو اٹوں ہی سن لے گا۔'' کانتا بائی کے جزبات اور بھروسے نے میری زبان بند کر دی۔

اس واقعے کو کئی روز بیت گئے، لیکن کانتا بائی کا بھروسہ کم نہ ہوا۔ ہر روز تلسی کے ساتھ نیم بھی پوجا جاتا اور اس کی پتیوں سے سونو کی نظر اتاری جاتی۔ نہ جانے کیوں ڈاکٹر سے زیادہ بھروسہ کانتا بائی کو اس پیڑ پر تھا جو کہ میری نظروں میں کھٹکنے سا لگا تھا۔ خیر ایک صبح کسی نے آکر بتایا کہ سونو ٹھیک ہو گیا لیکن تعجب اس بات پر تھا کہ اس کے ٹھیک ہونے کی وجہ اس پیڑ کو مانا جا رہا تھا جس پر بقول کانتا بائی رہنے والے اسور نے سونو کو

ٹھیک کر دیا تھا۔ لہٰذا کانتا بائی اب سونو سے زیادہ اس درخت سے محبت کرنے لگی اور وہ درخت سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

کانتا بائی کے اس بھروسے نے سب کو اس پیڑ سے محبت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آس پاس کا ماحول بدلنے لگا۔ عورتیں اب اس پیڑ کی چھاؤں میں اپنے گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتی دکھائی دیتیں۔ بقرعید میں بکروں کے جمع ہونے کی جگہ تھی، وہ نیم کا پیڑ... چاہے محرم کے تعزیے ہوں یا نوراتری کے گھربے، ہر ایک شخص اور ریتی رواج کا مرکز بن گیا تھا یہ پیڑ۔ مجھے کئی مرتبہ لوگوں کے اس درخت کے لئے پیدا ہوئے جزبات دیکھ کر ہنسی آجاتی لیکن پھر سوچتی نیم میں بھلے اسور ہو نہ ہو لیکن کم سے کم ۳۶ گن تو ہوتے ہی ہیں۔

حالانکہ یہ پیڑ کئی برسوں سے یہیں مقیم تھا لیکن کبھی اس سے اتنا کام نہیں لیا گیا جتنا کہ کانتا بائی کی توجہ ملنے کے بعد۔ وہ ساری لڑکیوں کو نیم کی پتیوں کا پسٹ منہ پر لگانے کی صلاح دیتی اور پورے بھروسے کے ساتھ ان کی خوبصورتی میں مزید' نمافہ ہونے کا دعوٰی کرتی۔ میرے منہ بنانے پر اکثر وہ مجھے چھیڑتی: ''اری لاڑو تو بھی لگا ھمارے اس نیم کا پیسٹ پھر دیکھ تھارو منھ بھی ماری ترح چمکے گا۔''

کانتا بائی کی اس بات پر مجھے بے اختیار ہنسی سی آجاتی۔ پہلے میں انہیں چھیڑا کرتی پر اب باری میری تھی۔ بہر حال سب کچھ پہلے کی طرح ٹھیک ہو گیا۔ سونو کی شرارتیں دن بہ دن بڑھنے لگیں اور پیڑ کے آس پاس کی چہل پہل نے کانتا بائی کے چہرے کی سرخی میں مزید اضافہ کیا۔

ایک صبح جب میری نیند کھلی تو کالونی میں کچھ آوازیں گونج رہی تھیں۔ دراصل سرکاری ملازم کچھ پائپ لگانا چاہتے تھے۔ جس کے لئے انہیں ساری سڑک کھودنے کا حکم ملا تھا۔ بات سڑکیں کھودنے تک تو ٹھیک تھی لیکن مسئلہ وہاں کھڑا ہوا جب نیم کا پیڑ کاٹنے کی بات آئی۔ دراصل وہ پیڑ سڑک کے ایک حصے کی طرف ہی تھا اور اسے چھوڑا جا سکتا تھا لیکن زیادہ محنت سے بچنے کے باعث وہ اس پیڑ کو کاٹ کر پائپ لائین جلد ہی

امیر استحصال کنندگان'' کے خلاف جدوجہد کی نظر سے دیکھا۔ روٹی کے معاشی مطالبے کے ساتھ وہ ٹاؤن ہال کی طرف بڑھیں اور اسی دوران خود بخود ایک نیا مطالبہ سامنے آیا: اسلحے کا مطالبہ۔ مقصد یہ تھا کہ مردوں کو عمل پر آمادہ کیا جائے۔ اس مقصد میں پیرس کی خواتین شاندار طریقے سے کامیاب ہوئیں اور انقلاب کو بچالیا گیا۔ سیاست کے میدان میں عوام کی مداخلت کسی بھی انقلاب کی پہلی اور بنیادی خاصیت ہے۔ خاص طور پر خواتین کے معاملے میں یہ بات درست ہے۔ انقلاب فرانس میں خواتین نے سیاست کو مردوں کے لیے نہیں چھوڑا۔ پیرس میں جیکو بین کلب کی حمایتی انقلابی جمہوری خواتین بنیں جو سرخ اور سفید پٹیوں والے پتلون کی وردی اور آزادی کی سرخ ٹوپی پہنتی تھیں اور مظاہرے کے دوران اسلحہ بھی ساتھ رکھتی تھیں۔ اُنہوں نے خواتین کے لیے ووٹ اور جمہوریہ میں سب سے بڑے فوجی اور شہری عہدوں پر تعینات ہونے کے حق کا مطالبہ کیا۔ یعنی مردوں کے ساتھ مکمل سیاسی برابری کا حق اور انقلاب کے لیے لڑنے اور مرنے کا حق۔ بلاشبہ پیرس کے غریب طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین انقلابی جذبے، طبقاتی شعور اور امیروں سے لافانی نفرت سے سرشار تھیں۔ گیرونڈن خواتین، جن کا تعلق مراعات یافتہ درمیانی طبقے اور بورژوا خاندانوں سے ہوتا تھا، کے مفادات پیرس کے غریب علاقوں کی خواتین کے مفادات سے میل نہیں کھاتے تھے۔ گیرونڈنوں نے طلاق کا قانون منظور کیا جو بلاشبہ خواتین کے لئے پیش رفت تھی۔ لیکن گیرونڈن خواتین نے خواتین کے جائیداد کے حقوق پر زیادہ زور دیا۔ انقلاب فرانس کے دوران اس طرح کا مطالبہ کسی بھی طرح خواتین کی اکثریت کے لئے معنی نہیں رکھتا تھا کیونکہ نہ تو اُن کے پاس اور نہ ہی اُن کے شوہروں کے پاس کوئی جائیداد تھی۔ بائیں بازو کی غریب خواتین جنہوں نے انقلاب میں شاندار کردار ادا کیا، ''جائیداد کے مقدس حق'' کے خلاف تھیں کیونکہ وہ انقلاب کو اپنے طبقاتی نقطہ نظر سے دیکھتی تھیں۔ وہ اُن انقلابی سرخ ٹوپی پہننے والے امیر بورژوا کے سخت خلاف تھیں۔ اُنہوں نے جبلی طور پر ایک ایسی جمہوریت کے لیے جدوجہد کی جس میں مرد اور عورت صرف قانونی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر برابر

دوسری سڑک سے جوڑنا چاہتے تھے۔ پاس میں رہنے والے غنی انکل بھی سرکاری ملازموں کے سر سے سر ملانے لگے کیونکہ اس پیڑ کی پھیلنے والی جڑیں ان کے گھر کی نیو تک پہنچ کر اسے کمزور کر سکتی تھیں۔ ساتھ ہی اس پیڑ کا کچھ حصہ ان کے گھر کی نیو تک پہنچ کر اسے کمزور کر سکتی تھیں اُساتھ ہی اس پیڑ کا کچھ حصہ ان کے گھر کی طرف جھکنے کے باعث کبھی پتیاں تو کبھی پرندوں کی آمد ورفت ان کے آرام میں خلل پیدا کرتی تھی۔ لہٰذا بات طے ہوئی کہ اس پیڑ کو کاٹ دیا جائے۔ کانتا بائی کو جیسے ہی اس بات کا علم ہوا، انہوں نے پورا محلّہ سر پر اٹھا لیا۔ ان کے ساتھ سونو اور دوسرے بچے بھی ساتھ آ گئے۔ لیکن کالونی والوں نے سرکاری کام میں دخل نہ دینا ہی بہتر سمجھا۔ لہٰذا جب کانتا بائی نے دیکھا کہ کوئی ان کی حمایت نہیں کر رہا تو ان کا خون کھول گیا۔ سڑک کے بیچ جہاں سڑکوں کو کھودنے والی مشین کھڑی تھی، اس پر کھڑے ہو کر کانتا بائی نے ایک زوردار تقریر کرنی شروع کی۔

''آپ لوگوں نے شرم نی آوے، یہ لوگ ایک پیڑ کی جان لینو چاوے اور تھے لوگ چپ ہو۔ ارے روزای کی تازی ہوا کھاؤں، پتیاں چباؤں، ای کی چھایا میں گاڑی گھوڑا کھڑا کرو، اور تو اور سارا تیوہار ای کی رونکیو پیڑ بنے، اور آج کوئی انے بچانو نی چاوے۔ ارے مارا چھورا کی جان تک بچائی ای پیڑ، ای کی پوجا کروں میں، اگر ہاتھ بھی لگایو تو ہاتھ توڑ دیوں۔''

کانتا بائی کی اس تقریر نے سب کو پس و پیش میں ڈال دیا۔ حالانکہ ان کی بات صحیح تھی لیکن ایک پیڑ ہی تو تھا۔ کانتا بائی کی بات سن کر غنی انکل تلملا گئے اور کہنے لگے۔

''آج کے زمانے میں بھی تم جیسے اندھ وشواسی لوگوں کی وجہ سے پورا معاشرہ ترقی نہیں کر پاتا۔ زمانہ کہاں پہنچ گیا اور یہ ایک پیڑ کو دیوتا بنائے بیٹھے ہیں۔ ارے یہ لوگ ہماری سہولت کے لئے ہی یہ کام کر رہے ہیں۔ ہم ان کی مدد نہیں کرینگے تو کیسے کام ہوگا اور ایک پیڑ کے کٹنے سے کون سا آسمان ٹوٹ پڑیگا۔''

کالونی کے سبھی لوگ کانتا بائی کی اس بیوقوفی پر اسے گھورنے لگے۔ پاس میں کھڑے شرما انکل جو غنی انکل کے ساتھ ہی ایک دفتر میں ملازم تھے کانتا بائی پر ٹوٹ

پڑے اور نئے زمانے کی نئی سوچ دکھاتے ہوئے ان سے وہ سب کہ گئے جو ایک مہذب شخص کو زیب نہیں دیتا۔ لیکن کانتا بائی نے ہار نہیں مانی اور ساڑی کا پلو کمر میں دبائے میدان میں آ گئی۔

''جانتی ہوں کہ تھے لوگ کھوب پڑھا لکھا ہو۔ اونچا افسر ہو۔ پر موبھی گنوار کوئی نی۔ جانو کہ پیڑ کوئی جان نی بچاوے، لیکن تھے بھول گیا کہ ہر جگہ اسور نواس کرے اور چلو میں مانو تھے کی بات کی یو اندھ وسواس ہے لیکن تھے ساچر اور ٹی وی کونی دیکھو۔ ارے پردھان منتری سے لے نہ ہر ہیرو ہیروئن تک پیڑ بچاوا اور ہریالی بڑھاوا کی بات کیوے۔ مارا سونو کی کتاب میں بھی پیڑ بچاؤں کی بات لکھی ہے۔ اگر یوں ہی پیڑ کاٹتا ریا تو ایک دن تھے اور میں دونوں ہی نی بچے گا۔''

کانتا بائی کی یہ باتیں سن کر مانو سب کو سانپ سونگھ گیا۔ کانتا بائی کی باتوں کا اثر ایسا ہوا کہ خود مزدوروں نے پیڑ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ لیکن گھنی اور شرمانکل منھ بگاڑ کر چلے گئے۔ کانتا بائی کی جیت ہوئی اور سارے بچے پیڑ کے اردگرد ناچنے لگے۔

☆☆

رومارضوی

گوہر فروش

آبائی وطن۔اسلام آباد (پاکستان)
مقیم۔کوالالمپور (ملیشیا)

کوالالمپور کی صبح یوں تو خوشگوار ہوتی ہے لیکن دن نکلتے نکلتے ماحول میں گرمی در آتی ہے.. اور شام تقریباً" چار بجے روز ہی بارش... اب ایسے میں اگر آپ کو پیدل چلنا پڑ جائے تو آپ چھتری کے بغیر نکل نہیں سکتے.. لیکن میں نے کسی کو بھی کبھی گھر بیٹھتے یا اسکول اور کام سے غیر حاضر ہوتے نہیں دیکھا... چاہے آندھی آئے ... بجلی کڑکے یا ریت کا طوفان اٹھے.. سب ہی اپنے کاموں کو پورا کرنے کی دھن میں رواں دواں نظر آتے ہیں ... یوں میری بھی ہمت بندھی اور پیدل یا مونو ریل کا سفر شروع کیا یہاں اجنبیوں کی مسکراہٹ بہت لطف دیتی ہے ... ہر آتے جاتے کو ہیلو کہنا ایک روایت سی ہے... آج بھی بارش کے بعد جب موسم میرے حساب سے کچھ کھل سا گیا... تو کچھ کاموں کو کرنے گھر سے باہر نکلی تھی... بارش تو نہیں ہو رہی تھی لیکن ... ہوا کے چلتے ہی درختوں سے گرتی بشمار پانی کی بوندوں نے مجھے بھگو کر رکھ دیا..... یہ ایک بہت خوشگوار احساس تھا... دھلے ہوئے درخت ... کہیں کہیں پانی کے آبشار ساتھ موجود تالابوں میں تیرتی رنگین قسم قسم کی مچھلیاں... کچھوے اور موجود پرندے.. میری رہائش ایک

پہاڑی پہ بنے اپارٹمنٹس میں ہے جہاں بیشتر چینی قومیت کے لوگ آباد ہیں... عمارت کے سامنے ہی تقریباً" دوسو سالہ قدیم عظیم الشان بدھ مت کا مندر موجود ہے..... داخلہ پہ کھڑی کی گ ءمورتی ... پہ جب سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ روشنی پورے ماحول کو اسی کے انعکاس سے منور کر رہی ہے..... اس خوبصورت مندر تک پہنچنے کے لئے ایک بل کھاتی سڑک موجود ہے..... جس کے دونوں طرف ایک جنگل سا آباد ہے... دن ہو یا رات.. اس مندر کی رونق دیکھنے لائق ہوتی ہے... اوپر موجود اس حصے میں شہر کی نسبت آبادی کم ہے... لیکن آنے والے زائرین اور روز بروز تقریبات سے یہاں ہر دم میلہ ہی لگا رہتا ہے... سڑک سے کچھ نیچے اترتے ہی... ایک کالی کا مندر ہے..... صبح اس کے اطراف کی فضا لوبان اور مختلف خوشبوؤں سے معطر ہوتی ہے..... یہاں بھی..... ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کئے کتنے ہی بھگت ماتھا ٹیکتے نظر آتے ہیں..... ایسے میں مجھے سارے انسان ایک جیسے لگے .....عہد و پیمان کرتے .. اپنے اپنے خداوؤں کے آگے جھکے اپنی وفاداریوں کا یقین دلاتے..... اپنی سب مانگوں اور منتوں کو اپنے دیکھے وان دیکھے خدا کے سپرد کرتے ہوئے مندر سے گھنٹیوں کی آوازیں ... اور سڑک پہ چلتی گاڑیوں کے شور میں..... کچھ اور آوازیں شامل ہوتیں محسوس ہونے لگیں تھیں... "ہائے گرل!!" آنٹی عینی نے ہاتھ ہلاتے ہوئے آواز لگائی... ایک بڑا سا ہینڈ بیگ ہاتھ میں لئے وہ میرے ساتھ ہی پہاڑی پہ موجود گھومتی ہوئی سڑک پہ چڑھ رہی تھی .....میں مسکرائی تو وہ ایکدم سامنے آ کے کھڑی ہوگ ء"... میں اس اپارٹمنٹ میں ہر گھر میں جاتی ہوں..... تم نے مجھے کبھی نہیں بلایا".. آنٹی عینی نے کارڈ ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا"... صرف ایک کال پہ میں حاضر ہو جاتی ہوں"... وزیٹنگ کارڈ کم مساج پارلر کا اشتہار سا تھا. "جی کبھی ضرورت ہوئی تو کہوں گی".. میں نے جھجکتے ہوئے کہا.. آنٹی عینی کو میں نے ہر اتوار چائنیز ٹیمپل میں بدھا کے مجسمے اور مصنوعی زیورات بیچتے دیکھا ہے یہ بھی ایک دلچسپ کردار ہے... دور سے دیکھو تو کوئی ننھی لڑکی بالوں میں رنگین پنیں، گلے میں رنگین مالائیں پہنے خوب سجی بنیں .. نظر آتی..... بس قریب پہنچ کر ہی اس کی اصل عمر کا

اندازہ کیا جاسکتا ہے.. اس کی عمر کسی صورت بھی ستر سال سے کم نہیں......اس عمر میں میری والدہ بیشتر وقت عبادت کرنے یا بستر پہ آرام کرتے اندازہ کیا جاسکتا ہے.. اس کی عمر کسی صورت بھی ستر سال سے کم نہیں......اس عمر میں میری والدہ بیشتر وقت عبادت کرنے یا بستر پہ آرام کرتے گزار رہی ہیں... پہاڑی پر موجود ہمارا کوونڈو اب بھی دور تھا...... میں اس ستر سالہ خاتون کو حیرت سے تک رہی تھی جو مجھ سے بھی تیز قدم اٹھاتی بلندی کی جانب رواں تھی......اور میں کسی حد تک سست روی سے ہانپتی ہوئی...... ہلکے ہلکے چل رہی تھی.. گرل......وزن کم کرو...... میں مسکرائی... اب وہ قریب بہتے آبشار میں پھوؤں کو بیگ سے کچھ نکال کہ ڈالنے لگی تھی اس سے پہلے کہ میرے منہ سے کوئی لفظ نکلتا وہ پھر بول پڑی...... ہم ایشینز دنیا کا ہر کام کرنا چاہتے ہیں......گھر بھی اچھا ہو... بچے بھی پڑھ جائیں اپنا کیریر بھی بنالیں اور کبھی بوڑھے نہ ہوں... ایم آئی رائٹ؟ ...... میں نے غور سے اسے دیکھا وہ جسامت سے واقعی کوئی چھوٹی سی لڑکی ہی معلوم ہوتی جبکہ چہرے کی جھریاں......گزرے موسموں کا پتہ دے رہی تھیں... پتہ ہے...... میں نے شادی دیر سے کی زندگی کا پوری طرح لطف لیا.. اڑتیس سال کی عمر میں شادی کی.. ہمارا ایک بیٹا ہوا..جب کہ میری اور میرے شوہر کی عمر چالیس سال تھی......(شوہر) ہسبینڈ جلد ہی ہیپٹائٹس سی سے مرگیا...... میں نے بہت محنت کی تین نوکریاں کیں...... بیٹے کو سب سے اچھے اسکول میں پڑھایا... اور معلوم ہے......میں کامیاب ہوئی......وہ ذہین تھا... ہر لیول پہ بہت کامیاب رہا......اینڈ آئی ایم اے پراوُڈ مدر...کہ...... اب وہ ایک بہت قابل وکیل ہے".. اسکا چہرہ یہ بات کہتے ہوئے خوشی سے تمتمار ہا تھا.. "لیکن آپ تو اب تک کام کررہی ہیں کیا وہ کوئی مدد نہیں کرتا......"اب میں چپ نہ رہ سکی، وہ مسکرا کے بولی...... .."میں اپنے بیٹے کے لئے کیا کروں گی یہ میں نے سوچا اور کر دکھایا......وہ میرے لئے کیا کرے گا......وہ کبھی میری پلاننگ میں شامل نہیں تھا......". میں رک گئی میرا کونڈو سامنے آگیا تھا......اور وہ اب بھی چڑھائی پہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہی تھی۔

☆☆

صادقہ نواب سحر

منّت

ممبئی سے پنڈھرپور جانے والی ٹولیاں لیزم بجاتی، نرم سخت دھوپ میں سر پر پھیٹا باندھے، لکڑی کی دِنڈی (پالکی) میں وِٹھل کی مورتی لئے آگے بڑھی چلی جارہی تھیں۔ پونے، بارامتی، اندا پور روڈ کے راستے یہ ٹولی شولہ پور روڈ چھوڑ کر پُونے ضلع کے آخری گاؤں باوڑا سے آگے بڑھی۔ باوڑہ میں ہون راؤ اپنی بہن مکتا اور ماں شانتا، جسے وہ 'آئی' کہتے تھے، کو لیے ٹولی کے ساتھ ہولیا۔ باوڑہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں۔ پورے گاؤں میں کوئی پانچ سو گھر ہوں گے۔ گاؤں کے آس پاس کھیت ہیں جن میں گیہوں، جوار اور گنے کی فصل ہوتی ہے، یہ بہت شانت گاؤں ہے۔ یہاں ہفتے میں ایک دن یعنی جمعہ کے دن ''آٹھوڑے بازار'' (ہفتہ بازار) لگتا ہے۔ جس میں سبزیاں کھانے پینے کی چیزیں، کرانہ، راشن، اور تھوڑا بہت کپڑا فروخت ہوتا ہے۔ باقی دنوں میں خریداری کے لیے گاؤں والوں کو 'آکلج' جانا پڑتا ہے۔ یہیں ان لوگوں کا بڑا سا گھر ہے، آئی مکتا کے لیے منت کرنا چاہتی تھیں۔

''اگلی بار تبھی آؤں گی، جب میری منوتی پوری ہوگی۔''

''ہے وٹھل پانڈورنگ! میری لیک (بیٹی) کو شادی لائق بنادے۔'' اپنے سر پر گملے میں تلسی کا پودا اٹھائے انہوں نے عقیدت سے کہا تھا۔

اس وقت مکتا اٹھارہ سال کی تھی۔ گدرائے جسم کی، تیکھے نین نقش، درمیانہ قد،

کھلتا ہوا رنگ، شوخ رنگ چوڑیوں سے ہاتھ بھرے ہوئے، بیچ کی مانگ، دو چوٹیاں لال ربن سے بندھی ہوئی، بڑے گھیر کے لہنگے جیسا ٹخنوں تک کا پَر کر، اور شرٹ جیسا چھوٹا کرتا، ماتھے پر کم کم کا ٹیکہ۔۔کھیت پر بابا کو کھانا دینے جاتی، تو گاؤں کے لڑکے آہیں بھر کر دیکھتے.....بن کی آنکھ چل جاتی اور وہ فوراً آنکھ پکڑ کر رگڑنے لگتا، کیونکہ رک کر اسے مکتا گھورتی۔

''شادی کرے گی میرے سے؟''

''اپنے بابا کو بھیجوں''؟

''چل بھاگ جاتے ہیں؟'' بن ہر بار ایک نیا فقرہ پھینکتا۔

''کیوں؟ اپنے بابا کو بھیجتا کیوں نہیں رے؟.....خالی بڑ بڑ کرتا ہے۔میرے بابا سے ڈرتا ہے کیا؟''

''نہیں، تیرے بابا سے نہیں.....''

''تو؟''

''اپنی ماں سے.....!''

''تو جانا گھر اپنے! مجھ سے کیوں پوچھتا ہے؟.....شادی کرے گی کیا میرے سے؟ ہونہہ!! اپنی ماں سے پوچھنا!!''

بن کی ماں سر پیٹ لیتی ہے۔

''کیا کمی ہے اس میں؟ لنگڑی ہے کہ اندھی کانی؟''، بن چڑ کر کہتا ہے

''وہ بھی چل جائے گی مگر مکتا نہیں۔''

''آئی، تو مکتا سے جلتی ہے کیا؟''

''اب کیا بولوں رے تجھے؟''

مکتا بھی اپنی دوسری بہنوں کی طرح کھیلتی کودتی بڑی ہوئی تھی۔اسکول جانے کا شوق تینوں ہی بہنوں میں نہیں تھا۔ بھائی نے تو حساب کتاب تک کی پڑھائی کر لی تھی۔ سود پر پیسہ دیتا تھا۔ باپ کسان تھے۔ایک ایک کر کے دونوں بہنیں جوان ہو گئیں۔مکتا

ویسی ہی رہی۔ کتنے ڈاکٹروں، ویدوں کو بتایا۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کسی نے ممبئی کے کسی بڑے زنانہ بیماریوں کے ڈاکٹر کا نام بجھایا، مگر شہر جا کر علاج کیسے کراوئیں۔ وہاں کوئی ایسا بھی تو نہیں، جس کے پاس جا کر کچھ دن رہ سکیں۔ بات دھری رہی۔ دوائیوں کا فائدہ تو نہیں ہوا لیکن ہاں، مکتا کا جسم ضرور پھول گیا تھا۔ وہ عمر سے بڑی لگنے لگی تھی۔ چھوٹی بہنیں ایک کے بعد دوسری سولہ سال کی ہوئیں اور بیاہ کر کے بدا کر دی گئیں۔

لڑکوں کی ماؤں نے انہیں سختی سے منع کر رکھا تھا کہ مکتا کو نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ مگر نظروں پر کسی کا بس چلا ہے؟ ان کی اپنی نظریں بھی اُس پر تھیں، دولت مند گھرانے کی لڑکی جو تھی، بہت ملے گا۔ بن کی ماں کو بھی یہی لالچ مکتا کی ماں کے پاس لے گئی۔ مگر شانتا تائی نے سمجھا کر بھیج دیا۔

''بعد میں دکھ اٹھانے سے اچھا ہے، شادی ہی نہ کریں۔ لڑکی ہم پر بوجھ نہیں ہے۔''

کیسی چہکتی تھی مکتا بچپن میں۔ سب بہنوں سے تیز تھی، وہ باپ کی لاڈلی! اب وہ ایک طرح سے خوش تھا کہ بیٹی اس کے پاس رہے گی۔ بیٹے کا کیا ہے بیاہ تک اپنا! مگر کبھی کبھی اس کا دل بھی کچوکے لگاتا۔

''کاش سب کچھ ٹھیک ہوتا.....!''

چھوٹی بہنوں کی شادیوں کے بعد سے مکتا کچھ بجھی بجھی سی رہنے لگی تھی۔ گھر میں بھابی آ چکی تھیں۔ سبھی کے تین چار بچے تھے۔

بھابی کے ساتھ کچن میں چخ چخ رہنے لگی تو ماں نے کہا۔ ''تو گائے بھینس دیکھ لے۔''

مکتا بڑی صفائی پسند تھی۔ اپنے ہاتھوں سے طویلے کی صفائی کرتی، گائے بھینسوں کو نہلاتی، انہیں چارہ دیتی، دودھ دوہتی۔ اسے پانی بہت اچھا لگتا تھا۔ بار بار ہاتھ صاف کرتی، اپنے برتن خود دھو کر رکھتی۔ گیہوں جوار وغیرہ صاف کرتی۔ مگر چولہے کے پاس نہیں پھٹکتی تھی۔ جلدی جلدی ولی (پاؤں درانتی) پر سبزیاں کاٹ کر رکھ جاتی۔

کبھی کبھی وہ اپنے برتنوں کے ساتھ ساتھ سارے برتن دھوڈالتی۔لیکن جب موڈ نہیں ہوتا تو، کہنے پر بھی کہہ دیتی ''نہیں کروں گی۔''

مکتا کی تین سہیلیاں بن بیاہی تھیں۔فرصت میں ان سے گپیں لڑاتی، مگر شیلا، پھر مایا پھر ریکھا۔تینوں سہیلیاں مشکل سے ہی سہی، بیاہ دی گئیں۔اور کچھ دنوں میں اپنی گرہستیوں میں کچھ ایسی الجھیں کہ ملنا ملانا تک مشکل ہوگیا۔مکتا کو چپی لگ گئی۔'اجّی' یعنی دادی کے پاس بیٹھی رہتی۔گائے بھینسوں کا کام بھی چھوڑ دیا۔کھانا لگ جاتا تو دادی کے ساتھ رسوئی میں آجاتی اور دادی کی طرح ہی سیدھے ہانڈیوں سے برتن میں کھانا لے کر بیٹھتی، دوبارہ نہ لیتی۔ بھابھی ناراضگی سے دیکھتیں کہ کھانا بنانے میں تو نہیں آئی لیکن پروسنے بھی نہیں دیتی، خود لے گی ہونہہ!'دادی ساس' کے ڈر سے وہ کچھ بولتی نہیں تھی۔ پھر اسے بھی اس کی عادت ہوگئی۔کھانے کے بعد دادی مکتا کو لے کر چلی جاتیں۔

ماں مٹی کے چولہے پر پانی گرم کرتیں، کپڑے حمام میں لگاتیں اور آواز لگاتیں۔

''مکتا.....۔''

مکتا آتی اور گرم پانی کی بالٹی اٹھا کر حمام میں چلی جاتی۔عمر کے ساتھ ساتھ مکتا میں ایک خاص قسم کی ضد آگئی تھی۔یا پھر اکیلے پن کی خواہش!دادی کی موت کے بعد تو وہ تنہائی پسند ہوگئی تھی۔بس دہلیز پر بیٹھی دروازے کی طرف دیکھ کر خود سے باتیں کرتی رہتی۔کوئی بات بار بار بڑبڑاتی اور پھر اپنے آپ سے کہتی۔

''چپ بیٹھ، تھپڑ ماروں کیا؟''

وہ دن میں کبھی نہ سوتی۔بیٹھی رہتی یا گھر میں گھومتی رہتی۔کھانا بھی وہ ذرا سا کھانے لگی تھی۔گھر میں سبزی آتی تو صاف کرنے ضرور بیٹھ جاتی۔بہنیں مائیکے لوٹتے ہوئے اس کے پیر پڑتیں، تو کہتی:

''مجھے پونا آنا ہے''۔

''چلو نا ماؤسی!'' بھانجے بھانجی بلاتے۔

''نہیں، بعد میں۔''، وہ ڈر جاتی۔

کسی کی شادی میں یا کسی کاج میں زبردستی لے جاتے تو گھبراتی۔

''یہاں کیوں آئے؟'' گھر سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتی تھی۔ بھیڑ میں ہاتھ کس کر پکڑ لیتی۔ وہ اپنی کسی پسند کا اظہار نہ کرتی۔

سویرے کے نو بجے ہوں گے۔ بھابی الگنی پر کپڑے سکھا کر تہہ کر کے لائی اور ماں نے مکتا کے لیے حمام میں کپڑے لگا کر آواز دی کہ وہ آ کر نہانے کا گرم پانی لے جائے۔

''میرے کپڑے مُڑا دیے، میں نہیں نہاؤں گی ..... کپڑے مُڑا دیے..... میرے کپڑے.....''

مکتا نے ہمیشہ کی طرح حمام میں گرم پانی رکھا تھا، کپڑے دیکھے تھے اور چلانے لگی تھی۔ ماں دوڑی آئیں۔

''کپڑے مڑا دیے..... میرے کپڑے.....''

''آہستہ بول وَنی (بھابھی) کو برا لگے گا۔ بیچاری سارا دن گھٹتی ہے۔''

''میرے کپڑے.....''

''چپ کر بیٹا..... چپ کر، وَنی کو.....''

شاید بھابی نے سن لیا تھا۔ اس کے بعد مکتا مقررہ وقت پر بھابی کے ہاتھ کے دھلے کپڑے جھٹک کر ڈالتی اور سوکھتے ہی اچھی طرح تہہ کر کے رکھ لیتی۔

ایک ایک کر کے نہ جانے کتنے برس گزر گئے۔ آج بھائی ہون راؤ کی بڑی بیٹی کے لیے رشتے والے آنے والے تھے۔ ماں بہو کی مدد کرنے میں پیچھے نہیں رہتیں۔ شاید بیٹی کی بھرپائی کرتی تھیں۔ مکتا کی دادی کے مرنے کے بعد وہ کسی بھی کام میں کیوں نہ ہوں، درمیان میں مکتا کے پاس ضرور جا بیٹھتیں..... آج ماں نے سمجھا بجھا کر مکتا کو اندر، اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ ناشتہ لگانے میں مدد کی۔ کچھ دیر لڑکے والوں کے ساتھ بیٹھ کر، پوتی کو ان کے پاس بٹھایا اور بیٹی کے کمرے میں آ گئیں۔ مکتا آئینے میں اپنا

ہوں، یعنی اُنہوں نے امیر اور غریب سے پاک غیر طبقاتی سماج کے لیے جدوجہد کی۔ ہم اب جانتے ہیں کہ یہ اُس وقت ناممکن تھی۔ پیداواری قوتیں، جو سوشلزم کی مادی بنیاد ہیں، اُس وقت ترقی کی اُس سطح پر نہیں تھی کہ یہ ممکن ہو۔ انقلاب فرانس کی طبقاتی فطرت لازماً بورژوا تھی لیکن یہ بات عوام کو ہرگز پتہ نہیں تھی جنہوں نے پرجوش انداز میں انقلاب میں شرکت کی اور اپنے خون سے اس کی فتح پر مہر ثبت کی۔ وہ بورژوا خواتین کو اقتدار دینے کے لیے نہیں بلکہ اپنے طبقے کے لیے لڑ رہے تھے۔ سماجی طبقات سے بالاتر ہو کر تمام خواتین کو متحد کرنے کا نعرہ محنت کش خواتین میں کوئی حمایت حاصل نہیں کر سکا جو اپنے مردوں کے ساتھ ایک عادلانہ معاشرے کے لیے لڑ رہی تھیں۔

برطانیہ میں مزدور تحریک اور خواتین:

حق رائے دہی کے لیے لڑنے والی خواتین کے درمیان طبقاتی فرق برطانیہ میں مزدور تحریک کے فروغ کے ابتدائی سال مزدوروں اور خواتین کے شدید احتجاج سے عبارت تھے۔ نیا ٹریڈ یونین ازم انیسویں صدی کے آخر میں جنگجوانہ ہڑتالوں کے نتیجے میں پیدا ہوا جس میں غیر منظم مزدور بھی متحرک ہوئے جو پہلے کبھی جدوجہد میں شامل نہیں تھے۔ ان میں سے بعض تحریکوں میں محنت کش خواتین بھی شامل تھیں جیسے کہ مشہور ماچس فیکٹری کی ہڑتال۔ مارکس کی بیٹی نے ان ہڑتالوں میں سرگرم کردار ادا کیا۔

درمیانے طبقے کی خواتین حق رائے دہی کے لیے روز افزوں احتجاج کر رہی تھیں۔ تاہم انہیں صرف رسمی برابری حاصل کرنے میں دلچسپی تھی اور وہ اپنے طبقے سے تعلق رکھنے والی جائیداد کی مالک خواتین کے لیے ووٹ کا حق حاصل کرنے میں ہی خوش تھیں۔ ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ اُس وقت بہت سارے مردوں کو بھی ووٹ کا حق حاصل نہیں تھا۔ تاہم واقعات نے بہت جلد بورژوا نسوانیت پرستی کے رجعتی کردار کو بے نقاب کر دیا۔ بورژوا خواتین نے محنت کشوں (مرد اور خواتین) کی طرف اپنی جارحانہ روش واضح کر دی۔ جیسا کہ جین پیکارڈ نے اپنے مضمون میں واضح کیا ہے کہ:

چہرہ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ماں نے اسے دھیان سے دیکھا۔ اس نے اپنے سارے گہنے پہنے ہوئے تھے اور اپنی بھابی کی شادی کا گھونگھٹ سر پر اوڑھے ہوئے تھی۔ مانگ کی جگہ پر ایک چھوٹا سا سفید گھنگھرالے بالوں کا گچھا بندیا کی طرح جھول رہا تھا۔ ماں چپ چاپ پلٹ گئیں۔ کمرے کے دروازے کے باہر آ کر گہری گہری سانسیں لینے لگیں، پیر کانپنے لگے، لگا گر پڑیں گی۔ زمین پر بیٹھ گئیں۔

''ساسو ماں!'' بہو ڈھونڈتی ہوئی آئی، ''کیا ہوا؟.....اَہوا!.....سنو.....دیکھو تو کیا ہوا آئی کو.....'' ادھر سے ہون راؤ، اُدھر سے مکتا ماں کے پاس دوڑے آئے۔ ماں نے مکتا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ وہ ویسی ہی سیدھی سادی چھ گز کی عام عورتوں کے پہننے والی شوخ گلابی رنگ کی پھولوں والی ساڑی میں لپٹی تھی۔ بدن پر زیور تھا نہ گھونگھٹ۔ پھر وہ سچ تھا کہ خیال!.....ان کی کپکپی زور پکڑ رہی تھی۔

''جا کھانا کھا کر آ''، اس حالت میں بھی ماں کو سرہانے بیٹھی ٹکٹکی لگائے اپنے کو دیکھ رہی مکتا کی فکر تھی، لیکن اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر پانچ بجے آئے گا، شہر گیا ہے۔'' ہون راؤ دوڑ کر پتہ کر آیا، ''ایک گھنٹہ ہے۔''

''ساسو بائی، خود کو سنبھالیے۔'' بہو نے ان کے پیروں کی مالش کرتے ہوئے کہا۔

''تو نے کھایا سون بائی؟'' انہوں نے بہو کو پوچھا۔

''ہاں ساسو ماں'' بہو نے مکتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اِس کا من ٹھیک نہیں۔ ٹھیک لگے گا تو لے لے گی.....ہو سکے تو بیٹی کے ہاتھ سے اِسے دودھ بھجوا دو۔'' مکتا نے انکار میں سر ہلایا، تو بولیں، ''ٹھیک ہے۔ نہیں لائے گی.....تُو گھبرا مت.....میں تیرے مرنے کے بعد ہی مروں گی۔'' بستر پر پڑی تیز بخار میں وہ بڑبڑا رہی تھیں.....ان کی حالت دیکھ کر سب رو رہے تھے۔

ماں ٹھیک ہو گئیں مگر ان کے پیر اکڑ گئے۔ کھڑی نہیں ہو پاتی تھیں۔ گھر بھر میں

گھسٹتی پھرتیں۔ لیکن بہو کی مدد کرنے میں بیٹھے بیٹھے جو کرسکتیں، کرتیں۔ پیروں کی مجبوری کم ہی آڑے آتی۔ بہو بہت کہتی۔

''بیٹی مدد کردے گی۔''

''نہیں، پڑھنے دو میری پوتی کو۔ اس کی شادی کے دن دور نہیں۔'' وہ بڑے پیار سے کہتیں اور بہو مسکرا دیتی۔ ماں بوڑھی ہوگئی تھیں۔ بابا بھی لکڑی ٹیکتے تھے۔ کھیت پر کم جاتے۔ مزدور، کسان گھر آ کر آنگن میں بیٹھتے۔ حساب دیتے، گپیں لڑاتے۔

ماں کتنی بار بیمار ہوئیں اس کی گنتی کیا! ہر بار اٹھ بیٹھتیں۔ ہر بار کہتیں۔

''مکتا کو چھوڑ کر نہیں مرسکتی۔''

کچھ دنوں سے مکتا نے بھی ہانڈیوں سے کھانا لینا چھوڑ دیا تھا۔ بس چپچ بھر چاول اور دال لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ کھانا کھا کر اپنے برتن دھو کر کونے میں رکھ دیتی۔ صرف دوپہر میں کھانے لگی تھی۔ رات میں ماں گھسٹتی ہوئی آتیں اور دودھ پلا جاتیں۔ گدرایا بدن دھیرے دھیرے ہڈیوں کا ہار دکھائی دینے لگا۔

مکتا اب دو دنوں میں ایک بار کھانا کھانے لگی تھی۔ اس کے باقی روزمرہ کے کام برقرار تھے۔ صبح کے کاموں سے نپٹ کر وہ اپنی پسندیدہ دہلیز پر جا بیٹھتی۔

آج بن نے مکتا کو پچیس سال بعد دیکھا تھا۔

ویسی ہی، بالکل ویسی ہی سندر اور معصوم۔ لال پھولوں کی ساڑی، سونے کی چوڑیاں، گلے میں چین، کانوں میں موتی کے پھول۔

''پہچانا؟..... میں بن..... پڑھائی کے لیے امریکہ گیا تھا نہ، وہیں بس گیا تھا۔ پچیس سال بعد آیا ہوں..... تم تو بالکل ویسی ہی ہو۔''، اس نے اپنی خوشی بھری ہنسی دبائی۔ مکتا نے اسے نظر بھر کے دیکھا۔ آنکھیں مسکرائیں، پھر شانت اور انجان ہوگئیں۔ وہ اپنی ساڑی کے پلو میں چھپا کر اپنی انگلیاں گننے لگی۔ بن وہیں رک کر اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ وہ سر کھجانے لگی۔

''پتنی بھی آئی ہے۔ کل لاؤں گا ملانے۔''

''چل ہٹ''، مکتا نے پاس پڑا اینٹ کا ٹکڑا اٹھا کر پھینکا۔ ہن کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔

''سالی.....! آئی ایم ساری۔ آئی ایم ساری.....''

''معاف کر بیٹا، یہ باؤلی ہوئی ہے، تو برا مت ماننا'' مکتا کی ماں گھسٹتی ہوئی آئیں۔

''اندر آ جا پٹی کرتی ہوں۔ ماتھے سے خون بہہ رہا ہے۔''

''کا کی آپ کے پیروں کو کیا ہوا؟''، انہیں گھسٹتے دیکھ کر وہ اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔ مگر پھر اچانک پیشانی کی چوٹ سے بہتے خون اور شرمندگی کا خیال آیا اور — ''کوئی بات نہیں..... کوئی بات نہیں۔'' کہتا ہوا جواب سنے بغیر ہی ہن وہاں سے چلا گیا۔

شام گہرا گئی تھی۔ مکتا کی ماں سرہانے بیٹھی اسے پنکھا جھل رہی تھیں۔ صبح سے وہ کچھ بولی نہ ہلی ڈلی۔ کئی دنوں سے اس کا کھانا بند تھا۔ ماں بیٹے کو دیکھ کر بولیں۔

''ہون راؤ دیکھ تو، دیدی ٹھیک تو ہے؟''

''آئی! دیدی تو ٹھنڈی ہوگئی''، ہون راؤ ناڑی دیکھ کر بولا۔

''جا بابا کو بتا دے''، انہوں نے اتنی شانتی اور بغیر کسی تناؤ کے ہون راؤ سے کہا تو وہ تڑپ کر ماں کے گلے لگ گیا۔

مکتا کو مرے آج تیرہ دن ہوئے تھے۔ پورا گاؤں کھانا کھا کر گیا تھا۔ ماں بخار سے تپ رہی تھیں پھر بھی ہاتھ میں جھاڑو لیے صفائی کر رہی تھیں۔ بہو ہاتھ سے جھاڑو لینے لگی تو پیار سے ڈانٹا۔

''کیا سکھ اٹھایا تو نے بھی! یم بلاتے تھے مگر تجھ پر بوجھ نہیں ڈالنا تھا نہ، اس لیے میں نہیں گئی''، انہوں نے ہنس کر بہو کو گلے لگا لیا۔

اگلی صبح گاؤں والوں کو پھر اسی گھر میں جمع ہونا پڑا۔

مکتا کی ماں نہیں رہی تھیں۔

ہن پنڈھرپور کی یاترا کے لیے لکڑی کی دنڈی (پالکی) میں وٹھل کی مورتی کو سجا رہا

تھا۔

''تُو ،تو اسے پسند کرتا تھا لیکن ملتا تو تیرے سے پیار کرتی تھی۔''

''کیسے معلوم؟؟؟''، بن نے سوچا' آج ماں کو کیا ہو گیا ہے!'

''وہ بولی تھی میرے کو، ایک بار.....اپنے کھیت میں آئی تھی پوچھنے کو کہ.....''

''کہ؟''، بن راؤ کی بے چینی ماں سے چھپی نہیں رہی۔

''کہ میرا کیا دوش ہے؟؟''

''پھر؟''

''میں بولی پورے رشتہ داروں کو معلوم ہے تجھے ماہواری نہیں آئی۔ کتنی جڑی بوٹیاں ہضم کر گئی۔''

''اب اس میں میرا کیا دوش!!''

''پھر!!!''بن نے پوچھا۔

''وہ پلٹ کر جانے لگی تھی تو میں نے اسے روکا اور بولی۔

''سن بیٹا، کسی کو معلوم نہیں ہوتا یا ہم دوسرے گاؤں کے ہوتے تو اور بات تھی۔ اب لوگ پوچھیں گے نہ کہ تیرے بیٹے میں کیا دوش تھا کہ آنکھوں دیکھی مکھی نگل لی۔''

ممبئی سے پنڈھرپور پور جانے والی ٹولیاں لیزم بجاتی نرم سخت دھوپ میں ہمیشہ کی طرح آج بھی سر پر پھینٹا باندھے، لکڑی کی دنڈی میں وٹھل کی مورتی کو لیے پندرہ دنوں کی جترا میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ پونے، بارا متی، اندا پور روڈ کے راستے سے یہ ٹولی شولہ پور روڈ چھوڑ کر پُونے ضلعے کے آخری گاؤں باؤڑہ کے لیے بڑھی ہے۔ ہر سال بن کی ماں اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ آشاڑھ اور کار تک کے مہینوں میں وٹھل رکمائی (کرشن رکمنی) کے درشن کرنے پیدل جاتی ہیں۔ اس بار فرق صرف اتنا تھا کہ باؤڑہ میں امریکہ رٹرنڈ بن راؤ اپنی آئی اور بیوی کی ضد پر انہیں لیے ٹولی کے ساتھ شامل ہونے کو کھڑا تھا۔ کچھ لوگ سر پر پینے کے پانی کی کلسیاں اور تلسی کا پودا بڑی عقیدت سے اٹھائے ہوئے تھے۔

''اگلی بار تبھی آؤں گی جب میری منوتی پوری ہوگی۔'' بن کی آئی اپنی بہو کے لیے منت کرنا چاہتی تھیں، ''ہے وٹھل پانڈورنگ! میری سون کی گود بھر دے۔''، اپنے سر پر گملے میں تلسی کا پودا اٹھائے انہوں نے شردھا سے کہا تھا اور وہ، ''ہری وٹھل، ہری وٹھل، ہری وٹھلا'' کا جاپ کرنے لگ گئیں۔

☆☆

باب ۔۳

ماحولیاتی تانیثیت اور عصری تانیثی افسانے
ایک تجزیاتی مطالعہ

آج کا انسان بارود کی ڈھیر پر بیٹھا ہوا ہے اور آخری سانسیں گن رہا ہے۔ تباہی کے بعد وہ خلا میں آواز کی صورت محفوظ رہ جائے گا یہ ایک سائنسی حقیقت ہے۔ انسان کی خواہشیں لامختتم ہیں۔ زمین تا خلا وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ڈھونڈنے میں مصروف ہے۔ انسان کی ہوسنا کی اور خواہش بے جا کا مضمون عصری تانیثی افسانوں میں قلم بند ہوا ہے۔ سلمی جیلانی، سبین علی، نسترن احسن فتیحی، شاہین کاظمی، نورالعین ساحرہ، ناہید اختر، اور نسیم سید، کوثر جمال، افشاں ملک، نگار عظیم، عذرا نقوی، نکہت فاروق، عشرت ناہید، روما رضوی۔ مہر افروز، صادقہ نواب سحر کی کہانیوں میں انسان کے ذریعے فطرت کو مسخر کرنے کا سیاق ابھارا گیا ہے اور انسان کی اسی ہوسنا کی اور بے جا ترقی اور اس کے نام پر کی جانے والی تحقیق کے نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اب تو خلا کو آلودہ کرنے میں سائنس دانوں نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ یہاں ٹھہر کر ایک اور اہم پہلو پر غور کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ان افسانہ نگاروں نے فطرت کے ایک وسیع و عریض منظر کو اپنی تخلیقات کا اہم ساختیہ بنایا ہے۔ ماحولیاتی مفکرین فطرت کے ایک وسیع و عریض منظر کو خالص فطرت کے ذیل میں رکھتے ہیں۔ ان تخلیق کاروں کا فکشن ایسا فکشن ہے جس میں زندگی کے گہرے رازوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے یا جس میں تقدیر کے المیے کو

پیش کیا گیا ہے ایسے فکشن میں ماحولیاتی آلودگی اظہار کا ایک گہرا ساختیہ بن جاتا ہے۔ ان افسانوں کا راوی شہر سے نفریں اور گاؤں کے ختم ہونے پر حد درجہ فکرمند نظر آتا ہے۔ اس امر کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کہ کیونکر اب فطرت بھی اپنی فطرت بدلنے لگی ہے۔ اس بات کی طرف فنی طریقے سے ان افسانہ نگاروں نے بھی اشارہ کیا ہے۔ ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلمی جیلانی، سبین علی، غزال ضیغم، نسترن احسن فتیحی، نسیم سید، کوثر جمال، انجم قدوائی، شاہین کاظمی، نورالعین ساحرہ ناہید اختر، اور عینی علی، نگار عظیم، ترنم ریاض، عذرا نقوی کی کہانیوں کی نوعیت اور معنویت بدلی ہوئی ہے۔ اب کتن والی، 'عشق پیچاں'، 'نسل' اور 'بوگن ویلیا کی اوٹ سے' وغیرہ ایک نئے استعارے کی شکل میں اُبھرتے ہوئے تبدیلیوں اور تباہیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ افسانے عالم کاری کے دباؤ اور انتشار کو پیش کر رہے ہیں اور یہ بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ کس طرح ہمارے افسانوں کی زبان متاثر ہو رہی ہے، جملے ٹوٹ کر لفظوں میں بکھر رہے ہیں، نئی اصطلاحیں بن رہی ہیں۔ انکے یہاں بعض افسانوں میں عصری سیاسی جبر کے اندوہناک نتائج بہت واضح ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سلمی جیلانی کا منجمد سسکیاں، سبین علی کا ' گاڈ سیو دی کنگ''، نسیم سید کا ''نہال حیرت عشق'' اور کوثر جمال کا ''گٹر سوسائیٹی'' ایسے ہی افسانے ہیں۔ جو انسانیت، رشتوں اور زمین کی تباہی کی سچی تصویر کشی کرتے ہیں۔ یہ افسانے انسانی سروکار کے تئیں گہری دردمندی اور موجودہ سماجی رویوں کے خلاف پُرزور احتجاج کی شکل میں ابھرے ہیں۔

ماحولیاتی مادریت کے تفکر کو سبین علی نے ''کتن والی'' میں خوبی سے اجاگر کیا ہے۔

ان کے افسانوں میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی تباہی، اربنائزیشن اور تیزی سے تبدیل ہوتے ماحول کے انسانوں خاص طور پر عورتوں پر اثرات شامل ہیں، اس طرح ان کے افسانوں کے موضوعات متنوع ہیں اور کینوس داخلی کرب کی بجائے معاشرے کی اجتماعی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے معاشی ہجرتوں کے عورت پر پڑنے والے دباؤ اور بچوں عورتوں مردوں کی نفسیات پر بھی کئی افسانے لکھے ہیں۔ ماحولیات اور اس کی تباہی سے پڑنے والا دباؤ ان کے اکثر افسانوں کے پس منظر میں

نمایاں ہوتا ہے۔ سبین علی کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ شعوری یا لاشعوری طور پر ان کے زیادہ تر افسانے ماحولیاتی مادریت کی شرائط کو پورا کرتے ہیں جس سے قدرت اور ماحول سے ان کا فطری لگاؤ ابھر کر سامنے آتا ہے

اور ان کے یہاں یہ اظہار واضح ہوتا ہے کہ زندگی اتنی آسان نہیں جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں کیونکہ زندگی کسی ایک اصول یا نظریے کی پابند نہیں ہوتی ہے۔ آج سرمایہ داری کے بحران کے عہد میں ہمیں گرتی ہوئی اقدار، گلاسڑا کلچر اور آرٹ کا بحران نظر آتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے انسانیت کی اکثریت کو ایک مشینی زندگی میں دھکیل دیا ہے۔ انسان کی حیثیت ایک اوزار کی سی ہے۔ جو کہ ہر طرح کے لطیف جذبات سے عاری ہے۔

افسانے کا اسلوب افسانے کے فکری ساختیے کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ''پاور لومز، سوت، دستی کھڈی'' ایسے فکری ساختیے ہے جو تجسس کی گرہوں کو کھول دیتے ہیں گویا افسانہ کی تھیسس ان فکری ساختیوں میں پوشیدہ نظر آتی ہے اس طرح افسانے کے باطنی سطح پر ایک عجیب وغریب فتنہ وفساد کی دنیا تشکیل ہو جاتی ہے۔ اس طرح ان واقعات کے یاد آتے ہی کتن والی میں بڑی معنوی گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ بین المتنیت کا یہ طریقۂ کار ''کتن والی'' کو ایک ناقابل فراموش افسانہ بنا دیتا ہے۔ شہر کاری (Urbanisation) جس طرح ہماری دستکاری کو ختم کر رہی ہے سبین کے افسانے میں اس کا ماتم دیکھنے کو ملتا ہے۔

کتن والی محض ایک افسانہ نہیں ہے، آرٹ، کرافٹ، حُسن اور ایک تہذیبی وراثت کے زوال اور انسانی اقدار کے زوال کا ساختیہ ہے۔ کھڈی، پاور لوم، سوت، رنگ، تانا، بانا، اور اس سے منسلک دیگر اصطلاحات مشاہدے کی ژرف نگاہی اور باریک جزئیات نگاری میں نمایاں ہو کر ایسے لسانی ساختیے میں ڈھل جاتے ہیں جو ایک اعلیٰ تخلیقی نمونے کی وجہ بنتے ہیں۔ ایک کسا اور گٹھا ہوا بیانیہ جولاہوں کی ایک بستی جو شہر کی آبادی کا ایک حصہ بن گئی، اس بستی کا ایک خاندان، ایک باپ جو مر گیا، ایک بیٹا جو نشے کا عادی ہو گیا، ایک جدوجہد کرتی ہوئی جولاہن۔ اس خاندان کے پاس ایک قدیم فن ہے،

لیکن بدلتے ہوئے صنعتی مزاج نے اس فن کو نگل لیا۔ ہنڈی کرافٹ کے نام پر آج بھی ایسے فنکاروں کا استحصال عام ہے، گوکہ یہ بات اس افسانے میں نمایاں طور پر ابھر کر سامنے نہیں آسکی ہے کی تفصیلات پیش کرتا ہے افسانہ اقداری کش مکش کا اظہار علامتوں کی شکل میں پیش کرتا ہے، کہیں یہ علامت، علامت کے پیچیدہ ترین عوامل کے ساتھ سامنے آتی ہے اور کہیں ایک پورا منظر نامہ ہی علامت بن جاتا ہے۔ مذکورہ افسانے کی صغری مائی اس حوالے سے خوش قسمت دکھائی دیتی ہے کہ اسے کم از کم ان گھروں اور بازاروں تک رسائی تو تھی جہاں اسے اچھے دام مل جاتے تھے اسکے ہنر کی کسی حد تک ہی سہی لیکن قدر ضرور تھی لیکن اس کے باوجود بہت سی ناانصافیاں جن کا ذکر اس افسانے میں ہے، اس کے ساتھ ساتھ حکومتی اداروں کی نااہلی اور عدم توجہ بھی زیر بحث لانی چاہیے جو کہ ہر دور کا المیہ ہے، اس دور کی حکومتوں کے رجحانات اور تھے وہ اکثر اندرونی بیرونی جنگوں میں خود کو مصروف کر چکیں تھی، اس وقت چھوٹی صنعت کاری، یا گھریلو دستکاری پر کسی کی نظر ہی نہ تھی،، اسی دور میں یہ سارا نظام ابتری کا شکار ہوا،، بڑے بڑے پراجکٹ لگنا شروع ہو گئے اس سے مزدور کو روزی تو ملی لیکن اسکی اپنی مرضی اور آرام سکون کا اختیار چھن گیا۔ انھیں دیہات سے نکل کر شہروں کی طرف کوچ کرنا پڑا،، اس افسانے میں جن معاشرتی المیوں کا ذکر ہے ان میں ہنر کی بے قدری، غربت، اور علاج معالجے کی سہولیات کی عدم دستیابی سرفہرست ہے، مثلاً فیکا اپنی بیماری میں تڑپتا، اس جہاں سے کوچ کر جاتا ہے لیکن ان کے وسائل اتنے محدود تھے کہ شہر کے اتنے پاس ہونے کے باوجود بھی وہ علاج نہ کروا سکے، حالانکہ موسمی نمونیا کوئی بڑی بیماری نہیں نہ ہی اس کا علاج بہت مہنگا ہے، پھر اس کے بعد بھولے کی نشے کی لت، جو کہ شہری آبادی کا ایک تحفہ تھا، کیونکہ دیہی علاقے اس آگ کی لپیٹ سے آج بھی محفوظ ہیں۔ اس افسانے کے حوالے سے پروفیسر فرخ ندیم کے ان خیالات پر نظر ڈالنا بے جا نہ ہوگا۔

جب افسانے کا نام " کتن والی " رکھ لیا تو افسانہ نگار نے کہانی کے مرکز میں کتن والی رکھی۔ مائی جولاہی سوت کھیس چادریں کات کر

''پینکر سٹ خاندان کا نام، خواتین کے لیے ووٹ کا حق حاصل کر نے کی جدوجہد سے عبارت تھا لیکن جس چیز نے سلویا پینکر سٹ کی سوچ کو اُس کی والدہ ایملین اور بہن کرسٹابیل کی سوچ سے ممیّز کیا وہ طبقاتی مسائل تھے۔ تقریباً بیس سال کی جدوجہد کے بعد 1920ء میں یہ بات واضح ہوگئی جب ایملین ٹوری پارٹی کی پارلیمانی اُمیدوار اور سلویا برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی بانی کارکن بنی۔''

'خواتین کی سماجی اور سیاسی یونین' (WSPU)، آزاد لیبر پارٹی کی خواتین کے ووٹ کے معاملے میں ہچکچاہٹ کی وجہ 1903ء میں وجود میں آئی جو بہت تیزی سے بڑھی اور 1907ء تک اس کی تین ہزار برانچیں تھیں جس میں اُستانیاں، کام کرنے والی لڑکیاں، کلرکس، درزی اور ٹیکسٹائل مزدور شامل تھیں۔ اُن کے اخبار ''خواتین کے لئے ووٹ کا حق'' کی ہفتے میں چالیس ہزار کاپیاں فروخت ہوتی تھیں۔ اُنہوں نے البرٹ مال کو پُر کر دیا اور ہائڈ پارک میں ڈھائی لاکھ لوگوں کا جلسہ کیا۔

1911ء میں جب اسکویتھ کی لبرل حکومت آئرلینڈ کے لیے خود اختیاری کا وعدہ کر رہی تھی تو اُسی لمحے خواتین کے لیے ووٹ کے حق کی اُمید بھی دلائی گئی۔ لیکن بعد میں حکومت دونوں وعدوں سے مکر گئی۔ جب ووٹ کے لیے لڑنے والی خواتین نے اپنے مقصد کی خاطر راست اقدام کا راستہ اپنایا تو اُن پر بدترین تشدد کیا گیا۔ مار پیٹ، گرفتاریاں اور وحشیانہ تشدد کے ذریعے زبردستی کھانا کھلانا۔ اس مہم کو زیادہ تر درمیانے طبقے کی خواتین نے منظم کیا تھا لیکن بورژوا خواتین کی طرف سے کھڑکیاں توڑ کر احتجاج کرنے کے طریقہ کار سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ حکمران طبقہ سختی سے خواتین کے ووٹ کے حق کے خلاف رہا۔ خواتین کے حقوق کی تحریک کے لیے حقیقی راستہ یہ تھا کہ وہ مزدور تحریک کے ساتھ جڑ جائے جو اُس وقت سرمایہ داروں کے ساتھ سخت جنگ کی کیفیت میں تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب برطانیہ میں طبقاتی کشمکش اُبھر رہی تھی، ٹرانسپورٹ اور گودی کے

سماج کو موسموں سے بچاتی رہی، مگر سماج اس کو نہ سمجھ سکا، نہ کوئی گھر دے سکا، یہ المیہ ہے اہل ہنر کا، بنیادی مسئلہ افسانہ نگار نے واضح طور پہ متن کی صورت سامنے رکھ دیا کہ سرمایہ دار کس طرح ہاوسنگ سکیموں کی صورت خود شہروں کے مرکز میں بٹھا جا رہا ہے اور غریب اہل ہنر مارجنز پہ چلے جاتے ہیں، طاقت اپنا مقام طاقت سے حاصل کر لیتی ہے اور طاقت کو کسی شاعر ادیب، اہل ہنر استاد، کے جزبات کا احساس نہیں ہوتا طاقت تو بس مفاد تجسیم کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے طاقت ور کو ہر طرح سے سہولیات فراہم کی ہیں، آج ایک شخص ریاست کے اندر اپنی ریاستیں بناتا جا رہا ہے اور حکومت اس کو سہولیات فراہم کرتی جا رہی ہے، آج صورت حال یہ ہے کہ مارگلہ کی پہاڑیاں آہستہ آہستہ بلڈوز ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ اشرافیہ ان میں ولاز بنائیں گی اور پورا ملک تفریح سے محروم ہو جائے گا۔ یہاں تک فطری حسن کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طاقت پھیلتی جاتی ہے اور کمزور سکڑتے جاتے ہیں ایسے ہی جیسے مائی جولاہی کی زندگی سکڑتی ہے۔ اور آخر میں غائب ہو جاتی ہے۔ یہاں غربت نہیں غریب ختم کیا جاتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ سنجیدہ افسانہ نگار اپنی معاشرت کا شعور رکھتا ہے اور اپنی کہانی میں وہ پراسیس دکھاتا ہے جس سے انسانی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں۔ یہی عمل اس افسانے کا حسن ہے۔ مائی جولاہی افسانے کا ہی نہیں اس معاشرت کا جیتا جاگتا کردار ہے۔

افسانہ نگار نے اس مہارت سے اسے بنا ہے کہ قاری کے دل و دماغ پہ نقش ہو جاتا ہے، افسانے کا عنوان علامتی۔ بیانیہ مضبوط، تہہ دار اور قاری کو سوچنے پہ مجبور کرتا ہے، شاندار افسانہ۔

فکری طور پہ ترقی پسند۔ طبقاتی کشمکش، مزدوروں کی محنت اور مسائل کو متن کرتا پسماندگی کی حقیقی تصویر بنتا ہے۔ اس افسانے کی ایک خوبصورتی محنت کی جمالیات ہے، مائی جولاہی کا کردار، اس کا سراپا، اس کی مصروفیات، اس کی محنت سے لگن، اس کے ہنر سے لگن، ثقافت سے جڑت، یہ سب مارکسی جمالیات کا اہم باب ہے۔ مائی جولاہی ایک ثقافت کی علامت بھی ہے جو دن بدن اربنائی زیشن کا شکار ہوتی سکڑتی جارہی ہے، لیکن مشینوں کی یلغار کے سامنے یہ ثقافت بے بس ہے اور ایک دن معدوم ہو جاتی ہے، افسانہ نگار نے کمال ہنر سے اس ثقافت اور رونق کو زوال پزیر ہوتے دکھایا، ایسا لگتا ہے جیسے مارکس کے اس باب کی تمثیل لکھ دی، مارکس اور مارکسیوں کا خیال ہے کہ طاقت ور کمزور کو اس کے کلچر سمیت تباہ کرنے کی خاطر کوئی بھی حربہ استعمال کر سکتے ہیں۔''

فرخ ندیم

۔ سبین علی کے اسلوب کا یہ آہنگ ان کے دیگر افسانوں میں بھی ملتا ہے۔ وہ 'پتلیاں' ہوں یا ''چیونٹیاں''، 'کیچوا'، 'ہلدی بیچاری کیا کرے'، 'ایتھنے اور سموں' یا 'سرنگ کے راستے'۔ یہ سب ایسے ہی افسانے ہیں۔ جو ماحولیات کی بدلتی ہوئی صورت حال کے تفکر پر قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔

سلمی جیلانی، شاہین کاظمی، نورالعین ساحرہ، اور نسیم سید، کوثر جمال، سبین علی، نگہت نسیم۔ سیمیں درانی وغیرہ کے علاوہ ثروت خان، نگار عظیم، عذرا نقوی، نگہت فاروق، افشاں ملک، طلعت زہرا، ڈاکٹر عشرت ناہید، رومارضوی، مہر افروز نے بھی ماحولیات اور ماحولیاتی آلودگی، تحفظ نسواں جیسے موضوعات کو بھی خوبی سے احاطۂ تحریر میں لینے کی کوشش کی ہے۔ تناؤ سے بھری، بیحد اُلجھی ہوئی زندگی میں ''مادریت'' کا جذبہ کس طرح

لہریں لیتا ہے، اس کا فنکارانہ اظہار بھی ان کی کہانیوں میں موجود ہے۔ ان تخلیق کاروں کی خاص انفرادیت یہ ہے کہ یہ اپنی تحریروں میں نرم خو اور نرم رو عورت کی فطری مادریت کے جزبے سے پر نظر آتے ہوئے بھی کہیں کمزور اور محکوم نہیں نظر آتیں، بلکہ ان کی تحریروں میں ایک ایسی کاٹ ہوتی ہے جو نئی صدی کی عورت اور اس کی ہمت کا اعلانیہ بن جاتا ہے۔ سلمی جیلانی کا افسانہ ''عشق پیچاں'' اردو کی ان چند تخلیقات میں سے ایک ہے جس میں ماحولیاتی مادریت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ سلمی جیلانی نے اس افسانے میں کیا کیا ہنر دکھائے ہیں۔ فکر انگیز جملے' دلچسپ واقعات' سیدھی سادی سی پیچیدگیاں، ایجاز و اختصار، زبان کا برملا اور برجستہ استعمال اور چند لفظوں کے آدھے ادھورے جملے سے ایک ایسے منظر کی تصویر کشی جسے ماحولیاتی مادریت کے خانے میں ڈالا جا سکتا ہے۔

اس افسانے کی قرائت سے اندازہ ہوتا ہے کہ عصری افسانہ ایک ایسی حقیقت ہے جو بعض اہل دانش کے نزدیک معدوم ہو چکی ہے تو بعض اہل نظر اسے معاصر ادبی منظر نامے پر ابھرنے والے سب سے زیادہ نمایاں اور متحرک تصویر تسلیم کرتے ہیں۔ اسلمی جیلانی کی تحریروں میں ماحولیات اور مادریت اس طرح رچ بس گئے ہیں انہیں الگ کر کے دیکھنا محال ہے۔ لہٰذا ان کے افسانے 'لی شوئی کی گلیوں میں۔' بھی یہی کیفیت کارفرما نظر آتی ہے۔ لہٰذا کچرے کے ڈھیر میں پڑے بچے اور ایک عورت کی سوچ کو جس زاویے سے خلق کیا ہے وہ آج کی Irony کو پیش کرتا ہے۔ ایک کچرا بننے والی عورت کو استعارے کے طور پر دیکھیے جو بیکار اشیا کو ریسائیکلنگ کے ذریعے کارآمد بنانے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔ تو انسان تو خدا کی بنائی ہوئی وہ کارآمد مخلوق ہے اسے اس کی مامتا کیونکر بیکار جانے دیتی۔ سلمی جیلانی کا افسانہ ایک عورت کے دردمندانہ دل کی ایسی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

'چراغ آفریدم' نسیم سید کا ایک ایسا افسانہ ہے جو اپنے مختلف ڈکشن سے نہ صرف ہمیں چونکاتا ہے بلکہ اس میں تخلیق کردہ ماحول اور کردار اپنا گہرا نقش ہماری یادداشت پر ثبت کر جاتے ہیں۔ اس افسانے میں نسیم سید نے قدرت اور مادریت کو اپنے

اسلوب میں ایسے ہم آہنگ کیا ہے کہ ذاتی کرب اور استحصال کا نوحہ انکے اس علامتی نظام سے ایک انفرادی پیکر میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ پھولوں، رنگوں اور موسموں کے ذکر سے احساسات اور جزبات کی عکاسی کی گئی ہے تو مٹی، کترن اور کوڑے کرکٹ سے عورت کی بے توقیری کا نوحہ رقم کیا گیا ہے۔ مگر وہی عورت جس کا وجود زمانے کے جبر سے مٹی مٹی ہو کر مٹی میں ہی مل جاتا ہے وہ اپنے جگر گوشے کے لئے ازل سے چلی آرہی اس بے توقیری کے سامنے سینہ سپر ہو کر اس کے وجود کو مٹی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ نسیم سید کا افسانہ مادریت کے جزبے کو معراج عطا کرتا ہے، اور ثابت کرتا ہے کہ عورت ہو یا مٹی اس میں پرورش کی قوت ہوتے ہوئے بھی اس کی بے توقیری ازل سے ہوتی آئی ہے مگر نئی صدی کی عورت اپنی طاقت پہچاننے لگی ہے۔ اور اب اسے اس بے توقیری کی ذرا پرواہ نہیں رہی۔

نسترن احسن فتیحی کا افسانہ نسل آج حکومت کی نت نئی سرکاری پالیسیوں پر ایک تنقید ہے۔ حکومت کی نت نئی سرکاری پالیسیوں کی وجہ سے قبایلی آبادی کا رشتہ جنگل سے کٹتا جا رہا ہے۔ لکڑی کی عدم دستیابی قبائلی غریب گھرانوں کے لوگوں میں کم غذائیت سے بھرپور خوراک میں منتقل ہو رہی ہے۔ نتیجتاً آدھا پکا ہوا کھانا کھانے پر وہ مجبور ہیں۔ اس کی پوری تصویر کشی 'نسل' میں ملتی ہے۔ اس کہانی میں نسترن احسن فتیحی نے project tiger کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں قبائلی زندگی اور فطرت سے ان کے رشتے کو بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کی کئی پرتیں ہیں۔ اس افسانے کی ایک پرت ایکوفیمینزم پر ہے جہاں شکاریوں کے ذریعے ماحول کی تباہی کا اظہار ہو یا ارباب اختیار کے چونچلوں سے بالآخر عورت کے شدید ترین دباؤ کا اظہار ہے۔

افسانے کی دوسری پرت میں متن کی علامتی تفہیم کھل کر سامنے آتی ہے جہاں دنیا ایک جنگل ہے شیر طاقت کا استعارہ اور محکوم طبقات طاقت کے سامنے مجبور و محکوم ہیں زبان بندی کا شکار ہیں جہاں وہ یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ کمسن عورت تیسری بار زچگی کے عمل سے گزرنے والی ہے۔ جہاں عام عوام کی شناخت و حیثیت بے معنی ہو چکی ہے

مجموعی طور پر ایک کس ہوا اور جاندار بیانیہ قاری کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ کرداروں کے مکالمے ان کی لوکیل کو متن میں سموئے ہوئے ہیں اور افسانے کا اختتام بہت فکر انگیز ہے۔ اسے بخوبی سمجھنے کے لیے پروفیسر فرخ ندیم کے ان تجزیاتی اظہار پر غور کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا۔

''جس طرح نسترن نے طاقت کے کلامیوں میں انسانی المیہ پہ بات کی ہے اور جس طرح انھوں نے apartheid and encroachment کو فوکس کیا ہے اس کی مثال کم ملتی ہے۔ مجھے ساوتھ افریکن مصنفہ ''ندین گادیمر'' یاد آئیں۔ شیر طاقت کی ایسی علامت ہے جس کی ہر خطے میں تحسین واجب سمجھی جاتی ہے حالانکہ خون خوار جانور اور درندہ ہے اور مذہب اسلام میں حرام بھی۔ شیر کی علامت نے ہمیشہ طاقت کی خدمت کی اور اس کو لائسنس دیا کہ وہ اپنی بھوک کی خاطر جس کو بھی کھائے جیسے کھائے وہ جائز ہے، کیونکہ اس کی فطرت میں شامل ہے۔ غور کیجئے لفظ فطرت کا کس قدر خوفناک استعمال کیا جاتا ہے۔ انسانی طاقت نے بھی ایسے ہی شیر کی پیروی کی اور جگہ جگہ اس علامت کو استعمال کر کے اپنے مقاصد حاصل کئے۔ طاقت اسی لئے تو معاشروں کو جنگلی رکھنا پسند کرتی ہے تا کہ شیر کی اجارہ داری قائم رہے۔ طاقت اپنے پیرائیوں میں، دساتیر میں اور رویات میں hegemony ساخت کرتی ہے، اگر ہم آپ Antonigramsci اور Michelfoucault پڑھیں، ساری تاریخ واضح ہوتی ہے کہ انسانی ڈسکورس میں طاقت کس طرح اپنا غلبہ اور اجارہ داری قائم رکھنا چاہتی ہے اور رکھتی ہے۔ نسترن کا افسانہ بہت اچھا اور بہت فکر انگیز ہے، عجلت نظر آتی ہے کہیں کہیں۔ اسی طرح پلاٹ کسا ہوا

نہیں ہے، fiction and fact میں ربط ہے تو ٹھیک مگر افسانوں میں لکھاری اصل بات اور بیانیہ میں تھوڑا Distance رکھتا ہے، اور یہی فاصلہ افسانے کی کشش بنتا ہے لیکن یہ فاصلہ ایک حد سے زیادہ ہو جائے تو قاری الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ نسترن نے اس تعلق کو اچھی طرح نبھانے کی کوشش کی ہے۔''

خواتین افسانہ نگار عصری تقاضوں کے تناظر میں نئے نئے موضوعات پر قلم اٹھا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم نام سیدہ نکہت فاروق کا بھی ہے، ان کا افسانہ گاشی اپنے خوبصورت ڈکشن اور منفرد بیانیہ کی وجہ سے معنی و مفہوم کی ایک ایسی دنیا سے روشناس کراتا ہے جہاں روشنی، آفتاب، سورج، اماوس، ست رنگی کشکول جیسے الفاظ کے استعمال سے افسانے کی فضا اور کردار کے احساسات کی ایسی عکاسی ہوئی ہے جو ان اشاروں سے قاری کو درد کے ساحل پر اتار جاتا ہے۔ یہ منفرد بیانیہ ماحولیات سے تانیثی فکر کی گہری رغبت کی گواہی دیتا ہے۔

ترنم ریاض ایک کہنہ مشق ادیبہ ہیں، ان کا ناول ''برف آشنا پرندے'' منظر عام پر آ کر مقبولیت پا چکا ہے۔ جس میں انہوں نے کشمیر کی اساطیری روایات کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ اس مقالے میں شامل ان کا افسانہ مجسمہ نہ صرف یہ کہ قدرت سے ان کی گہری رغبت کا غماز ہے بلکہ انسانیت کی بے چارگی، بے بسی اور لاچاری کو انہوں نے مجسمہ کی شکل میں ایسے تجسیم کیا ہے کہ کچھ نہ کہ کر وہ قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ترنم ریاض کے یہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ در اصل آج کی تاریخ میں نو آبادیاتی صورتِ حال سے دو چار معاشروں میں گوں ناگوں چیلنجوں کا سامنا کر رہی قوموں کے تخلیقی سرچشمے علاقائی، سیاسی و سماجی، معاشی و ثقافتی حالات و کوائف کے بطون سے ہی پھوٹ رہے ہیں۔

غزال ضیغم کے افسانے شکنتلا ہو یا کنول کے پھولوں والا تالاب۔ ان افسانوں میں آم کے درخت ہوں، یا سیمل کے پیڑ، چچی کی بوڑھی آنکھیں، سبزیوں،

پتوں اور پھلوں کا ذکر یا تالاب کے سنگھاڑوں کا ذکر، یا ابا کی ڈلوائی ہوئی ریہو مچھلیاں یا راج ہنس، یا چھوٹی بطخیں، دیوان خانے میں سجی بندوقیں، سب کے سب آرکی ٹائپس کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان افسانوں کے بیانیہ کے مختلف زاویوں اور طرفوں میں ربط پیدا کرتے ہیں۔ان آرکی ٹائپس کے ذریعے غزال ضیغم نے یو پی کی سماجی وثقافتی روایات کو اور یو پی کے فارغ البال گھرانوں کے افراد کی امنگوں اور ارادوں، خواہشوں اور محرومیوں کو تمام تر فنکارانہ مہارتوں اور تاریخی بصیرتوں کے ساتھ افسانے کے مرکزی کردار کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ کنول کے پھولوں والا تالاب سے اقتباس دیکھیں۔

''ہماری آبائی حویلی کے وسیع آنگن میں سناٹا پسرا تھا۔ چاند اداس تھا ستارے چنکے ہوئے تھے، چاندنی دھندلی سی تھی، لکھوری اینٹوں والے لمبے دالان کے اونچے اونچے دروں کے اونچے اونچے ستونوں سے ہلکی ہلکی سسکیاں سی سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے گھوم کر پیچھے دیکھا میری بہنیں الگ الگ ستونوں کے پیچھے کھڑی سسک رہی تھیں۔سب سے پہلے چھٹکی ستون سے باہر نکلی اور آ کر لپٹ گئی۔۔۔۔۔۔تمہری چچی کہن ہے کہ اچھے بمبئ سے جب آئیں تو کہنا تالاب کے کنارے سے گزر جیہیں۔ہمرے دل کا ٹھنڈک پڑ جائے گی۔

بڑے سے کمل بھرے تالاب کے قریب والے روشن دان سے چچی کی بوڑھی آنکھیں مجھے شفقت سے بھگوتی رہتیں۔ میں گھر سے ٹہلنے کے بہانے نکلتا اور تالاب کے کنارے دھیرے دھیرے ٹہلتا رہتا تھا۔''

اس برے تالاب میں سے میں بچپن میں سنگھاڑے اتار کر چچی کے پاس لے جاتا تھا وہ چھیل کر مجھے کھلاتی تھیں۔

اس تالاب میں ابا نے روہو مچھلی ڈلوائی تھیں میں اچھی بڑی موٹی

مچھلی پکڑ کر چپکے سے چچی کے یہاں پہونچا دیتا۔صندل چاول پیس کر مسالحے لگا کر ایسا کُرکُرا کڑوے تیل میں تل دیتی تھی کہ سب انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔

" کل تالاب میں میں نے ایک بڑی روہو دیکھی تھی۔اچھے۔۔؟"

ابا پوچھتے۔

اچھے چُپ۔

کتنی بار اس تالاب میں رپٹا تھا کیچڑ میں لت پت ہوا تھا۔خوب خوب تیرا تھا، کتنے کنول کے پھول چرا کر صندل پر چڑھائے تھے۔آج اتنے بڑے شفاف پانی کے تالاب کو گندگی اور جل کھمبی لیل رہی تھی۔

" گاؤں کی فضا خراب ہے سنبھل کر جانا۔"امّاں ہمیشہ جب بمبئی سے آکر میں گھر سے باہر نکلنے لگتا، کہہ دیتیں۔

"تالاب کے کنارے سے گزرا تو یکا یک مجھے نیلی آبی کی یاد آ گئی۔ یہ راج ہنس تھے جن کو ابّا نے بڑے جتن سے پالا تھا۔تالاب کی رونق تھے۔ چھوٹی بطخیں بھی تھیں۔جو قطار بنا کر شفاف پانی میں مزے سے تیرتی رہتیں تھیں۔ نیلی آبی کی صراحی دار گردن تھی اور چال میں غضب کا بانکپن چلتی تھیں تو لگتا تھا دھرتی ڈول رہی ہے۔مور ناچ رہا ہے ان کے شفاف سفید پنکھ اجلے فرشتوں سے چمکتے تھے روز صبح سویرے وہ تالاب کا رخ کرتیں اور شام ہوتے ہی گھر لوٹ آتیں۔

ایک دن اچانک نیلی غائب ہوگئی۔ہر طرف تلاش کیا گیا نہیں ملی۔۔۔آبی بے حد بے چین۔۔ایک ماہ بعد آبی بھی گم ہوگئی۔۔ اب آبی بے حد رنجیدہ۔کافی عرصے بعد پچھم والے باغ میں انکے

پر دفن کئے ہوئے ملے پتہ چلا یہ بھی منّا کا کمال ہے۔ باغ میں دعوت اڑائی گئی تھی۔ برسات میں تالاب چڑھ آتا تھا رات میں ہزاروں جگنو قمقموں کی طرح جگمگاتے تھے۔

قوس وقزح کے رنگ پانی میں جھلملاتے تھے۔ صندل اور میں چاندنی راتوں میں چاند کا عکس تالاب میں دیکھا کرتے۔

(اقتباس۔ غزال ضیغم)

شاہین کاظمی کی تحریروں کی انفرادیت ان کا مزاحمتی انداز بیان تو ہے ہی، ساتھ ہی ان کی تحریر بیانیہ اور علامت کی حسن کاری سے متشکل ہوتی ہے وہ اپنے بیانیہ میں علامتی رنگ ایسے شامل کر دیتی ہیں کہ تلخ سے تلخ لب ولہجہ قابل قبول ہو جاتا ہے۔ اور وہ معاشرے کے جبر کا پردہ فاش کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کا افسانہ برف کی عورت ہو یا سیندھ، پومپائی ہو یا وہ رویا کیوں نہیں۔ قاری کو جھکجھور کر رکھ دیتا ہے۔ شاہین کاظمی اپنے افسانوی متن میں استعارہ مجاز وعلامت کا اہتمام رکھنا جانتی ہیں، انکے کثیر الجہت معنوی متن میں فنی بالیدگی نظر آتی ہے۔ شاہین کاظمی متوازن سوچ، مثبت انداز فکر، کی حامی ہیں۔ ان کا افسانہ ''وہ رویا کیوں نہیں'' ان کی صالح فکر، انسان دوستی، دیانت داری اور مادری بصیرت کا شاہد ہے۔ وہیں پانچواں موسم میں وہ جنگ کی تباہ کاریاں اور انسانی نفسیات پر پڑنے والے مضر اثرات کے ساتھ ساتھ زمین کی تباہ کاریوں کی ایک کامیاب تصویر کشی کرتی نظر آتی ہیں۔

سیمیں درانی ایک ایسا نام ہے جو نئی صدی کی عورت کا بالکل نیا خاکہ اردو ادب کے صفحات پر مرتب کر رہی ہیں۔ اپنے بے باک انداز بیان، اور تلخ سے تلخ سچائی کو فنی مہارت سے افسانے کے پیرائے میں ڈھالنے کا فن انہیں خوب آتا ہے، وہ سفید اور سیاہ، اچھائی اور برائی کو بالکل الگ کر کے دکھانے کا فن جانتی ہیں، اور زبان کا تخلیقی اور موزوں استعمال معاشرے کے ہر ننگ کو بلا جھجھک دکھانے پر قدرت رکھتا ہے۔ ان کے افسانوں کا اہم وصف دلکش جزیات نگاری اور تاثر کی برجستگی کے علاوہ بغیر لاگ لپیٹ

قاری کو کے حقیقت سے روبرو کرادینا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم نام عذرا نقوی کا ہے۔ان کی نظمیں 'دھنک رنگ'، 'خواب جنگل'، 'ہار سنگھار'، ساون'، 'ملبے کی کہانی' کے علاوہ ان کا افسانہ بوگن ویلیا کی اوٹ سے اپنی زمین سے جڑت کا گہرا احساس رکھتے ہیں اور مادر وطن کی کشش اور اپنی تہذیب سے علیحدگی کی کسک اور اپنی مٹی، اپنی زمین سے محبت ان کا خاص موضوع ہے۔ افسانہ ''بوگن ویلیا کی اوٹ سے'' سادہ بیانیہ میں ایک ایسی سنجیدہ اور فکر انگیز صورت حال کی طرف اشارہ کرتا ہے جو آج گلوبلایزیشن کا ایک اہم مسئلہ بن کر ابھرا ہے۔

انجم قدوائی کا افسانہ 'جہاں سے سلسلہ ٹوٹا' اس تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے اور اربنائزیشن کی وجہ سے پیچھے چھوٹ گئے رشتے اور گاؤں کی یاد کو بہت خوبصورتی سے گاؤں کے ماحول سے جوڑ کر قاری کے دل میں ایک میٹھی سی کسک پیدا کرتا ہے۔اور ان کا ایک دوسرا افسانہ 'صدیوں نے سزا پائی' مکمل طور پر ماحولیاتی تانیثیت کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے جو فطرت اور عورت کے گہرے روابط کا مظہر ہے، اور اس میں انہوں نے یوکلپٹس کے درخت کو ایک جیتے جاگتے کردار کے روپ میں مرکزی کردار کے طور پر پیش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی زندگی میں ماحولیات کی کیا اہمیت ہے۔

اس کڑی میں ایک دوسرا اہم نام نور العین ساحرہ کا ہے۔ان کی تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انھیں ''ایکو فیمنسٹ ٹیکسٹ'' کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کیوں کہ ایک تو اپنی نہاد میں زندگی کی بقا کا عنصر رکھتے ہیں اور دوم یہ اپنی سادگی اور آفاقیت کے تناظر میں پائیداریت کے بھی حامل ہوتے ہیں۔عہد جدید کی صارفیت سے جنم لینے والا یہ افسانہ ''سنو مین'' وہی دنیا پیش کرتا ہے جو مابعد جدید سوچ کا حاصل ہے۔اور اس کا ایک اہم عنصر ماحولیاتی تنقید بھی ہے۔

کتن والی ہو یا، کنول کے پھولوں والا تالاب، عشق پیچاں ہو، نسل ہو یا عشرت ناہید کا 'سہیلی' رومارضوی کا 'گوہر'۔ یا صادقہ نواب کا 'منت' نگہت نسیم کا بیل فلاور

مزدوروں کی وسیع ہڑتالیں چل رہی تھیں۔ 'لبرل' اسکویتھ نے جنوبی ویلز میں کانکنوں کی ہڑتال ختم کرنے کے لیے فوج بھیج دی۔ خواتین کی تحریک کے ایک حصے نے کچھ کامیابی کے ساتھ اسے جاری رکھنے کی کوشش کی۔ سلویا پینکرسٹ نے مشرقی لندن کی محنت کش خواتین میں احتجاج اور پروپیگنڈے کا راستہ اپنایا۔ جنوبی لندن برمونڈ سے میں، ساؤتھ واک پارک میں، ایک بڑی میٹنگ میں مقامی فیکٹریوں اور ورکشاپوں سے پندرہ ہزار مزدور غذائی فیکٹری کی ہڑتال کرنے والی خواتین کے ساتھ مل گئے۔ اُنہوں نے تنخواہ میں اضافے اور ووٹ کا مطالبہ کیا۔ یہی صحیح راستہ تھا یعنی طبقاتی جدوجہد کے ہتھیار کے ذریعے معاشی مطالبات کو سیاسی مطالبات (خصوصاً خواتین کے لیے ووٹ کا حق) کے ساتھ جوڑا جائے۔ مختلف طبقاتی نقطہ نظر کی وجہ سے خواتین کی حق رائے کی تحریک کے ساتھ ساتھ پینکرسٹ خاندان میں بھی پھوٹ پڑ گئی۔ جنوری 1916ء میں جنگ سے چند مہینے پہلے، سلویا کو اپنی ماں ایملین اور بہن کرسٹابیل سے ملنے کے لیے پیرس میں بلایا گیا۔ کرسٹابیل پیرس میں آرام دہ جلاوطنی کی زندگی میں اچھی صحت کی تصویر تھی جبکہ سلویا قید اور بھوک ہڑتال سے خستہ حال تھی۔ سلویا کی طبقاتی مؤقف کے برعکس، اُس کی بہن کرسٹابیل نے WSPU کی مردوں کی تمام پارٹیوں سے خودمختاری پر زور دیا۔ کرسٹابیل نے مطالبہ کیا کہ مشرقی لندن کی فیڈریشن کو WSPU سے نکال دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خواتین کی حق رائے دہی کی تحریک سے محنت کش خواتین کو نکال دیا جائے۔ اس گھمنڈی درمیانے طبقے نے دلیل پیش کی کہ مشرقی لندن کی فیڈریشن کے پاس جمہوری آئین ہے اور محنت کش خواتین پر زیادہ انحصار کرتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کی والدہ نے مصالحت کی کوشش کی لیکن کرسٹابیل واضح علیحدگی پر مُصر تھی۔ اس طرح جنوری 1914ء میں مشرقی لندن کی فیڈریشن کو WSPU سے الگ ہونے پر مجبور کیا گیا اور ایک الگ تنظیم (مشرقی لندن کی فیڈریشن برائے حق رائے دہی خواتین) بنائی۔ محنت کش طبقے کی طرف درمیانے طبقے کی نسوانیت پرستی کا رویہ اس سے بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ جان پکارڈ کہتا ہے کہ ''WSPU میں یہ پھوٹ برطانوی سماج میں عمومی

ہو یا نگار عظیم کا ’ایکوریم‘ ہو یا سیدہ نکہت فاروق کا افسانہ ’گاشی‘ ہو، یا افشاں ملک کا ’جھروکا کھلتا ہے‘ ہو نسائی حسیت اور ماحولیاتی مادریت کی نمائندگی کرنے والے یہ افسانے ایک نئے استعارے کی شکل میں ماحولیاتی تبدیلیوں اور تباہیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔اس کی مزید وضاحت کے لیے یہ چند اقتباس پیش ہیں۔

”_اسٹیٹ ہائی وے بریلی نینی تال روڈ پر ریلوے اسٹیشن "دیورنیاں" سے ایک کلومیٹر مشرق میں یہ گاؤں بسا ہوا ہے، لہلہاتے کھیتوں،آم کے ہرے بھرے باغوں اور دو اطراف بہتی ہوئی نہروں کے ساتھ ہی مشترکہ تہذیب نے اس گاؤں کو ہمیشہ خاص مقام اور فطری حسن عطا کیا ہے_ اسی گاؤں کے گلیاروں میں اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کھیلتے کودتے شرارتیں کرتے میرا بچپن اور لڑکپن گزرا_“

”-- بریلی آ کر شروعات میں جس کرائے کے مکان میں ہم رہائش پذیر ہوئے تھے اس میں دو کمرے ایک دالان اور صحن تھا چھوٹا سا باورچی خانہ، ایک غسلخانہ اور بیت الخلا .... مجھے اس چھوٹے سے گھر میں بڑی گھٹن محسوس ہوتی تھی اور بڑے بڑے کمروں اور دالانوں والا اپنا گاؤں کا گھر بہت یاد آتا تھا جس کا آنگن اس پورے گھر کے برابر تھا اور جس کی ڈیوڑھی اس گھر کے کمرے سے بڑی تھی ...... پھاٹک کے اندر داخل ہو۔تے ہی دائیں جانب تین کمروں اور دالان پر مشتمل ایک پورا گھر ہی تھا جو بطور بیٹھک اور مہمان خانہ استعمال ہوتا تھا، بائیں طرف کافی بڑا حصہ جانوروں کے لئے مخصوص تھا اسی حصے سے ملحق دو کوٹھریاں تھیں جن میں سے ایک میں وہ نوکر رہتے تھے جو ہل چلانے، جانوروں کی دیکھ بھال کرنے، چارا کاٹنے اور دودھ دوھنے کے لئے رکھے

جاتے تھے اور دوسری کوٹھری میں بارش سے بچانے کے لئے چولہوں میں جلانے والا ایندھن (لکڑی اور اپلے) رکھا جاتا تھا۔ گھر میں داخل ہونے کے لئے ڈیوڑھی سے گزر کر آنگن میں آکر داہنی جانب ایک کمرہ جیسا ہی تھا جو باورچی خانہ ہوا کرتا تھا ۔دو بڑی چوکیاں جن پر ہر وقت چٹائیاں بچھی رہتی تھیں کھانا کھانے کے وقت دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا جاتا تھا .....

آنگن میں دیوار دیوار دو طرف کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن میں دادی ہر موسم کے پھولوں کے پودے لگواتی تھیں موسمی پھولوں کے ساتھ ہی بیلے اور ہار سنگار سے انہیں عشق تھا..... دادی بیلے کے پھول اپنے کانوں میں بھی پہنتی تھیں ،اپنے تکیے کے نیچے رکھتی تھیں اور گرمیوں میں جب مٹی کیگھڑوں میں پانی بھر کر ٹھنڈا ہونے کے لئے رکھا جاتا تھا تب وہ پھولوں کو ہار کی شکل میں گوندھ کر گھڑوں کے گلوں میں لپیٹ دیا کرتی تھیں .....! آنگن میں ایک شہتوت اور ایک امرود کا درخت تھا جس کو طوطے اور چڑیاں اپنی جاگیر سمجھ کر بسیرا کرتے تھے اور کترے ہوئے پھل نیچے گرا کر ہم بچوں پر احسان کیا کرتے تھے..!

گاؤں کے گھر والا پورے چاند کی راتوں کا فسوں شہر کے اس چھوٹے سے گھر میں کہیں کھو گیا تھا .....رات کو جب سب لوگ بجلی کے پنکھے چلا کر کمروں میں سو جاتے تو میں تصور میں گاؤں کے اس آنگن میں پہنچ جاتی جہاں سب کے پلنگ لائین سے بچھتے تھے ۔ہم سب بچوں کی چھوٹی چھوٹی کھٹولیاں تھیں اور ڈرنے والے بچے کو آزادی تھی کہ جس کے پاس چاہے اپنی کھٹولی کھینچ کر لے جائے اور میں چونکہ ڈرتی بھی نہیں تھی اور چاندنی راتوں

میں بستر پر لیٹ کر چاند کو تکنا میرا محبوب مشغلہ تھا اسلئے ہمیشہ اپنی کھٹولی سب سے دور ایک طرف لے جاتی تھی_ اس وقت میرا ماننا تھا کہ میرے چھوٹے بہن بھائی شور بہت مچاتے ہیں اور بار بار مجھے مخاطب کر کے اپنی لڑائیوں کے فیصلے کرواتے ہیں اور میرے "چاند" کو تکنے کے عمل میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں.....! میں بستر پر لیٹ کر چاند کی ہر ہر ادا پر نثار ہوتی تھی_ بادلوں سیا ٹھکھیلیاں کرتا چھپتا چھپاتا چاند مجھے ایک شریر بچے کی مانند لگتا تھا.....!

(افشاں ملک کے جھروکہ کھلتا ہے'' سے ماخوذ)

''جنم جلی ...کم بخت...کلموہی...نامراد....کانوں میں اس طرح کی آوازیں پڑتے ہی وہ گرتی پڑتی خوشی خوشی حاضر ہو جاتی۔ اجالا اس کی زندگی سے کوسوں دور تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر ماں نے اسکا نام گاشی رکھا۔ جب پیدا ہوئی تو کسی نے کہا۔''بچی کی آنکھیں گرہن کا شکار ہوئی ہیں۔''.....مگر گرہن تو سورج کو لگا تھا اور اندھیرا گاشی کو نگل گیا۔ اس کی آنکھوں کے کواڑ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سیل بند ہو گئے.... کسی نے صلاح دی۔ کہ گاشی کو مخدوم صاحب کے آستانے کے نچلے زینے پر چھوڑ دیا جائے...جنم جلی...کم بخت... کلموہی...نامراد... ذرا سا قد کیا نکال لیا ماں کو کھا گئی۔ اکثر باپ کے غصے کا شکار ہوتی رہتی۔ اٹھتے بیٹھتے دھتکاری جاتی...بے چاری بن ماں کی بچی...گھر باہر اندھی گاشی کے نام سے مشہور ہو گئی۔''

''۔۔۔اندھی گاشی کو اندھیروں کے مضبوط حصار جکڑے تو تھے ہی، باپ کی پہرے داری میں گھر کی چہار دیواری بھی کسی قید خانے سے کم نہ تھی۔ ابا کے گھر کے باہر جاتے ہیگاشہ کا بچپن کھلکھلا

اٹھتا۔ سہمی سہمی اندھی گاشی ہواؤں سے سرگوشیاں کرتی اور کسی پرندے کی طرح پر تولتے ہوئے آزاد پنچھیوں کے جھنڈ کے ساتھ دور افق تک اڑان بھرتی۔ ہوا کے پروں پر سوار کائنا تکے تمام رنگوں کو اپنی بند مٹھیوں میں بھر کر ابا کے لوٹنے سے قبل ہی لوٹ آتی۔ صیاد شاطر ہو تو پرندوں کو جال کیاں آ ہی جاتی ہیں۔ دھیرے دھیرے اس کے ناپختہ ارادوں کی کچی عمارت کو مضبوطی عطا ہونے لگی۔ پھر ایک روز روشنی کی کرن اندھی گاشی کی شیریانوں میں گزر کر اس کے من کی آنکھیں روشن کر گئی....اس کے بعد شاید ہی اندھی گاشی کو انگلیوں سے ٹٹولنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔۔۔''

۔۔۔''آج ایک عرصے کے بعد اندھی گاشی اپنے من کے سمندر کی ننھی موجوں میں ہلچل محسوس کرنے لگی۔ رات کے پچھلے پہر مانگی گئی اس کی دعائیں بے اثر ہونے لگیں اور نیلگوں بوند بوند پگھلنے لگا اور ایک دن اس کی اپنی کور نگاہی کا صدقہ نئے پڑوسی کی سترنگی کشکول میں ڈالنا ہی پڑا۔ لیکن من کی آنکھوں سے اس نے کچھ دیکھ لیا....وہ....جو آنکھ والوں کو نظر نہ آیا....ابا کو بھی اندھی گاشی کے من کی آنکھوں پر تب یقین آیا جب نیا پڑوسی اندھی گاشی کی کور نگاہی کا صدقہ بنا ڈکار لیے ہضم کر گیا اور ست رنگی کشکول بے دردی سے زمین پر پٹخ دیا۔ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح اندھی گاشی کو کلی سے پھول کر کے نہ جانے کس سمت اڑ گیا۔ واپس پلٹ کر نہ آنے کے لئے....اندھی گاشی کی مٹھیاں اس کی بند پلکوں کی طرح بند رہ گئیں۔۔۔

زمین کی گردش آسمان کو اپنا سیاہ چولا اتار کر اجلی قبا پہننے پر مجبور کرتی ہے اور تب سورج کالے دیو کے چنگل سے آزادی حاصل کر کے

دن کا اعلان کرتا ہے لیکن وقت کی لمبی لمبی کروٹوں کے باوجود بھی اندھی گاشی کی پیشانی پر خوش نصیبی کا تارا نہیں چمکا...اس کے من کا پنچھی ہوا کے جھونکے کی آہٹ پر پھڑ پھڑانے لگتا اور اس کے چاروں طرف پھیلے اندھیرے ناگ بن کر اسے ڈسنے لگتے۔ یہاں تک کہ اس کا شریر نیلا ہو جاتا۔

(نکہت فاروق کے افسانہ: گاشی سے اقتباسات)

وہ پچھلے پانچ دن سے بہت پریشان تھی وہ کیا بستی کے سب ہی لوگ پریشان تھے۔ پچھلے سال کی طرح اس بار بھی بارش منہ دھونے کی حد تک کا پانی دے گئی تھی جس کی وجہ سے میونسپلٹی والے بہت کم وقت کے لیے پانی کی سپلائی کرتے تھے اور وہ جس وقت پانی دیتے تھے بجلی بند کر دیتے تھے تاکہ لوگ پانی کی موٹر نہ چلا سکیں جس کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو پانی بالکل ہی نہیں مل پاتا تھا لیکن اس سب کے باوجود بھی نلوں میں بس گزارے لائق ہی پانی مل پاتا تھا وہ تو بھلا ہو حاجی جی کا جن کے یہاں بورنگ کے ساتھ خوف خدا بھی تھا وہ غریبوں کے لیے ایک گھنٹہ نل کھول دیا کرتے تھے اور وہ لائن میں لگ کر اپنی ضرورت کا پانی بھر لیا کرتی تھی مگر ایک ہفتہ سے ان کے بورنگ بھی جواب دے گیا تھا آخر زمین بھی کب تک اپنا دوہن سہن کرتی رہتی اس کا بھی تو سچ یہی ہے کہ جب تک بارش کے قطرے اس کے دامن کو بگھوتے رہیں گے وہ اپنی نمی قائم رکھ پائے گی لیکن کب کوئی اس بات کو سوچتا ہے۔ زمین نمی کھو دے تو بھی الزام اسی کو کہ بنجر ہو گئی ہے۔''

''---وہ باہر آئی تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا آسمان پر بادل گھر آئے تھے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں بستی کے سارے لوگ

مارے خوشی کے دیوانے ہو رہے تھے کہ آج بارش ہونے والی ہے اسی دم اندھیرا سا چھا گیا سب کے چہرے خوشی سے کھلے پڑ رہے تھے کہ آسمان صاف ہونے لگا بادل تیز ہواؤں کے ساتھ آگے بڑھنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دور چلے گئے اسی کے ساتھ بستی والوں کے منہ اتر سے گئے اور سب قدرت کے اس رویہ پر اداس ہو گئے وہ سوچنے لگی کہ اللہ رحمت بھیج کر برسانا کیوں بھول گیا ہمارا اللہ بھی کتنا سخت دل ہوتا جا رہا نہیں نہیں ایسا تو سوچنا بھی گناہ ہے اس نے جلدی جلدی دونوں ہاتھ گالوں پر مار کر توبہ کی اور مایوس سی اندر چلی آئی دوسرے دن سکینہ، شکیلہ کے ساتھ بستی کی دو چار اور عورتیں بھی جانے کو اکٹھا ہو گئیں۔ راستے بھر ان سب کے ساتھ ان کے دکھ سکھ بھی چلتے رہے۔ سکینہ کبھی ان کی باتوں میں شریک ہوتی کبھی کچی پگڈنڈی پر نکل جاتی جہاں راستے کے پیڑوں پر چڑیا اور مینا کو دیکھ کر وہ بھی ان کے ساتھ پیڑوں پر رہنے کی تمنا کیا کرتی تھی وہ تمنا اس کے دل میں آج بھی بس رہی تھی لیکن آج راستے میں اسے کوئی نہ ملا نہ چڑیا نہ طوطا نہ ہی مینا جانے کہاں کھو گئے اسکے بچپن کے وہ سارے ساتھی لیکن سچ تو یہ تھا پیڑ ہی نہ ملے تو اس پر بسیرا کرنے والے کہاں سے ملتے۔ ندی پہنچنے کی سکینہ کو بہت جلدی تھی وہ بار بار سب کو ٹوکتی، اور پیر تیز بڑھانے کو کہتی۔ جانے اسے جلدی کیوں تھی شاید اس کے اندر بنجارن بننے کا ڈر گھر کرتا ہی جا رہا تھا فیضو کی دھمکیوں میں اب اسے سچ سا نظر آ رہا تھا۔ ایک تلوار اس کے سر پر ٹنگی تھی جانے کب فیضو اسے خانہ بدوش بنا دیگا اور وہ بنجاروں کی طرح بھٹکنے پر مجبور ہو جائیگی ساتھ ہی اس کے اندر کی زرخیزی کی تمنا بھی اسے بچپن کیے رہتی تھی بستی میں جب بھی کسی کی

گود بھرائی ہوتی وہ دور کھڑی ساری رسمیں حسرت کے ساتھ دیکھا کرتی اس کا تو سایہ بھی ایسی رسموں میں منحوس مانا جاتا وہ ہرے پان کے پتے، چھوٹی چھوٹی ہری گھانس، پانچ طرح کے پھل اور میوے مشٹھان جب سہاگن کی گود میں رکھ کر اسے ہری چوڑیاں پہنائی جاتیں تو اس کا دل خون کے آنسو روتا کہ کاش وہ بھی زرخیز ہوتی اس کی کلائیوں میں بھی ہری ہری چوڑیاں کھنکتیں جن کے لیے وہ ترس گئی ہے بس ہرا رنگ ہی زندگی باقی سارے رنگ اس کے سامنے پھیکے۔ کیسی سوکھی خشک بے رنگ سی اس کی زندگی ہے کاش ہرا رنگ اس کا بھی نصیب بنتا۔ نصیب بدلنے کے لیے وہ کتنے باباؤں کے یہاں گئی کتنے مزاروں پر سجدے کر بیٹھی تھی کتنے تعویذ گنڈے اس نے گلے اور کمر میں باندھے تھے مگر ان سب سے کیا ہونا تھا اس کی دھرتی تو پیاسی تھی ہری کونپل کہاں سے پھوٹتی؟۔''

(ڈاکٹر عشرت ناہید کے افسانہ: سہیلی سے اقتباسات)

وہ عجیب سی آواز تھی جس سے اسکی نیند ٹوٹی, خرخراہٹ تھی, کوئی دبی دبی سی چیخ تھی, یا کراہ"! وہ امتیاز نہیں کر سکی... وہ آہستہ سے اٹھی, ہڈیاں چٹخ اٹھیں, خود اسکے منہ سے کراہ نکلی, آہ!!! مگر اسکی کراہ سن کر جاگنے والا کوئی نہیں تھا... ایک کمرے کے مکان کا دروازہ اس نے کھولا, ابھی اندھیرا تھا, لالٹین سنبھالے وہ باہر نکلی, آواز کی سمت کا تعین کر کے وہ آگے بڑھی.. اسکی سمجھ میں نہیں ایا وہ کیا تھا اس نے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا....."

سسسسی "!اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا... تیز ٹھونک نے اسکا ہاتھ زخمی کر دیا تھا... وہ پیچھے ہٹی اور واپس کمرے

کے اندر چلی گئی ابھی صبح ہونے میں شاید دیر تھی, نیند آنے کا سوال ہی نہیں تھا. کروٹیں بدلتے کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ دور کہیں اذان کی آواز گونجی...

صبح کیا جالے میں اس نے اسے دوبارہ دیکھا... وہ کسی پرندے کا بچہ تھا. کیا تھا وہ سمجھ نہیں سکی.. چیل! گدھ! باز! شاہین!؟ اسی قبیل کا کچھ تھا.. اسکا ایک پر ٹوٹ گیا تھا اور وہ اسکے جھونپڑے کے بازو پڑا پھڑ پھڑا رہا تھا.....

"اچھا تو ہے؟ چل رہنے دے خود تو زخمی ہے مجھے بھی زخمی کر دیا""!! وہ اس سے ایسے مخاطب ہوئی جیسے کہ کوئی اسکا ہی بچہ کھیل میں زخمی ہو کر گھر آیا ہو اور اندر آنے سے خوفزدہ ہو کہ ماں کی ڈانٹ نہ سننی پڑے..... اس نے اسے پکڑنے کے ہاتھ بڑھایا اور وہ دبک گیا.. مگر اس مرتبہ وہ اسے پکڑ کر اندر لے آئی..... گرم تیل میں ہلدی ملا کر اس نے اسکے ٹوٹے ہوئے بازو پر مرہم لگایا اور ایک پھٹے کپڑے کی پٹی باندھ دی".. چل اب کچھ دن میں ٹھیک ہو جائیگا"!!!! پرندے کے بچے کو ہلکے سے کمرے میں چھوڑتے ہوئے اسکے اندر کی سوئی ہوئی ممتا نے کہیں کروٹ لی.. بے ساختہ اسکا ہاتھ اسکے اپنے پیٹ پر گیا تلوار کے گھاؤ تو سوکھ گئے تھے مگر روح کے گھاؤ ابھی کچے اور تازہ تھے.. وہ لرز گئی۔

(مہر افروز کے افسانہ: تعمیر نو سے اقتباسات)

ہمارے عہد کا سنگین مسئلہ ماحولیات کی بربادی اور اس سے پیدا ہونے والے تباہ کن نتائج ہیں تو ہمارے عہد میں ادب کا موضوع بھی اس سے اچھوتا نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر ماضی میں فطرت کا ذکر منظر نگاری اور حسن بیان کے لئے ضروری تھا کیونکہ

فطرت کا حسن ہماری زندگی کا ایک لازمی جز تھا تو آج ماحولیات اور فطرت کی تباہ کاری ہماری اولین فکر بن چکی ہے۔ یہ افسانے عالم کاری کے دباؤ اور انتشار کو کچھ اس طرح پیش کر رہے ہیں کہ یہ افسانے ماحولیات کے متعلق انسانی سروکار کے تئیں گہری دردمندی اور موجودہ سماجی رویوں کے خلاف پُرزور احتجاج کی شکل میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

حواشی

1 Adams, Carol, ed. Ecofeminism and the Sacred. New York: Continuum, 1993.

2. Barry Peter "Ecocriticism" Beginning Theroy: An introduction to Literary and Cultural Theory 3rd edition Manchester 2009

3. Caldecott, Leonie and Stephanie Leland, eds. Reclaim the Earth: Women Speak Out for Life on Earth. London: The Women's Press, 1983.

4. Frederick Suresh Contemporary Contemplation on Ecoliterature, New Delhi Authorpess. 2012

5. Gaard, Greta, ed. Ecofeminism: Women, Animals, and Nature. Philsdelphia: Temple Press, 1993.

6. Griffin, Susan. Women and Nature: The Roaring Inside Her. San Francisco: Harper and Row, 1978.

7. Mies, Maria and Vandana Shiva. Ecofeminism. London: Zed Books, 1993.

8. Plant Judith, ed. Healing the Wounds: The Promise of Ecofeminism. Philadelphia: New Society Publishers, 1989.

9. Shiva Vandana Staying Alive: Women ,ecology, and development, London, Zed Books 1988

10. Soper, K. What Is Nature? Blackwell: Oxford. 1995.

11 Spretnak, Charlene. The Resurgence of the Real. Routledge: London/NYC. 1999

12. Sturgeon, N. Ecofeminist Natures: Race, Gender, Feminist Theory, and Political Action. Routledge: London. 1997

تضادات کی عکاسی کر رہی تھی۔

1911ء سے 1914ء کے درمیان ہر شعبے کے محنت کش (گودی کے مزدور، ٹرانسپورٹ، ریلوے، انجینئر) ہڑتال پر تھے۔ حتیٰ کہ WSPU کے وہ کارکنان جن کو قید اور زبردستی خوراک دی گئی، وہ سب محنت کش طبقے کی خواتین تھیں جن کو بدترین حالات اور تشدد کا سامنا کرنا پڑا تھا۔'' یہاں بھی طبقاتی سوال بنیادی تھا۔ خواتین کی حق رائے دہی کی تحریک میں پھوٹ بورژوا نسوانیت پرستوں کی محنت کش خواتین، سوشلزم اور مزدور تحریک کی طرف حقیقی رویے کی غمازی کرتی ہے۔ یہاں ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ 'مرد بمقابلہ زن' کا نعرہ ہمیں کہاں لے جا سکتا ہے۔ پھوٹ کے صرف چند ماہ بعد 1914ء میں پہلی جنگ عظیم نے برطانیہ میں طبقاتی جدوجہد کو تقسیم کر دیا۔ خواتین کے ووٹ کی تحریک کی 'باغی' ایملین اور کرسٹابیل جلد ہی سوشل شاؤنسٹ بن گئیں۔ WSPU کے پرچے کا نام ''خواتین کے لیے ووٹ کا حق'' بدل کر ''برطانیہ'' رکھ دیا گیا۔ اس کا نعرہ تھا ''بادشاہ، ملک اور آزادی!'' یہ خواتین کی تحریک سے ذلت آمیز غداری تھی۔ یہ بورژوا نسوانیت پرستی کی حقیقی فطرت کو واضح کرتی ہے اور اُس خلیج کو بھی واضح کرتی ہے جو اسے محنت کش طبقے اور سوشلزم سے الگ کرتی ہے۔ تمام تر زبانی جمع خرچ اور نعرہ بازی کے باوجود وہ پرولتاری مردوں اور خواتین کے خلاف اپنے طبقے کے مردوں (حکمران طبقہ) کے ساتھ متحد تھیں۔ تمام تر جنگ، اموات اور ذلتیں پرولتاریہ کو برداشت کرنی پڑیں جبکہ بورژوا اور درمیانے طبقے کے خواتین وحضرات اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھ کر صرف جھنڈے لہراتے تھے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ سلویا پینکرسٹ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے جنگ کی مخالفت کی اور فیکٹریوں میں اُن خواتین کے لیے مساوی اُجرت کے لیے مہم شروع کی جن کو محاذ پر بھیجے گئے مردوں کی جگہ بھرتی کیا گیا تھا۔ اس نے ایک پرچہ نکالا جس کا نام تھا "The Workers Dreadnought" بعد میں وہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوئی اور الٹرا لیفٹ مؤقف اختیار کیا۔ اُس کی مارکسزم کی سمجھ بوجھ بہت محدود تھی لیکن کم از کم اس نے ایک طبقاتی مؤقف اختیار کرنے کی کوشش تو

13. Sullivan, Shannon. Living Across and Through Skins: transactional bodies, pragmatism, and feminism. Bloomington: Indiana University Press. 2001

14. Thompson, P. Environmental Education for the 21st Century: International and Interdisciplinary Perspectives. 1997.

15. Turpin, J. & Lorentzen, L. The Gendered New World Order: Militarism, Development, and the Environment. Routledge: London. 1996.

16. Warren, K., et al.. Bringing Peace Home: Feminism, Violence, and Nature. 1996.

17. Warren, K. (ed.). Ecofeminism- Women, Culture, Nature. Indiana University Press: Indianapolis. 1997

18. (1994). Ecological Feminism. Routledge: London.

19. (1996). Ecological Feminist Philosophies. Indiana University Press: Indianapolis.

20. Zimmerman, M. Contesting Earth's Future: Radical Ecology and Postmodernity. 1994

(۱) ڈاکٹر مولا بخش، دھرتے کے دکھ کا غزلیہ اظہار، نئی کتاب، ۱۵، اڈیٹر شاہد علی خاں، اکتوبر دسمبر 2010، ص: ۱۶۵، ۱۶۶

(۲) حنیف ترین، زمین لاپتہ رہی، 2001، لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی، ص: ۲۹

(۳) جمال اویسی، نظم نظم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2004، ص: ۶۰

(۴) راشد انور راشد، کہرے میں ابھرتی پرچھائیں، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، 2012، ص: ۲۱۱

(۵) فرحت احساس، میں رونا چاہتا ہوں، ساہتیہ اکادمی، 2003، ص: ۱۱۹

(۶) پرتپال سنگھ بیتاب، نظم اکیسویں صدی، کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں، 2008، ص:۱۳۸

(۷) عزیز نبیل، خواب سمندر، 2011، ص:۱۸۰

(۸) نعمان شوق، فریزر میں رکھی شام، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2004، ص:۱۷

(۹) رؤف رضا، دستکیں میری، 1999، رومان پبلی کیشنز، ص:48

(۱۰) معاصر اردو غزل، مرتبہ: قمر رئیس، اردو اکادمی دہلی، 2006، ص:242

(۱۱) پروفیسر صادق، خواب میں جلنے کا منظر، موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، 2004، ص:36

(۱۲) عبید الرحمٰن، بدلتا ہوا ماحولیاتی نظام اور ہم" اردو دنیا، نومبر 2007، ص:۳۹ تا ۴۰

(۱۳) (Peter Barry,Begining theory,2004 India Print ,Chapter-13,Ecocriticism, p:248)

(۱۴) گوپی چند نارنگ، فکشن شعریات: تشکیل و تنقید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔(2009)، ص:138-137

(۱۵) عتیق اللہ، پروین شیر کی شاعری کا ماحولیاتی مطالعہ، ص:۱۵، کاروان ادب، فروری، 2005، بھوپال

(۱۶) مولانا الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، (2003)، ص:91,92

(۱۷) سید احتشام حسین، تنقید اور عملی تنقید، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، (2005)، ص:200)

نام : نسترن احسن فتیحی

والد : سید محمد احسن (مرحوم)

والدہ : حمیدہ احسن (مرحومہ)

وطن : سمستی پور، بہار

اقامت : علیگڑھ، انڈیا

تعلیم : ایم۔اے اردو (گولڈ میڈلسٹ)

پی۔ایچ۔ڈی

تصنیفات : (۱) لفٹ (ناول)

(۲) نوحہ گر (ناول) زیرِ طبع

کشمکش (افسانوی مجموعہ) زیرِ طبع

کال بیلیا (ناولٹ) زیرِ طبع

رابطہ : fatihi.nastaran@gmail.com

ECOFEMINISM
aur
Asri Tanisi Urdu Afsana

by

Nastaran Ahsan Fatihi

کچھ اس کتاب سے

ایکوفیمینزم یا ماحولیاتی مادریت کی نظریاتی اور سماجی تحریک نے عورت اور مرد کو یکسانیت کے خانے میں رکھ کر ان دو مختلف جنسوں کے قدرتی اور ذاتی فرق کو واضح کیا ہے۔ ایکوفیمینزم کے اس نظریہ میں عورت اور مرد انسانی لحاظ سے برابر ہیں لیکن جسمانی اور جذباتی لحاظ سے مختلف۔ بعض معاملات میں مختلف حقوق اور مزاج کے حامل ہیں ایکوفیمینزم یا ماحولیاتی مادریت کی یہ اصطلاح بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، ایکوفیمینزم کی یہ اصطلاح دراصل ماحولیاتی تنقید یعنی ایکوکرٹسزم (Eco-criticism) کی ایک ذیلی شاخ ہے۔

ادبی مطالعے میں ماحولیاتی تنقید کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب انسان سے اپنی ضروریات کے پیش نظر دنیا کی ساری چیزوں کو زیر تصرف کر دیا۔ ان اشیا میں جاندار بھی ہیں اور بے جان بھی۔ ایک جرثومہ (بیکٹریا) سے لے کر سورج جیسے فلکی اجسام سبھی انسان کی خدمت اور نفع رسانی کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں۔ شجر، حجر، معدنیات، ہوا، پانی، جنگلات، قدرتی وسائل، حیوانات، چرند و پرند اور خود انسان اس عظیم ماحول کا حصہ ہیں۔ جب تک ماحول کے یہ اجزا فطری انداز میں ایک دوسرے سے روبہ عمل رہے، قدرت یا فطرت کا توازن ٹھیک ٹھاک رہا۔ ماحول کا اثر انسان کی جسمانی بناوٹ، رہائش، طرز حیات، غذا اور دیگر سرگرمیوں پر پڑتا ہے۔ یہ ساری چیزیں جب تک فطری انداز میں رہیں ساری دنیا کا نظام معمول کے مطابق رہا اور انسان اپنے ماحول سے پوری طرح فیضیاب ہوتا رہا۔ مگر بڑھتی ہوئی آبادی سائنسی انکشافات کے غلط استعمال اور انسانی ہوس نے قدرت میں دراندازی شروع کر دی۔ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی لالچ میں یہ استحصال بڑھتا گیا۔

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-874-0

© جملہ حقوق بحقِ ''مصنفہ'' محفوظ

Eco Feminism (Maholyati Tanisiyat)
Aur Asri Tanisi Urdu Afsana

by

Nastran Ahsan Fatihi

Year of Edition 2016
ISBN 978-93-5073-874-0

₹ 360/-

نام کتاب : ایکوفیمینزم (ماحولیاتی تانیثیت) اور عصری تانیثی اردو افسانہ
مصنفہ : نسترن احسن فتیحی
کمپیوٹر کمپوزنگ : ذاکر حسین۔ علی گڑھ
سنہ اشاعت : ۲۰۱۶ء
قیمت : ۳۶۰ روپے
مطبع : عفیف پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے

☆ امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔ M.08401010786 ☆ ہمالیہ بک ورلڈ، حیدرآباد۔ Ph. 040-66822350
☆ حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔ Ph. 040-66806285 ☆ انجمن ترقی اُردو، حیدرآباد۔ M. 09247841254
☆ ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد۔ Ph.040-24411637 ☆ دکن ٹریڈرس، حیدرآباد۔ Ph.040-24521777
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ممبئی۔ Ph.022-23774857 ☆ کتاب دار، بک سیلر، پبلشر، ممبئی Ph.09869321477
☆ بک امپوریم، پٹنہ۔ M.09304888739 ☆ عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ۔ M.09433050634
☆ دانش محل، لکھنؤ۔ Ph.0522-2626724 ☆ راعی بک ڈپو، الٰہ آباد۔ M.09889742811

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

کی۔ 1918ء میں تیس سال سے زائد عمر کی برطانوی خواتین نے ووٹ کا حق حاصل کرلیا۔ یہ خواتین کی حق رائے دہی کی تحریک کے طریقہ کار کے نتیجے میں نہیں ہوا بلکہ انقلاب روس اور پہلی جنگ عظیم کے بعد اُبھرنے والی انقلابی تحریک کے نتیجے میں ممکن ہوا جس نے برطانوی حکمرانوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور وہ مراعات دینے پر مجبور ہوئے۔ یہاں بھی یہ بات واضح ہوئی کہ اصلاحات انقلاب کی ضمنی پیداوار ہوتی ہیں۔

انقلاب روس اور خواتین :

فروری ۱۹۱۷ عیسوی روس میں محنت کش طبقے کی خواتین نے اپنی قوت کا بھرپور انداز میں مظاہرہ کیا اور عین خواتین کے عالمی دن کے موقع پر پیٹروگراڈ کی خواتین مزدوروں نے ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور اس طرح روسی جابر تاناشاہ زار کی حکومت کو اس انقلاب نے اکھاڑ پھینکا گو کہ مقامی بالشویکوں نے قتل عام کے ڈر سے اُنہیں اس کام سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے اپنی پرولتاری جبلت کے بل بوتے پر تمام اعتراضات کو ایک طرف رکھتے ہوئے انقلاب کا آغاز کیا۔ الیگزنڈرا کولانتائی جیسی خواتین نے بالشویک انقلاب میں اہم قائدانہ کردار ادا کیا۔ اکتوبر میں برپا ہونے والے انقلاب نے خواتین کو دنیا کے کسی بھی ملک سے بڑھ کر حقوق دیئے جو اُنہیں پہلے کبھی حاصل نہیں تھے۔ بالشویکوں نے عورت کی آزادی اور خاندان کو تبدیل کرنے کی بات کی۔ دیہی علاقوں میں قدیم دور سے مردانہ حاکمیت قائم تھی۔ جس کے سبب غلامی اور جبر پر مبنی زندگی کے علاوہ کسان خواتین کچھ نہیں جانتی تھیں۔ انقلاب کے آنے سے پہلے شوہر کا بیوی پر تشدد قانونی طور پر جائز تھا۔ بالشویکوں نے شادی، خاندان اور سرپرستی کے قوانین کے ذریعے خواتین کو مردوں کے برابر قانونی حیثیت دی۔ شادی کے بغیر پیدا ہونے والے بچوں کو وہی حقوق حاصل تھے جو شادی شدہ جوڑوں کے بچوں کو حاصل تھے۔ طلاق درخواست پر مل جاتی تھی اور اسقاط حمل کو قانونی حیثیت دی گئی۔ ''ایک جیسے کام کے لیے مساوی اجرت'' کو قانونی حیثیت دی گئی۔ بالشویک خواتین کے دستوں

نے خواتین تک انقلاب کا پیغام پہنچایا۔ محنت کش طبقے کی کسان خواتین کے لیے سیاسی تعلیم اور خواندگی کی کلاسیں شروع کیں اور جسم فروشی کے خلاف قانونی جنگ لڑی گئی۔ انقلاب کے بعد ہونے والی خونی خانہ جنگی کے دوران خواتین کی بڑی تعداد نے سرخ فوج کے لیے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کی، حالانکہ انہیں ایسا کرنے کے لئے کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا تھا۔ 1920ء تک پچاس سے ستر ہزار خواتین نے سرخ فوج میں شمولیت اختیار کی۔ یہ از خود اس بات کی ضمانت ہے کہ بالشویکوں نے خواتین میں کتنی حمایت حاصل کر لی تھی۔

خلائی سفر پر جانے والی پہلی خاتون ویلنٹینا ترشکووا کا تعلق سوویت یونین سے تھا لینن، جس نے عورت کی آزادی کو بہت اہمیت دی، اس نے اس بات پر بہت زور دیا کہ خواتین کو گھریلو کام کاج سے آزاد کیا جائے تا کہ وہ سماج کو چلانے کے کام میں حصہ لے سکیں۔ تاہم انقلاب آنے کے فوراً بعد روس میں مادی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت ذرائع پیداوار کی شدید پسماندگی کی وجہ سے محدود تھی۔ جیسا کہ مارکس نے پیشن گوئی کی تھی کہ ''کسی بھی سماج میں اگر ضرورت عام ہو تو تمام تر پرانی بیہودگی زندہ ہو جاتی ہے۔ ''عورت کی حقیقی آزادی صرف تب ممکن ہے جب عالمی محنت کش طبقہ مجموعی طور پر آزادی حاصل کر لے۔ سوشلزم انسانی شخصیت کی آزاد نشو ونما، تمام تر وحشیانہ بیرونی دباؤ (سماجی، معاشی یا مذہبی) سے آزاد مردوں اور عورتوں کے درمیان حقیقی انسانی رشتے کو ممکن بنائے گا۔ تاہم اس طرح کے سماج کے لیے زیادہ ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ملکوں کی معاشی اور ثقافتی ترقی سے بھی زیادہ اعلیٰ سطح کی ترقی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے روس میں وسیع پسماندگی کی وجہ سے اس طرح کی بنیاد موجود نہیں تھی۔ لہٰذا انقلاب کے نتیجے میں ہونے والی تمام تر ترقی کے باوجود روس میں پہلے تو سٹالنزم اور اس سے بھی بڑھ کر سرمایہ داری کی دوبارہ استواری نے خواتین کے مقام کو مزید پیچھے دھکیل دیا۔ اب مشرقی یورپ اور روس میں عورت کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہے۔ اس پر کسی کو حیرت یا استعجاب نہیں ہونا چاہئے۔ سرمایہ داری کے زیر اثر روس یا کسی اور ملک میں بھی کوئی راستہ ممکن نہیں۔

1917ء کے روس کی طرح بعد میں ہمیں اور بھی بہت سی مثالیں نظر آتی ہیں۔ خواتین سرمایہ داری کو اکھاڑنے اور سوشلزم کی تعمیر میں اپنا بنیادی کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ لیکن یہاں بھی، یہ سب سے بڑھ کر محنت کش خواتین کا سوال تھا جو اپنی اور پورے طبقے کی آزادی کے لیے لڑ رہی تھیں۔ محنت کش خواتین اور حضرات طبقاتی جدوجہد میں حصہ لے کر طبقاتی شعور اور اعتماد حاصل کرتے ہیں۔ سماج کے اندر ایک عظیم تبدیلی لانے کی جدوجہد کرنے والے مرد و خواتین اپنے اندر وہی تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ ہم ہر ہڑتال میں دیکھتے ہیں کہ کس طرح محنت کش پرانی غلامانہ ذہنیت کو توڑ کر نئی بلندیوں پر پہنچ کر تخلیقی صلاحیتوں اور جارحیت کا ایسا مظاہرہ کرتے ہیں جس کا اُنہیں پہلے پتہ بھی نہیں ہوتا۔ ایک انقلاب کی صورت میں یہ بات اور زیادہ سچ ہوتی ہے۔ نہ صرف خواتین بلکہ تمام خواتین و حضرات کے لیے حقیقی آزادی حاصل کرنے کا صرف یہی ایک راستہ ہوتا ہے۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ناممکن ہے۔ اس طرح کی جدوجہد ہوتی آئی ہے اور کرنی چاہیے جو خواتین کی حالت بہتر کرے اور تعصب اور امتیازی سلوک پر ضرب لگائے۔ مزدور تحریک کو اس جدوجہد میں پیش پیش دیکھا گیا ہے۔ عورت کی آزادی اور سوشلزم کے علم برداروں نے اور اسی طرح ماضی میں بورژوا انقلابات نے 'انسان کے حقوق' کی بات کی لیکن عملاً ان انقلابات میں عورت کو برابری حاصل نہ ہوسکی۔ دراصل سرمایہ داری میں عورت کی پیش رفت کچھ طبقاتی جدوجہد کی وجہ سے اور کچھ پیداوار میں عورت کے تبدیل شدہ کردار کی وجہ سے ہوئی۔ چندے معدودے ترقی یافتہ ممالک میں کچھ سیاسی حقوق تو حاصل کئے گئے ہیں لیکن حقیقی آزادی آج بھی میسّر نہیں ہوئی اور نہ ہی سرمایہ داری کے اندر یہ ممکن ہوا۔ 1848ء میں مارکس اور اینگلز نے بورژوا خاندان کے خاتمے کا مطالبہ پیش کیا تاہم اُن کو معلوم تھا کہ خاندان کو یک لخت ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مادی بنیادوں کی موجودگی کے بغیر یہ مطالبہ پورا نہیں ہوسکتا۔ یہ تب ممکن ہے جب سرمایہ داری کو اُکھاڑ کر ایک نیا سماج قائم کیا جائے جس کی بنیاد پیداوار کی ہم آہنگ اور جمہوری منصوبہ بندی پر مستحکم ہو اور انتظامی معاملات میں پورا معاشرہ حصہ لے۔ 1931 کے

سوویت یونین کے پوسٹر پر یہ الفاظ درج تھے:

''باورچی خانے کی غلامی کو چھوڑو، آؤ ایک نئی قسم کی گھریلو زندگی قائم کریں''

ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیداواری قوتیں ذاتی ملکیت اور قومی ریاست کی جکڑ سے آزاد کر کے ہی معاشی خوشحالی کی ایک ناقابل یقین سطح پر فوراً پہنچانا ممکن ہوسکتا تھا۔ خوف، لالچ، ہوس اور حسد کی پرانی ذہنیت کو ختم کر کے اُن مادی بنیادوں کو ختم کرنے کی ضرورت تھی جس نے اُنہیں جنم دیا تھا۔ زندگی کے حالات، مرد اور عورت کے درمیان رشتوں اور اُن کی سوچ اور فعل کی تبدیلی کے لیے راستہ صاف کرنے کی ضرورت کو ہمیشہ محسوس کیا گیا۔ اس لئے اس طرح کی بڑی چھلانگ کے بغیر لوگوں کے کردار اور نفسیات کو تبدیل کرنے کی تمام باتیں فریب اور بکواس سمجھی جاسکتی ہیں۔ سماجی وجود شعور کا تعین کرتا ہے۔ پدرسری یا مردانہ حاکمیت والے معاشرے کی بربریت جو خود غرضی، انا پرستی اور لوگوں کی بدحالی سے لاپرواہی پر زور دیتی ہے، دراصل غلامی کی باقیات ہیں۔ پدرسری یا مردانہ حاکمیت والا معاشرہ نام نہاد اخلاقیات، منافقت اور عمومی پراگندگی سے مبرا نہیں ہے۔ اس معاشرے میں خواتین کی جانب پسماندہ رویے اب بھی موجود ہیں جن کے ساتھ سختی سے نمٹا جانا چاہیے۔ تانیثیت یا فیمینزم کی تحریک مرد اور عورت کی مکمل برابری پر مبنی نئے سماج کی بات کرتی ہے۔ گو کہ یہ حقیقت ہے کہ ایسا معاشرہ سرمایہ دارانہ سوچ کی موجودگی میں قائم کرنا ناممکن ہے۔ لہذا تانیثیت کی تحریک یہ مانتی ہے کہ ہمیں کم از کم ایک حقیقی مساوی اخلاقیات کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے اور تحریک سے اُن پسماندہ رجحانات کو نکال باہر کرنا چاہیے جو مرد اور عورت کے اتحاد کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ایک طرف اس بات کو یہاں یہ سمجھنا لازم ہے کہ سرمایہ داری کے تحت ہر بہتری کا کردار عارضی، مسخ شدہ اور غیر مستحکم رہا اور مستقل طور پر نظام کے بحران، حالات کی عمومی ابتری اور سماجی، اخلاقی اور ثقافتی زوال کی وجہ سے خطرے میں رہا۔ دوسری طرف یہ لازمی ہے کہ خواتین پر جبر کے خلاف تحریک کو محنت کش طبقے کی سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد سے جوڑا جائے۔ یہی فتح کا واحد راستہ لگا اور مختلف تحریکیں وجود میں

آئیں۔ مگر پرانے سماج کی نفسیاتی باقیات، خود غرضانہ رویے، لالچ اور انا پرستی سرمایہ داری کو اُکھاڑ پھینکنے کے بعد بھی راتوں رات ختم نہیں ہونگی۔ اس ذہنی رویے کو ختم کرنے میں وقت درکار ہوگا۔ لیکن ابتدا سے ہی مردوں اور عورتوں کے درمیان رشتے بہتر کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ اچھے روزگار، رہائش اور سب کے لیے تعلیم کی فراہمی سے خوفناک معاشی دباؤ کو ختم کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا گیا، جو زندگیوں کو برباد اور انسانی رشتوں کو مسخ کر رہا ہے۔ ان تحریکوں کو چلانے والوں کا خیال تھا کہ... پیداوار کی جمہوری سوشلسٹ منصوبہ بندی سے ہر ایک کے لیے وہ مواقع پیدا ہونگے کہ وہ سماج کو چلانے میں حصہ لے سکے۔ یہ عمل پرانے مرکز مائل خاندان کو ختم کر کے نئے اور آزاد انسانی رشتوں کی بنیاد پر ایک بالکل مختلف نفسیات کے لیے حالات تیار کرے گا۔ طبقاتی سماج اور اس سماج سے پیدا ہونے والی غلامانہ ذہنیت کے بالآخر خاتمے سے ایک نئے مرد اور عورت کا جنم ہوگا جو پرانی تنگ نظر غلامانہ نفسیات سے حقیقی معنوں میں آزاد ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی سے رہنے کے قابل ہونگے۔ مرد اور عورت مادی اشیا کے ذلت آمیز جستجو، جو انسانی زندگی کو ذلیل اور مسخ کرتی ہے، اس سے آزاد ہونے پر ہی یہ ممکن ہوگا کہ وہ بحیثیت انسان ایک دوسرے سے جڑ سکینگے۔ بیرونی دباؤ، انا پرستانہ حساب کتاب یا ذلت آمیز انحصار سے آزاد ہو کر مرد اور عورت کے درمیان تعلقات حقیقی برابری کی بنیاد پر قائم ہونگے۔ مگر صد افسوس کہ ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی آج عورت اور فطرت کا استحصال جاری ہے اور یہ لمحہ فکریہ ہے کہ آج بھی عورتوں کے لئے ماحول اور حالات سازگار نہیں ہیں۔

تیسری دنیا کا پدرسری معاشرہ

تیسری دنیا کی صورت حال کچھ زیادہ پیچیدہ ہے کیونکہ اس کا معاشرہ بالخصوص پدرسری یا مردانہ حاکمیت والا معاشرہ ہے۔ اس لیے غریب اور محنت کش عورتیں دہرے استحصال کی شکار ہوتی ہیں۔ عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی بات کرتے

ہوئے ہمیں پدرسری اور روایتی سوچ کو تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ اقتصادی نظام کی جابرانہ شکلوں کو بھی تبدیل کرنا چاہیے۔ عورتوں اور غریبوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتے ہوئے ایک فلاحی ریاست کے قیام کا مطالبہ بھی ضروری ہے۔ آج کل ہم سرمایہ داری کی ایک نئی شکل یعنی نیولبرل عہد میں جی رہے ہیں جہاں گینگ ریپ کے واقعات عام ہیں۔ جب کہ غریب ممالک میں محنت کش خواتین پر تشدد کے واقعات عام ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ عورتوں کے خلاف ایک عالمی جنگ چھڑ چکی ہے۔ محترمہ وندنا شیوا کا دنیا بھر میں ماحولیات کے حوالے سے جانا پہچانا نام ہے، ان کا کہنا ہے کہ عورتوں پر تشدد اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ پدرسری نظام۔ اس نظام کی بنیاد عورت کی محکومیت اور اسے مساوی انسانی درجہ حاصل کرنے کے حق سے انکار پر رکھی جاتی ہے۔ عورتوں پر تشدد کے خاتمے کی تحریک اس وقت تک جاری رہنی چاہیے جب تک ہر عورت کو انصاف نہ مل جائے۔ عورتوں پر تشدد دنیا بھر میں ایک اہم پالیسی ایشو رہا ہے اور اس حوالے سے شلٹر ہومز اور دیگر محفوظ پناہ گاہیں قائم کرنے پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں اپنی حکومتوں سے مطالبہ کرتی رہی ہیں کہ سروس ڈلیوری کے لیے بجٹ فراہم کیا جائے، عورتوں کے تحفظ کے لیے بہتر اور موثر قوانین بنائے جائیں اور تشدد کے بنیادی اسباب پر زیادہ توجہ دی جائے جن میں عورتوں کی ساختیاتی سماجی عدم مساوات بھی شامل ہے۔ ان مطالبات کو پورا کرنے کے لیے حکومتوں کی دلچسپی اور شمولیت اور بجٹ میں اضافہ ضروری ہے۔ سرمایہ داری کے موجودہ دور یعنی نیولبرل ازم میں جس کا آغاز 1970ء کے عشرے میں برطانوی وزیر اعظم تھیچر اور امریکی صدر ریگن کی حکومتوں سے ہوا، نجی کاری اور ڈی ریگولیشن کو فروغ دیا گیا تا کہ مسابقت اور خرچ اور استعمال کرنے کی انفرادی آزادیوں کا تحفظ کیا جا سکے۔ مارکسٹ عالم ڈیوڈ ہاروے کے بقول 70ء کے عشرے کی کساد بازاری کے نتیجے میں دنیا گرتی پڑتی نیولبرل ازم کی طرف بڑھی جب ایک مداخلت کار ریاست کا بنایا ہوا سرمایہ اور محنت کا مضطرب جوڑ ختم ہو گیا۔ مثال کے طور پر برطانوی حکومت کو آئی ایم ایف کے کہنے پر فلاحی اخراجات ختم کرنے

پڑے تھے۔ مشہور صحافی راحیلہ گپتا کے بقول 1970ء کے عشرے سے حقوق نسواں کی دوسری لہر اور نیولبرل ازم کے پھلنے پھولنے کی بدولت تحریک نسواں کی کچھ رہنماؤں خاص طور پر نینسی فریزر کا کہنا ہے کہ تحریک نسواں نے سرمایہ دارانہ معاشرے کی ساختیاتی قلب ماہیت کو جائز ثابت کرنے میں مدد دی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ سرمایہ دار اپنی بقا کے لیے اپنے مخالفین کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا گُر جانتے ہیں۔ نیولبرل ازم کا ایک مقصد ریاست کے اختیارات کو کم کرنا بھی ہے۔ دوسری طرف تحریک نسواں کے قائدین بھی ریاست کو پدرسری ہونے پر تنقید کا نشانہ بنا رہی تھیں۔ یہ تنقید نیولبرل سرمایہ داروں کو اپنے حق میں لگتی تھی۔ مگر اب نیولبرل ازم کی چمک دمک ختم ہو رہی ہے جب کہ تحریک نسواں پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ تحریک نسواں نے شاید نیولبرل ازم کے لیے اتنا جواز فراہم نہیں کیا مگر نیولبرل ازم نے ایک چمکتی دمکتی اور بالآخر ایک جعلی تحریک نسواں کے لیے جگہ ضرور فراہم کی۔ جس کا اظہار سپائس گرل کے اس گیت میں ہوا

I really, really want Girl Power

روایتی پدرسری سوچ عورت کو گھر کی چار دیواری میں مقید دیکھنا چاہتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہم ایک طبقاتی معاشرے میں رہ رہے ہیں اور طبقاتی نظام کی بنیاد ہی محنت کشوں اور غریبوں کے استحصال پر رکھی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تیسری دنیا کا یہ معاشرہ پدرسری یا مردانہ حاکمیت والا معاشرہ بھی ہے۔ اس لیے غریب اور محنت کش عورتیں ذہرے استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔ عورتوں کے لیے روزگار کے مواقعے پیدا کرنے کی بات کرتے ہوئے ہمیں پدرسری اور روایتی سوچ کو تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ اقتصادی نظام کی جابرانہ شکلوں کو بھی تبدیل کرنا چاہیے۔ عورتوں اور غریبوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتے ہوئے ایک فلاحی ریاست کے قیام کا مطالبہ بھی ضروری ہے۔ تحریک نسواں کی دوسری لہر اور حالیہ لہر کا درمیانی عبوری عرصہ وہ تھا جس میں سرمایہ داروں نے تحریک نسواں کے سیاسی سیاق و سباق پر قینچی چلادی۔''

نیولبرل پالیسیوں کے نتیجے میں جہاں عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع بڑھے ہیں وہیں منڈی اور گھر دونوں جگہ عورتوں کے کام کے بوجھ میں اضافہ ہوا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی غیر ہنرمند عورتوں کی غربت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ان کے پاس نہ پیداواری وسائل ہیں اور نہ ہی سرکار انھیں کوئی سہولت مہیا کرتی ہے۔ اس غربت اور پسماندگی کی وجہ سے ان کے تشدد کا شکار ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

مرد جب سرمایہ داری کے استحصال کا شکار ہوتا ہے اور بے روزگار ہوتا ہے تو وہ اپنا غصہ عورت پر ہی نکالتا ہے۔ دوسری طرف نیولبرل پالیسیوں کے نتیجے میں حکومت کی عوام کے لیے فلاحی اقدامات کرنے کی استعداد کم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر بجٹ میں تعلیم، صحت اور دیگر سماجی خدمات کے لیے مختص رقم کم سے کم ہوتی جاتی ہے۔ عوام کے مسائل حل کرنے اور عورتوں پر تشدد کے خاتمے کے لیے ہمیں ایک فلاحی مملکت کے قیام کا مطالبہ کرنا چاہیے۔

Carol Gilligan and NancyChodorow's نے اپنے تحقیقی مقالے میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ مرد بنیادی طور پر خود پسند ہوتے ہیں جبکہ عورتیں اجتماعیت پر یقین رکھتی ہیں اور جمہوریت پسند ہوتی ہیں۔ فکری سطح پر عورتوں اور مردوں کے درمیان یہ فرق دو مختلف اخلاقی نظام (ethical systems) کی بنیاد ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین ذمہ داریوں پر توجہ مرکوز کرتی ہیں اور کیرنگ ہوتی ہیں، جبکہ مرد خود پسند ہوتے ہیں۔ Gilligan کا خیال ہے کہ فکری سطح پر عورتوں اور مردوں کے درمیان اس فرق کے باوجود دونوں میں اخلاقی استدلال کی دونوں اقسام تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے، لیکن "ترجیحات (focus) کا فرق ہوتا ہے۔ عورتوں کی ترجیحات مردوں کی ترجیحات سے مختلف ہوتی ہیں۔ مردوں کے خود پسند تصورات اور اس سے منسلک اخلاقی نظام ہوتے ہیں جس میں جبر اور استحصال کا پہلو ابھر آتا ہے۔

اس کے برعکس، Gilligan ایک مختلف طریقہ کار کی بھی نشاندہی کرتا ہے جو

عموماً عورتوں سے منسوب ہے اس طریقہ کار میں اخلاقی مسائل متصادم ذمہ داریوں سے ابھرتے ہیں دنیا کے بہت سے معاشروں میں عورتیں ایک نوعیت کی محرومیت کا شکار رہی ہیں اور ان کے انسانی حقوق کو بھی پامال کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کو ہمیشہ انتہا پسندانہ نظریہ سے دیکھا گیا ہے۔ بعض انتہا پسندانہ نظریات میں عورت کو دوسرے درجے کی مخلوق، پست اور انسانی عزت وعظمت سے عاری قرار دیا گیا ہے۔ عورت کے بارے میں اس ظالمانہ نظریہ کے ردعمل میں بعض نئی تحریکوں نے جنم لیا جن کا ہدف عورت، ماحول جانور اور کمزور طبقے پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھانا ہے۔

ایکوفیمینزم یا ماحولیاتی مادریت:

ایکوفیمینزم "یا ماحولیاتی مادریت کی نظریاتی اور سماجی تحریک نے عورت اور مرد کو یکسانیت کے خانے میں رکھ کر ان دو مختلف جنسوں کے قدرتی اور ذاتی فرق کو واضح کیا ہے۔ ایکوفیمینزم کے اس نظریہ میں عورت اور مرد انسانی لحاظ سے برابر ہیں لیکن جسمانی اور جذباتی لحاظ سے مختلف۔ بعض معاملات میں مختلف حقوق اور مزاج کے حامل ہیں ایکوفیمینزم" یا ماحولیاتی مادریت کی یہ اصطلاح بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، "ایکوفیمینزم " کی یہ اصطلاح دراصل'' ماحولیاتی تنقید'' یعنی '' ایکو کرٹسزم'' (Eco-criticism) کی ایک ذیلی شاخ ہے۔

ماحولیاتی تنقید(Eco Criticism)

اب ادبی متون کی قرات کسی ایک رجحان، نظریہ، آئیڈیولوجی یا سیاق کی رو سے کرنا محال ہوگیا ہے کیونکہ آج کا قاری متن سے مکالمہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید کی دنیا میں مختلف النوع اقسام کی ترجیحات ایک اٹل قانون بن چکی ہیں۔ بعض ترجیحات یا نظریات اپنی شدت پسندی کی وجہ سے رد کردی جاتی ہیں تو بعض ترجیحات کی بنیادیں معروضیت یا کلی قرات پر استوار ہوتی ہیں۔ اسی باعث تنقیدی متون کے قارئین

کے بڑے حلقے میں اسے قبولیت کی سند مل جاتی ہے۔ مابعد جدید دور میں ماحولیاتی تنقید کہ جس نے حال ہی میں ادب کے مطالعے میں ماحول، فضا، منظر، فطرت، ثقافت، رہن سہن کے طور طریقوں، مقامیت، دیہی جمالیات کو ماحولیات سے موسوم کیا گیا ہے اس نے اپنی ترجیحات مقرر کر لینے کی وجہ سے ایک الگ تنقیدی مکتبۂ فکر کا روپ دھار لیا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ماحولیاتی تنقید کا ایک طرف اگر فطرت اور ثقافت سے تعلق ہے تو دوسری طرف یہ سائنسی علوم اور انسانی علوم سے بھی وابستہ ہے۔ گویا کہ اب ادب، سائنس اور انسانی علوم جیسے آج ایک ہی پلیٹ فارم پر آ گئے ہیں اسی لیے آج ادب اور غیر ادب پر بات کرنا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ ماحولیاتی تنقید ادبی طریق کاروں یعنی بیان و بدیع کی امتیازی شکلوں کے ساتھ ساتھ دیہی زندگی کے پیکروں، ماحول، فطرت اور مناظر کی پیش کش کی نوعیت کیا ہے پر زور دیتی نظر آتی ہے۔

ماحولیاتی تنقید "(Eco Criticism) میں صرف ادب کا متنی تجزیہ نہیں ہوتا اور نہ ہی تاثراتی رسائی کے تحت ادب کا تجزیہ اور مطالعہ کیا جاتا ہے بلکہ معروض کے مظہرات کو اور اس کے علت و معمول کے رشتوں سے ادب کی معنویت میں معنیات تلاش کی جاتی ہے۔" ادبی مطالعے میں ماحولیاتی تنقید کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب انسان سے اپنی ضروریات کے پیش نظر دنیا کی ساری چیزوں کو زیر تصرف کر دیا۔ ان اشیا میں جاندار بھی ہیں اور بے جان بھی۔ ایک جرثومہ (بیکٹریا) سے لے کر سورج جیسے فلکی اجسام سبھی انسان کی خدمت اور نفع رسانی کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں۔ شجر، حجر، معدنیات، ہوا، پانی، جنگلات، قدرتی وسائل، حیوانات، چرند و پرند اور خود انسان اس عظیم ماحول کا حصّہ ہیں۔ جب تک ماحول کے یہ اجزا فطری انداز میں ایک دوسرے سے روبہ عمل رہے، قدرت یا فطرت کا توازن ٹھیک ٹھاک رہا۔ ماحول کا اثر انسان کی جسمانی بناوٹ، رہائش، طرز حیات، غذا اور دیگر سرگرمیوں پر پڑتا ہے۔ یہ ساری چیزیں جب تک فطری انداز میں رہیں ساری دنیا کا نظام معمول کے مطابق رہا اور انسان اپنے ماحول سے پوری طرح فیضیاب ہوتا رہا۔ مگر بڑھتی ہوئی آبادی سائنسی انکشافات کے

انتساب

خواتین ادیبوں

کے نام

غلط استعمال اور انسانی ہوس نے قدرت میں دراندازی شروع کر دی۔ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی لالچ میں یہ استحصال بڑھتا گیا اس نے اپنی سہولت اور فائدے کی خاطر پُل، باندھ، کالونیاں، فلک بوس عمارتیں، کارخانے وغیرہ بنائے نیز قدرتی ماحول میں مداخلت کرتے ہوئے بری طرح جنگلات کی صفائی کی، سمندروں کو پاٹ کر زمین کی بازیابی کی، ساحلی علاقوں کے مینگروز، مونگے کی چٹانوں اور کھاڑیوں کو ختم کر کے انسانی آبادی کو بسایا۔ اس طرح یہ تعمیرات بھی ان ماحول کا حصہ بن گئیں۔ سائنس کی ترقیات نے جہاں زندگی کو سہولت بخش اور پرتعیش بنایا وہیں انسانی طمع نے اطراف کے ماحول کو متاثر کیا اور رفتہ رفتہ ہوا کی آلودگی کا یہ مسئلہ انسانی گرفت غذا کی آلودگی اور آواز سے پیدا ہونے والی آلودگی نے انسانی صحت و زندگی پر اپنے منفی اثرات مرتب کیے۔ شاعروں ادیبوں کو تب احساس ہوا کہ آلودگی کا یہ مسئلہ انسانی گرفت سے کہیں دور نکل چکا ہے۔ مختلف قسم کی آلودگیوں کی یوں تو مختلف وجوہات ہیں مگر عمومی طور پر انھیں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ آبادی کے اضافے، صنعت کاری اور شہر کاری کے عمل نے آلودگی کو جنم دیا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے جنگل صاف کیے گئے تاکہ نئی بستیاں اور نئی کالونیاں بسائی جاسکیں۔ گلستان اور چراگاہوں کو ختم کر کے کاشتکاری شروع کی گئی اور نئے کارخانوں کی بنیاد ڈالی گئی تاکہ بڑھتی آبادی کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔ نئے راستے، شاہراہیں بنانی پڑیں۔ آبادی کے پھیلاؤ کے سبب آمدورفت کے لیے سواریوں کی ضرورت پیش آئی جس سے ایندھن کی کھپت کے اضافے نے ہوا کی آلودگی کو مزید بڑھاوا دیا۔ اسی طرح نئے نئے اسکول، تعلیم گاہیں، اسپتال وغیرہ بھی بنانے پڑے۔ سائنسی انکشافات اور ایجادات کے غلط استعمال کی بدولت ان غیر ضروری چیزوں کو استعمال کرنے کا سماج عادی ہو گیا جن کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔ روزگار کی عدم دستیابی اور شہری سہولتوں کی غیر مساوی تقسیم نے دیہی آبادی کو للچایا چنانچہ بڑے شہروں میں ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس منتقلی نے شہری منصوبہ بندی کو متاثر کیا۔ جھگی جھونپڑیاں تقریباً ہر بڑے شہر کا حصہ بن گئیں جہاں نہ صرف مختلف بیماریوں، وباؤں کو

پھیلنے پھولنے کا موقعہ ملا بلکہ جرائم اور سماجی خرابیوں کو بھی ایک اچھی پناہ گاہ ہاتھ آئی۔ شہری سہولیات کے فقدان نے ان بستیوں (سلم) کے لوگوں کو تو متاثر کیا مگر آس پاس کے لوگ بھی اس کی زد میں آ گئے۔ اس کے نتیجے میں تنقید کا وہ مکتب فکر ابھر کر سامنے آیا جسے "ماحولیاتی تنقید" (Eco Criticism) کہا جاتا ہے اور جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ اس میں صرف ادب کا متنی تجزیہ نہیں ہوتا اور نہ ہی تاثراتی رسائی کے تحت ادب کا تجزیہ اور مطالعہ کیا جاتا ہے بلکہ معروض کے مظہرات کو اور اس کے علت و معمول کے رشتوں سے ادب کی معنویت میں معنیات تلاش کی جاتی ہے۔

اردو ادب میں ایکوفیمنزم Ecofeminism اب بھی اپنی ابتدائی شکل میں ہے۔ اس ضمن میں اردو میں اب تک حوالے کے لئے بھی کوئی کتاب دستیاب نہ ہو سکی۔ مگر پروفیسر مولا بخش (علیگڑھ مسلم یونیورسٹی)، کے چند مضامین ''ماحولیاتی تنقید: نیا تنقیدی مخاطبہ'' اور ''مرثیہ انیس اور ماحولیاتی تنقید'' کو دیکھ کر یہ کہنا بجا ہوگا کہ پروفیسر مولا بخش کے یہ مضامین ماحولیاتی تنقید (Eco Criticism) کے اردو ادب میں ابتدائی نقوش ہیں۔ ان کے یہ مضامین عصری تناظر میں ماحولیاتی تنقید کی اہمیت وافادیت کا احساس کراتے ہیں اور اسے نظریہ تنقید کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے ان کے اس اقتباس پر نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

''دراصل مغرب میں تنقیدی اور تخلیقی ادب دونوں جگہ ماحولیات وقت کی اہم ضرورت کی شکل میں اور ہندوستان میں تخلیقی ادب کی سطح پر (جن کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں اور آگے بھی مثالیں پیش کی جائیں گی) اس لیے سامنے آ رہی ہیں کیونکہ حد درجہ مصنوعی اور آسائشوں کی تلاش والی معاصر زندگی اور کرۂ ارض پر پھیلے قدرت کے مناظر مثلاً سمندر، ندی، پودے، پیڑ، کیڑے مکوڑوں اور جانوروں پر خطرات کے بادل اس لیے منڈلا رہے ہیں کہ دھرتی کے ہی ختم ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

''زمین مطلوبہ حرارت سے حد درجہ زیادہ گرم ہوگئی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ریگستانوں کی توسیع ہو رہی ہے۔ گرین ہاؤس گیس میں اضافہ

تشویش ناک حد تک ہوا ہے جسے ہماری دنیا گرم ہوتی جارہی ہے گرین ہاؤس کے موضوع پر میری تحقیق کے مطابق MARIO VARGAS LLOSA نے ناول "The Green House" ۱۹۶۵ میں شائع کیا تھا اس سے مصنف کا ماحولیات سے دلچسپی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔''

''پروفیسر خورشید کے اس مضمون کا موضوع ماحولیاتی تنقید نہیں ہے۔اس مضمون میں ان کی فکرمندی مابعد جدید غزل کے چند پہلوؤں کی نشان دہی ہی ہے۔لیکن انہوں نے مابعد جدید غزل کا اہم کوڈ 'شجر' کو قرار دیا ہے اور ہمعصر شعرا کی غزلوں میں مستعمل ان تراکیب کی طرف اشارے کئے ہیں جن کا تواتر کے ساتھ ہم عصر شعرا نے اپنی غزلوں میں استعمال کیا ہے۔مثلاً 'شہر فتنہ گر'، 'شہر زیاں'، 'زمین سفاک'، 'جزیرۂ بے آشنا'، 'کوفۂ نا مہرباں' وغیرہ۔ اتفاق ہے کہ ماحولیاتی نقاد کے نزدیک بھی شہر کی حیثیت دیہات کے مقابلے حد درجہ منفی ہوگئی ہے۔ماحولیاتی نقاد شہر کے برعکس دیہی جمالیات کی تحسین میں زیادہ دلچسپی لینے کا جواز پیش کرتے ہیں۔ مابعد جدید نقاد بھی گاؤں کو شہر کے مقابلے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔لہٰذا ماحولیاتی نقاد اور مابعد جدید نقادوں میں ممکنہ حد تک مماثلتیں محسوس کی جاسکتی ہیں۔پروفیسر خورشید شجر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ مابعد جدید شعرا کا اہم کوڈ ہے:

''ماحولیاتی تنقید: نیا تنقیدی مخاطبہ'' (مضمون) مولا بخش

ماحولیاتی ادب کی روشنی میں اس کے بعض بنیادی خصوصیات کی نشاندہی کرنا یا اس کا ایک خاکہ تیار کرنا آج دشوار نہیں ہے۔ادب کے مطالعے سے حاصل ان بنیادی نکات کو ہم بآسانی مندرجہ ذیل درجوں میں تقسیم کرسکتے ہیں

(۱) عورت اور ماحولیات کا تعلق
(۲) ثقافت کی طرف سے فطرت کے تسلط کی مخالفت، اور
(۳) غیر ترتیبی نیٹ ورک میں یقین

حقوق نسواں کے علم برداروں کے لیے مبینہ طور پر خواتین اور ماحول کا آپسی تعلق بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کا ماننا ہے کہ اس تعلق کے پس پردہ عورتوں کو دوسرے درجہ کی اہمیت دینے کی سازش پوشیدہ ہے۔ لہذا خواتین اور ماحول کے اس رشتے پر سوال کھڑا کر کے انھیں پدرسری غلبے سے آزاد کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ پدرسری غلبہ ہے جس کے تحت مشرق اور مغرب، ہر دو اطراف کے مذہبی مفکرین کا خیال ہے کہ مرد ازل سے صاحبِ فہم وفراست ہے اور عورت ناقص العقل۔ حقوقِ نسواں کی عالمی تحاریک کے زیر اثر ''برابری کا درجہ'' مل پائے گا یا نہیں، کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن ہمارا قدیم ماضی اور ماضی قریب کی مثالیں تو کم از کم اِس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہماری سوچ پدرسری غلبے (male chauvenism) سے آزاد نہیں ہے۔ تانیثی سوچ کو تانیثیت یا تحریک نسواں کا پدرسری لہر (masculinizing wave) کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد عورتوں میں مرد کی طرح بننے کا شعور اور صلاحیت پیدا کرانا ہے اور یہ ان کی نظر میں ذریعہ مساوات ہے۔

ماحولیاتی مادریت یا ایکوفیمینزم اس 'قرارداد' کے خلاف دلیل پیش کرتا ہے۔ اور مندرجہ ذیل سوالات اٹھاتا ہے کہ

☆ کیا ماحولیات یا فطرت سے علیحدگی خواتین کو مکمل طور پر انسانی درجہ دے سکتی ہے؟

☆ اور اگر تصور انسانیت کو خواتین کی غیر موجودگی اور فطرت کی مخالفت میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے تو پھر ایسی صورت میں ماحول یا فطرت کی کیا حیثیت رہتی ہے۔ ؟؟

☆ پدرسری مزاج کی پیش کردہ مردانہ غلبے، اور استحصال پر مبنی غیر انسانی

'قرارداد' میں جذب کرنا کیا عورتوں کے لیے ایک ترقی پسند ہوشمندانہ قدم کہلائے گا؟

ان سوالوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ایکوفیمینزم مردوں کی ثقافتی فکر کو قبول کرنے کی خاطر عورتوں اور ماحولیات کے درمیان اس اٹوٹ رشتے کو ردیا منقطع کرنے کی کسی بھی قرارداد کی مخالفت کرتا ہے۔ اور ماحولیاتی ثقافت اور تانیثی فکر کو ضم کر دینے کی کسی بھی کوشش کی تائید کرتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ماحولیات اور خواتین کے درمیان کوئی اٹوٹ رشتہ ہے؟

اس سوال کا ایک فکری پہلو لیوی اسٹراس (1969) کے اس خیال میں پایا جاتا ہے کہ ماحولیاتی اور ثقافتی تقسیم ایک عالمگیر فکری ساخت رکھتا ہے جس کی بنیاد عورتوں کی ماتحتی (subordination) ہے اور جو ماحولیات اور فطرت کی ماتحتی کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ گویا ماتحتی، اطاعت، انفیاد اور محکومیت ہماری ثقافتی فکر کا ایک اہم عنصر ہے نتیجتاً یہ ایسی ثقافتی فکر پیش کرتی ہے جو فطرت کی مخالفت پر قائم ہے۔ یہ ثقافتی فکر عورتوں کو فطرت سے منسلک کرتی ہے تاکہ عورتوں کو "انسانیت" کی درجہ بندی سے خارج کیا جا سکے۔ دو عنصری (جوڑیدار) درجہ بندی (binary classification) کی صورت میں عورتوں کو فطرت سے منسلک کرنے کی کوشش اسے 'غیر انسانی' قرار دینا ہے۔ درحقیقت ثقافتی اور ماحولیاتی فرق اور خواتین سے اس کا تعلق کی سوچ ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنی ہے۔

''ایکوفیمینزم بحیثیت ادبی تنقید''

''ایکوفیمینزم'' ادبی تنقید کی تاریخ فرانسیسی نقاد Frarnoise D'Eaubonne کی تحریروں سے شروع ہوتی ہے. ایک عام خیال ہے کہ 1974 میں فرانسیسی نقاد D'Eaubonne Frarnoise نے ہی ''ایکوفیمینزم'' یا ''ماحولیاتی مادریت'' کی اصطلاح وضع کی۔ اس کی ابتدا فطرت اور عورت پر پدرسری (patriarchal) جبر کے خلاف ایک احتجاجی آواز کی صورت میں ہوئی۔ ماحولیاتی

مسائل درحقیقت پدرسری patriarchal جبر کی صورت میں قدرتی وسائل کی تیزی سے استحصال کے نتائج ہیں۔ اور اس ماحولیاتی تباہی کی بنیادی وجہ ماحول سے ہماری غیر وابستگی ہے۔ 17ویں صدی کے سائنسی انقلاب نے بھی ماحولیاتی نظام کو نہ صرف درہم برہم کر دیا بلکہ مادر ارض کو ایک ایسے مشینی "استعارہ" میں تبدیل کر دیا جو مردوں کی غلبہ میں ہے۔ گویا Ecofeminist ادب کا مرکز استحصال اور تسلط کے گرد گھومتا ہے جہاں خواتین اور فطرت دونوں ہی modernity کے جبر کے شکار نظر آتے ہیں۔ Ecofeminism ایک ایسی سماجی تحریک ہے جو androcentrism اور ماحولیاتی تباہی کے درمیان روابط پر روشنی ڈالتی ہے۔ آج ماحولیاتی آلودگی اور دیگر ماحولیاتی مسائل پر قابو پانے کے لیے ایک ایسے سماجی فکر کی ضرورت ہے جو عموماً صرف خواتین میں نظر آتی ہے۔ اور اس کی وجہ فطرت کے ساتھ ان کی وابستگی ہے۔ ''ایکوفیمینزم'' کے اس نظریہ میں فلسفیانہ تکثیریت کی وجہ سے مرکزیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ جو اس نظریے کی متنوع مزاجی کی دلیل ہے۔ مگر پھر بھی اس کا فکری نظام اس استحصال اور تسلط کے گرد گھومتا ہے جہاں خواتین اور فطرت modernity کے جبر کے شکار ہیں۔ عورت اور فطرت کی اس یکسانیت کو ecofeminist نظریہ کا فلسفیانہ اساس سمجھا جاتا ہے۔ یہ نظریہ بذات خود حیات ہے۔ ایک طرز زندگی ہے، یہ مرد و زن کے درمیان محبت و تعاون کا احیا ہے، یہ ساتھ ملکر کام کرنے کا نام ہے۔ یہ شراکت داری ہے جو اس عہد پر استوار ہے کہ انسانیت اور خاص طور پر نسوانیت کا احترام ہو۔ گویا ecofeminist نظریہ خواتین کی جدوجہد اور تمدنی ارتقاء میں فطرت اور ماحول سے ان کو گہرے اور بامعنی رشتے کو تسلیم کیے جانے کا نام ہے۔

ایکوفیمینزم کے فکری اساس کو سمجھنے کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مغرب میں دو بڑے فکری حوالے ملتے ہیں۔ ایک کا فکری مرکز ماحولیات کے گرد گھومتا ہے تو دوسرے کا فلسفیانہ اساس سائنس و تکنالوجی کے قریب ہے۔ O'Riordan1981، کے پہلے فکری حوالے میں ''فطرت اور ماحولیات'' کو فوقیت حاصل ہے یہ نہ صرف بنی نوع انسان

کے لئے اس کی افادیت کا احترام ہے بلکہ ماحول اور اس سے متعلق مسائل پر ایک ہمہ جہتی نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ یہ فکری نظام انسان اور دیگر جان داروں (نباتات وحیوانات)، طبعی ماحول اور سماجی ماحول سے متعلق واضح ہدایات رکھتا ہے۔ انسان اور ماحول کے درمیان تعاملات کے سلسلے میں اس فکر کے تعلیمات جامع اور کافی ہیں۔۔ اس فکر کی حدیں بایوتھکس سے جڑتی ہیں کہ کائنات پر زندگی کا ایک مقصد ہے اور اس کی اس معنویت میں ہی زندگی پوشیدہ ہے۔

اس کے برعکس 'سائنس وتکنالوجی' کا فلسفہ حیات اقتصادی نطق اور ماحولیاتی مینجمنٹ پر انحصار کرتا ہے۔ اس کی ابتدا سترھویں صدی میں سائنسی انقلاب سے ہوتی ہے ,Merchant 1981:2 ان کا عقیدہ ہے کہ روز بروز موسم کی پیشین گوئی اور دور رس ماحولیات کی تبدیلی کے متعلق جانکاری دینے کے لئے سائنس وتکنالوجی کا استعمال سب سے کارگر طریقہ کار ہے۔ سائنس دانوں کے مطابق سائنس وتکنالوجی ماڈل سے وہ پیچیدہ اصول بآسانی حل ہوجاتے ہیں جو موسم یا موحولیات میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ سائنس وتکنالوجی کو کئی طرح سے آزمایا اور استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس سے ماضی قریب کے موسم اور ماحول کو فضا میں اس وقت اور نوعیت کی مناسبت سے دوبارہ 'پیدا' کیا جاسکتا ہے۔ اس ماڈل سے دور قدیم کے موسم اور ماحول کو بھی از سر نو پیدا کیا جاسکتا ہے جو بہت کم مقدار میں دستیاب ہیں۔ سائنس وتکنالوجی میڈل کی وجہ سے کائنات کے متعلق ہمارے علم اور سمجھ بوجھ میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ یہ بادلوں کی نقل وحرکت اور ان کی رفتار موسم کا تجزیہ کرنے میں مددگار ہوتا ہے ماحولیات اور موسم کا تجزیہ کرنے میں کئی پیچیدہ طور طریقوں سے گزرنا ہوتا ہے اور ان ماڈلز میں ان تمام چیزوں کو شامل کیا گیا ہے جن کی ضرورت ہے۔

بعض ماہرین ماحولیات کی نظر میں سائنسی انقلاب خواتین کے ساتھ ساتھ فطرت پر قابو پانے کی ایک کوشش ہے۔ مثال کے طور پر، سولہویں صدی تک یورپ میں

مشفق ماں کا استعارہ فرد، معاشرہ اور کائنات کو ایک پیکر میں ڈھال دیتا تھا۔ یعنی پوری کائنات ایک مشفق ماں کے طور پر دیکھی جاتی تھی۔ لیکن عالمی ماحولیاتی تبدیلیوں میں انسانی ہاتھ کی موجودگی اور نظریہ ارتقاء کے منکرین اس فکر کو سائنسی توجیہ کی روشنی میں ایک استعارہ قرار دے کر رد کر دیتے ہیں. موجودہ سائنسی تحقیق کے مطابق ماحولیاتی تبدیلیوں میں انسانی آلودگی کے اثرات اور نظریہ ارتقاء دونوں نظریات کے لئے واضح سائنسی شواہد موجود ہیں۔ اس انکار کی ایک وجہ یہ ہے کہ لفظ ''ماں'' کی سائنسی اصطلاح اور اس کی عام فہم معنویت میں شدید اختلاف ہے. ایک سائنسی نظریہ کسی مشاہدے کی ایک ایسی سائنسی توجیہ ہوتا ہے جس کو بار ہا کیے جانے والے تجربات سے جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے نیز اس کے درست ہونے کے واضح شواہد موجود ہوتے ہیں لیکن استعاراتی مفہوم ثقافتی اور تہذیبی وراثت سے متشکل ہوتا ہے، لیکن سائنسی فکر اسے کسی کی ذاتی رائے پر محمول کرے گی، ان کی نظر میں استعاراتی مفہوم کی اکثر و بیشتر کوئی تجرباتی اور مشاہداتی مثال موجود نہیں ہوتی، اور اسی بنا پر اسے خارج کیا جانا ہی بہتر ہے۔ نتیجتاً زمین بطور مشفق ماں" کا استعارہ سائنسی انقلاب کی منطقی سائنسی فکر اور مدلل نظریات کی روشنی میں آہستہ آہستہ آب و تاب کھوتا گیا۔ اور اس کی جگہ طوفان، سیلاب اور دیگر قدرتی آفات جیسی فطرت کی پرتشدد اور مضطرب شکل کو ڈائن کے طور پر پیش کیا گیا۔ بعض ماہرین کا ماننا ہے کہ یہ پدرسری سوچ کی دین ہے جہاں ہر بری چیز ''ڈائن'' ہے۔ وچ ہنگ Witch hunting آج اس سنسنی خیز موڑ پر آپہنچی ہے کہ خواتین کو ڈائن ہونے کے الزام میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کیلئے ڈائن یا 'وچ' نیا لفظ ہو جبکہ انگریزی کی ہر ڈکشنری میں اس کا مطلب جادوگرنی، جادو ٹونا کرنے والی، بدعقیدہ عورت، چڑیل یا ڈائن ہوتا ہے۔ ایسی عورتوں کی تلاش کو 'وچ ہنٹ' کہا جاتا ہے کیونکہ ہر بری چیز ''ڈائن'' ہے۔

دنیا کو تو کیا جانے یہ بس کی گانٹھ ہے حرافہ
صورت دیکھو ظالم کی تو کیسی بھولی بھالی ہے

شہد دِکھائے، زہر پلائے، قاتل، ڈائن، شوہر کش
اِس مُردار، پہ کیا للچانا دُنیا دیکھی بھالی ہے

(امام احمد رضا خان)

یوں تو جادوٹونے یا بدعقیدگی میں ملوث عورتوں کو اذیتیں یا سزائے موت دینے کا رجحان تین ہزار برس قبل حمورابی کے مجموعہ قوانین میں بھی ملتا ہے جبکہ فلسطین کے یہودی رباعی بھی بدعقیدہ اور جادوٹونا کرنے والی عورتوں کو سزائے موت دیتے تھے۔ لیکن 'وچ ہنٹنگ' کی وبائی صورت 1480 سے 1700 عیسوی کے عرصہ کے درمیان یوروپ میں ملتی ہے جب وہاں جاگیردارانہ اور مذہبی جنگیں زوروں پر تھیں۔ جنگجو سردار اور پروٹسٹنٹ اور کیتھولک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اس دوسو سالہ دور میں یوروپ بھر میں پادریوں نے 40 ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان عورتوں کو بدعقیدگی اور جادوٹونے کے الزام میں زندہ جلا کر یا اعضا کاٹ کر یا ڈبو کر ہلاک کرنے کے احکامات جاری کئے۔ بھرے گاؤں کے سامنے پادری عدالت لگاتا تھا، سزا سناتا تھا اور پھر ملزمہ پر پورا گاؤں تھوکتا ہوا، ناچتا کودتا، نعرے لگاتا مرکزی چوک میں لے جا کر صلیب سے باندھ کر جلا دیتا یا سنگسار کر دیتا یا ڈبو دیتا۔ وچ ہنٹنگ نے اس وقت سیاسی صورت اختیار کی جب 50 کی دہائی میں امریکہ کے اندر سینیٹر جوزف مکھارتھی کی قیادت میں بائیں بازو کے خیالات کی بیخ کنی شروع ہوئی۔ اور سیاست سے لے کر فلم انڈسٹری تک ہر شعبہ میں امریکہ دشمن سرگرمیوں میں ملوث افراد کی تلاش کا کام شروع ہوا۔ پھر 18 ویں صدی میں یوروپی حکومتوں نے روشن خیالی کی لہر کے زیر اثر 'وچ ہنٹنگ' کو قانوناً جرم قرار دینا شروع کیا جبکہ 19 ویں صدی کے وسط کے بعد سے یوروپ میں کسی عورت کو جادوٹونے یا بدعقیدگی کے الزام میں ہلاک نہیں کیا گیا۔

پدرسری سوچ کی ہوس گیری کا یہ عالم ہے کہ حکیم فصیح الدین رنج نے جب ایک سو چوہتر اردو شاعرات کا اوّلین تذکرہ ''بہارستانِ ناز'' (۱۸۶۴ء) میں قلم بند کیا تو اپنے زمانے کی معروف شاعرہ مُنی بائی حجاب کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''عمر میں ابھی انیسویں سال کی گرہ پڑی ہے۔ شاعری کے رستے
میں قدم تو رکھا ہے مگر سنبھل کر چلیں، یہ منزل کڑی ہے۔ پہلے ہم
گداختہ دلوں سے اپنا دل لگائیں۔ معشوقی کو بالائے طاق رکھیں،
عاشق بن جائیں۔ آج کل کی شاعرات سے اب بھی بہتر ہیں۔
مشتری اور زہرہ کی ہم سر ہیں۔ ذورذور کی سیر بھی کر چکی ہیں، پیمانہ
زندگی خوب بھر چکی ہیں، بس ایک ہم سے ہی ملاقات ہونا باقی ہے
یقین ہے کہ یہ آرزو بھر آئے گی، اگر سچی مشتاق ہے۔''

ادب میں خواتین کے ادب کی علاحدہ شناخت کا مطلب تھا ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا جس کا فقدان اس مندرجہ بالا اقتباس میں نظر آتا ہے۔ تانیثیت کے مخالفین کا کہنا تھا کہ ادب کو آخر مرد اور عورت کے خانے میں کیوں بانٹا جائے۔ لیکن عورتوں کی ایک بڑی تعداد علاحدہ شناخت کے حق میں تھی اور ہے۔

غرض یہ کہ پدرسری معاشرہ تھا اور ماضی قریب کا ہندوستانی سماج، رسوم ورواج کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور توہمات گلے کا ہار تھا۔ ایسے میں عورت حد درجہ مظلوم تھی اور مظلوم بھی اس قدر کہ روحانی اور جسمانی قیود کا شکار ہو کر ایک طرح کی مفلوج زندگی گزار رہی تھی۔ نتیجہ کے طور پر اُس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مرد کے مقابلے میں حد درجہ کم سمجھی جاتی تھی۔ ایسے پدرسری ماحول میں تخلیقی اظہار کیوں کر ممکن ہوتا۔

ان حقائق کی روشنی میں بعض ماہرین اسے سترھویں صدی کے سائنسی انقلاب سے پہلے کی ثقافتی فکر کا نتیجہ بتاتے ہیں جبکہ بعض کا خیال ہے کہ یہ سوچ animism کے خاتمے اور عیسائیت کے پھیلاؤ کا نتیجہ ہے کیونکہ عیسائیت دنیا کا سب سے زیادہ الوہی (anthropocentric) مذہب ہے۔ اس کی وضاحت لن وائٹ کے ایک مضمون میں ملتی ہے۔

1967 میں، لن وائٹ "(White Lynn) نے "ہمارے ماحولیاتی بحران کے تاریخی ماخذ" کے عنوان سے ایک سائنسی جریدے میں ایک مضمون شائع کیا. مضمون

فہرست

- حرف مدعا — نسترن احسن فتیحی — 07
- پیش لفظ — فرخ ندیم — 09

باب اوّل

- ایکوفیمینزم (ماحولیاتی تانیثیت) — 15

باب دوئم

- عصری تانیثی اردو افسانہ اور ایکوفیمینزم کا تصور — 119

باب سویم

- ماحولیات تانیثیت اور عصری تانیثی افسانے کا ایک تجزیاتی مطالعہ۔ — 279

حواشی — 302

فطرت کے ساتھ بنی نوع انسان کے تعلقات پر عیسائیت کے اثر ورسوخ کا تفصیلی جائزہ پیش کرتا ہے۔ وائٹ کا خیال ہے کہ ماحولیاتی بحران کی بنیادی وجہ مذہبی ہے بلکہ عیسائیت ہے۔ وائٹ صنعتی انقلاب کو ماحولیاتی تاریخ میں ایک اہم موڑ مانتا ہے، وائٹ کا خیال ہے کہ صنعتی انقلاب نے ماحولیات کو تباہ کرنے کی ہماری صلاحیت میں تیزی سے اضافہ کر دیا۔ تاہم، وائٹ کا ماننا ہے کہ ماحولیات کو تباہ کرنے اور زمین کو ''محکوم'' بنانے کی ہماری صلاحیت کی شروعات صنعتی انقلاب سے بہت پہلے Pagan animism پر قدیم عیسائیت کی فتح کے ساتھ ہوگئی تھی۔ اس کے اشارے بائبل کے اس حکم میں ملتے ہیں کہ زمین انسانی استعمال کے لئے ایک وسیلہ ہے اور انسان کو اسے محکوم بنانے کا اختیار ہے۔ کیونکہ قدیم عیسائیت کے مطابق انسان خدا کی صورت پر ڈھالا گیا ہے۔ اور اس لیے دوسرے تمام مخلوقات سے افضل ہے۔

وائٹ کے مضمون کے شائع ہونے کے پانچ سال بعد، 1972 میں آرنلڈ Toynbee کا مضمون ''موجودہ ماحولیاتی بحران کے مذہبی پس منظر'' شائع ہوا۔ وائٹ کی طرح، Toynbee نے بھی توحید monotheism کے فلسفہ حیات کو ماحولیاتی تباہی کا سبب مانا جو فطرت کی جانب قدیم pagan رویہ کے بالکل برعکس تھا۔ ان مضامین نے فطرت کے استحصال کے عیسائیت کے مذہبی عقیدے پر ایک طویل مکالمے کی ابتدا کی اور بہت سے لکھنے والوں نے اس جانب توجہ صرف کی اور عیسائیت اور دوسرے ابراہمی مذاہب کو anthropocentric مانا جبکہ ایشیائی مذہبی عقیدے eco-centric سمجھے گئے۔ بالفاظ دیگر ایشیائی مذاہب اور مشرکوں پر فطرت کی جانب قدیم pagan رویہ کا گہرا اثر ورسوخ دیکھا گیا۔ ایکوفیمینزم کی اصطلاح کی لسانی ساخت پر اگر غور کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ''ماحولیاتی مادریت'' یا ایکوفیمینزم کی اس اصطلاح میں ''ماحولیات'' اور ''مادریت'' یا تانیثیت'' دو کلیدی لفظ ہیں۔ ایکوفیمینزم پر کسی تفصیلی گفتگو کے لیے ضروری ہے کہ ماحولیات اور مادریت اور فیمینزم کے ان تصورات کو بخوبی سمجھا جائے

فیمینزم (Feminism)

1970 کی دہائی کے بعد، دنیا کی ادبی اور ثقافتی سیاست میں عورت نے علمی (academic) توجہ حاصل کی. اس کے باوجود کہ کسی نے اسے جنسی انارکی کا پیش روخیال کیا، اور کسی نے مارکیٹ اور جدید ثقافت کے ایجنٹ کے طور پر دیکھا۔ بہتوں کی نظر میں عورت بیسویں صدی کے سیاسی آزادی کی تحریکوں، کے استحکام کی علامت کے طور پر ابھر کر آئی۔ اور بعض کی نظر میں وہ موڈرنٹی کی علامت بن کر ابھری۔ مگر یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ان کے جذبات میں ہمیشہ خلوص، ایثار، مروت، محبت اور شگفتگی کا عنصر غالب رہتا ہے۔ ''ایکوفیمینزم'' نے انسانی وجود کی ایسی عرق ریزی اور عنبر فشانی کا سراغ لگایا جو کہ عطیۂ خداوندی ہے۔ اس وسیع وعریض کائنات میں تمام مظاہر فطرت کے عمیق مشاہدے سے یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ جس طرح فطرت ہر لمحہ لالے کی حنابندی میں مصروف عمل ہے اسی طرح خواتین بھی اپنے روز وشب کا دانہ دانہ شمار کرتے وقت بے لوث محبت کو شعار بناتی ہیں۔ خواتین تخلیق کاروں نے تخلیق ادب کے ساتھ جو بے تکلفی برتی ہے اس کی بدولت ادب میں زندگی کی حیات آفریں اقدار کو نمو ملی ہے۔ مغرب میں تانیثی جدوجہد کا آغاز اس وقت ہوا جب حقوقِ نسواں کے تحفظ کے لیے بعض عورتوں نے انفرادی طور پر آواز بلند کی۔ اس ضمن میں برطانیہ کی میری وول اسٹون کریفٹ (Mary Woll stone craft) کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے جس نے اٹھارویں صدی کے نصفِ دوم میں سماجی سطح پر عورتوں اور مردوں کے درمیان نابرابری (جینڈر تفریق) کے خلاف نہایت پرزور انداز میں آواز اٹھائی اور حقوقِ نسواں کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کا موقف تھا کہ عورتیں طبعاً مردوں سے ''کم تر'' (Inferior) نہیں ہوتیں، لیکن وہ کم تر اس لیے سمجھی جاتی ہیں کہ ان میں تعلیم کی کمی پائی جاتی ہے۔ میری وول اسٹون کریفٹ کا کہنا تھا کہ عورتوں اور مردوں دونوں کو Rational beings کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ نابرابری کے خاتمے کے

لیے وہ ایک ایسے سماجی نظم وضبط (Social order) کی ضرورت کو محسوس کرتی تھی جو Reason پر مبنی ہو۔ حقوقِ نسواں سے متعلق اس کی مشہور کتاب.....

A Vindication of the Rights of Woman تانیثیت پسندوں کو آج بھی دعوتِ فکر دیتی ہے۔ میری وول اسٹون کریفٹ کے بعد حقوقِ نسواں کے تحفظ کے لیے منظم طور پر جدوجہد کا آغاز ہوا جس نے مغرب میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس تحریک میں اولاً عورتیں ہی پیش پیش رہیں، لیکن بعد میں مرد بھی اس میں شامل ہو گئے۔

تانیثی تحریک کا بنیادی مقصد عورتوں کو مردوں کے مساوی سیاسی، سماجی، معاشی اور قانونی حقوق دلانا تھا اور ترقی کے میدان میں انھیں برابر کے مواقع فراہم کرنا تھا۔ تانیثیت، اپنے عام مفہوم میں، صرف عورتوں ہی کے مسائل کی ذمہ دار ہے اور جنس یا جینڈر کے تعلق سے نابرابری کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ جیسے جیسے تانیثی تحریک فروغ پاتی گئی، اس کے نظریاتی اور فلسفیانہ ڈسکورس میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ موضوعات، مواد، اسلوب، لہجہ اور پیرائے اظہار کی ندرت اور انفرادیت نے زندگی کی حیات آفریں اقدار کے ابلاغ کو یقینی بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ تانیثیت کا اس امر پر اصرار رہا ہے کہ جذبات، احساسات اور خیالات کا اظہار اس خلوص اور دردمندی سے کیا جائے کہ ان کے دل پر گزرنے والی ہر بات برمحل، فی الفور اور بلا واسطہ انداز میں پیش کر دی جائے۔ اس نوعیت کی لفظی مرقع نگاری کے نمونے سامنے آتے ہیں کہ قاری چشم تصور سے تمام حالات کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔

Feminism فرانسیسی لفظ ہے جو لیٹین کے لفظ Femind سے لیا گیا ہے اور ذرا سی تبدیلی سے دوسری زبانوں جیسے انگلش اور جرمن میں بھی ایک ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ Feminine عورت یا جنس مونث کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بطور اصطلاح Feminism اس طرز فکر یا اس تحریک کو کہا جاتا ہے جو سیاست و معیشت و معاشرتی جملہ تمام شعبوں میں عورتوں کی مردوں سے برابری کی دعویدار ہیں۔ خواتین کر حقوق کے دفاع اور مردوں کے ہمراہ ان کی برابری کے معنی میں کئی سو سال پرانی فکر

ہے، لیکن انیسویں صدی کے وسط سے اس معنی میں باقاعدہ استعمال ہونے لگا، اور اس طرز فکر کو نافذ کرنے کے لئے دھیرے دھیرے بہت سی تحریکوں نے سر اٹھایا اور اپنے مطالبات کی بازیابی کے لئے بہت سے طریقے اپنائے۔ تاریخی پس منظر میں فیمینزم کے تکاملی مرحلہ کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے:

پہلا مرحلہ : انیسویں صدی کی ابتدا سے پہلی جنگ عظیم کے بعد تک

دوسرا مرحلہ : ساٹھ کی دہائی کے بعد کا مرحلہ۔

بعض دوسرے مفکرین کا خیال ہے کہ مغرب میں تانیثیت کی تحریک نے اپنی ابتدا (انیسویں صدی) سے زمان حال تک تین ارتقائی مراحل طے کیے جنھیں ''لہروں'' (Waves) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اجتماعی طور پر تانیثیت کی لہر اٹھنے سے پہلے حقوقِ نسواں کی تمام تر جدوجہد انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس وقت تک 'تانیثیت' (Feminism) کی اصطلاح بھی رائج نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ان عورتوں نے، جنھوں نے حقوقِ نسواں کے تحفظ کے لیے آواز اٹھائی تھی، خود کو 'تانیثیت پسند' (Feminist) کہا تھا۔ یہ دونوں اصطلاحیں تانیثی ادب میں کافی بعد میں مستعمل ہوئیں۔

پہلی تانیثی لہر:

پہلی تانیثی لہر برطانیہ میں انیسویں صدی کے وسط میں ابھری جب لندن کی متوسط طبقے کی خواتین نے بار براباڈ یکون (Barbra Bodichon) اور بیسی ریز پارکس (Bessie Rayner Parkes) کی سربراہی میں سماجی اور قانونی نابرابری، اور بے انصافی کے خلاف منظم طور پر آواز اٹھائی اور متحد ہو کر حقوقِ نسواں کا پرچم بلند کیا۔ اسی وقت سے تانیثی جدوجہد نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ یہ اس تحریک کی ''پہلی لہر'' تھی۔ اس لہر کے دوران تانیثیت پسندوں نے جن اِشوز پر اپنی توجہ مرکوز کی ان میں عورتوں کی تعلیم، ان کے لیے روزگار کے مواقع اور شادی سے متعلق قوانین تھے۔ ان تینوں میدانوں میں انھیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ عورتوں کے

لیے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھل گئے، طب (Medicine) اور دوسرے پیشوں میں انھیں روزگار کے مواقع حاصل ہونے لگے، اور ۱۸۷۰ء کے جایدادقانون (MarriedWomen's Propoerty Act 1870) کی رو سے شادی شدہ عورتوں کو حقِ ملکیت بھی حاصل ہوگیا۔ تانیثیت کی یہ پہلی لہر پہلی عالمی جنگ تک جاری رہی۔

''دوسری تانیثی لہر''

تانیثی تحریک کی ''دوسری لہر'' نہ صرف برطانیہ، بلکہ دوسرے یورپی ممالک اور امریکہ تک پھیل گئی۔ بیسویں صدی کے دوران ان تمام ممالک میں عورتوں کے حقوق کی پاس داری کے لیے آواز اٹھائی گئی اور زبردست جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا۔ نسلی بنیادوں پر تفریق کے خلاف بھی جدوجہد جاری رہی۔ لسبین (Lesbian) اِشوز اور اسقاطِ حمل کے حق کو بھی حقوقِ نسواں کی تحریک میں شامل کرلیا گیا۔ بعض جنسی ونسائی مسائل پر عدم اتفاقِ رائے کی وجہ سے دوسری تانیثی لہر تنازعات کا شکار ہوکر 1990ء کے آس پاس ختم ہوگئی۔

''تانیثی تحریک کی ''تیسری لہر''

تانیثی تحریک کی ''تیسری لہر'' بیسویں صدی کے آخری دہے سے ذرا قبل نمودار ہوئی۔ اسے 'جدید تانیثیت' (Modern Feminism) بھی کہتے ہیں۔ یہ لہر دوسری تانیثی لہر کی ناکامی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کے تناظر میں معرضِ وجود میں آئی۔ اس تحریک سے نوجوان خواتین وابستہ ہوئیں جن کی عمریں ۳۰، ۳۵، یا ۴۰ سال سے زیادہ نہ تھیں۔ اس تحریک سے عورت کی ایک نئی شبیہ ابھر کر سامنے آئی۔ اب عورت ادعائیت کی حامل (Assertive) ہے، طاقت ور ہے اور اپنی جنسیت (Sexuality) پر اسے خود اختیار ہے۔ تیسری تانیثی لہر کے دوران اس بات کا بھی احساس پیدا ہوا کہ عورت کا تعلق مختلف رنگ، نسل، طبقے، قومیت، مذہب، اور تہذیبی وثقافتی بیک گراؤنڈ سے ہوسکتا ہے۔ یہ تحریک یا لہر عورت کی معاشی، سیاسی اور سماجی مختاریت

(Empowerment) کے ساتھ ساتھ اس کی انفرادی مختاریت پر بھی اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے۔ اس تحریک کے دوران عورت کا تشخص (Identity) واضح طور پر سامنے آ گیا ہے۔ اکثر عورتیں متضاد تشخصات کی حامل ہوتی ہیں۔ بعض خواتین کیریر وومَن، بیوی، اور نیک لڑکی کا کردار نبھاتی ہیں تو بعض ٹام بوائے، لسبین اور سیکس سمبل کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں۔ یہ تحریک عورت کو اپنا تشخص یا پہچان خود قائم کرنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تانیثی تھیوری درحقیقت ان فلسفوں سے نمو پذیر ہوتی ہے جو تانیثیت کے مختلف نظری ڈسکورس کے پسِ پردہ ہیں، جیسے کہ سوشلسٹ فلسفہ حیات جو 'سوشلسٹ تانیثیت' (جسے 'مارکسی تانیثیت' بھی کہتے ہیں) کی روح ہے۔ اس فلسفے کی رو سے عورتوں کو برابری کا درجہ صرف اسی وقت مل سکتا ہے جب سماج میں بہت بڑے پیمانے پر کوئی تبدیلی واقع ہو۔ سوشلسٹ تانیثیت پسندوں کا کہنا ہے کہ نابرابری سرمایہ دارانہ سماج (Capitalist Society) میں بری طرح جڑ پکڑ چکی ہے جہاں قوت (Power) اور سرمایے (Capital) کی تقسیم غیر مساویانہ ہے۔ صرف یہی کافی نہیں کہ عورتیں انفرادی طور پر جدوجہد کر کے سماج میں اعلیٰ مقام حاصل کریں، بلکہ سماج میں اجتماعی تبدیلی (Collective Change) کی اشد ضرورت ہے تاکہ عورت اور مرد دونوں کو برابری کا درجہ حاصل ہو سکے۔ سوشلسٹ تانیثیت اسی لیے پدری سماجی نظام (Patriarchy) کی بھی مخالف ہے کہ یہ مردانہ اقتدار و قوت کی علامت ہے۔ 'ریڈیکل تانیثیت' سوشلسٹ تانیثی تھیوری سے کافی حد تک متاثر ہے۔ تانیثی مفکرین جو ریڈیکل نظریات کے حامل ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کسی بڑی ڈرامائی سماجی تبدیلی کے بغیر عورتوں کو برابری کا درجہ نہیں مل سکتا، نیز عورتوں کی پستی (Oppression) کی بنیادی وجہ پدری نظام ہے جس میں اقتدار مرد کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور عورت مجبورِ محض تصور کی جاتی ہے۔ مرد کا عورت پر تفوق قوت (Power) کے بل بوتے پر ہے۔ اسی لیے وہ آئے دن مردوں کے ظلم و ستم کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ ریڈیکل تانیثیت پسندوں

کا سارا ارتکاز اس ظلم وستم پر ہے جو پدری نظام میں مرد عورت پر ڈھاتا ہے اور اپنے جابرانہ رویے سے اسے سماجی سطح پر زیر کر لیتا ہے اور پست (Oppressed) بنا دیتا ہے خواہ وہ امیر ہو یا غریب، گوری ہو یا کالی، تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ۔ اسی لیے ریڈیکل تانیثیت پدری نظام اور مردانہ اقتدار کے سخت خلاف ہے۔ سوشلسٹ تانیثی فکر کے 'لبرل تانیثیت' نابرابری کے خاتمے کے لیے اجتماعی سماجی تبدیلی کے بجائے انفرادی کوشش وعمل (Individualistic actions) کو ضروری قرار دیتی ہے۔ اس فلسفے کی رو سے عورتیں انفرادی طور پر کام اور جدوجہد کر کے سماج میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکتی ہیں۔ اس حقیقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بہت سے مغربی ملکوں میں عورتیں آج ان عہدوں پر فائز ہیں جو پہلے مردوں کی دسترس میں تھے۔ ہر چند کہ لبرل تانیثیت سیاسی و قانونی اصلاحات کے ذریعے مرد وزن میں برابری کی خواہاں ہے، تاہم اس کا ارتکاز عورتوں کی اپنی صلاحیتوں اور کوششوں پر ہے جنھیں بروئے عمل لا کر وہ سماج میں برابری کا درجہ حاصل کر سکتی ہیں۔

بعض یورپی ممالک (بالخصوص برطانیہ اور فرانس) نے جب تیسری دنیا کے ملکوں پر اپنا تسلط قائم کیا تو یہ ممالک ان کی کالونیاں (نوآبادبستیاں) بن کر رہ گئے جس کی وجہ سے وہاں کی سیاسی اور معاشی صورتِ حال بالکل بدل گئی اور تانیثیت کی ایک نئی شکل ابھر کر سامنے آئی جسے 'مابعد نوآبادیاتی تانیثیت' کا نام دیا گیا۔ اسے تیسری دنیا کی تانیثیت یا تھرڈ ورلڈ تانیثیت بھی کہا گیا جس کے مفکرین کا خیال ہے کہ مغربی نوآبادکاروں نے تھرڈ ورلڈ ممالک کو سماجی ومعاشی پستی کے غار میں دھکیل دیا ہے جس کی وجہ سے مابعد نوآبادیاتی معاشرے (Post colonial-society) میں عورت کی حیثیت کم تر اور پست ہو کر رہ گئی ہے۔ مابعد نوآبادیاتی تانیثیت پسندوں نے مغربی نوآبادکاروں کی اندھی تقلید اور ان کی تہذیب اور طرزِ بود و باش کی بے جا نقالی اور تھرڈ ورلڈ ممالک کی عورتوں میں بڑھتی ہوئی مغربیت اور ماڈرنائزیشن کے مغربی معیارات پر بھی انگلی اٹھائی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عورتوں کا معیارِ زندگی محض مغربی تہذیب کی نقالی کر کے بلند نہیں کیا

جاسکتا، بلکہ اسے اپنے اپنے ممالک کی سماجی، ثقافتی اور تہذیبی قدروں سے ہم آہنگ کر کے بھی اونچا اٹھایا جاسکتا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیمینزم خواتین کی حق طلب تحریک کا نام ہے جو امریکا سے شروع ہوئی یعنی خواتین نے جنسیت کی بنا پر اس زمانہ میں رائج امتیازی برتاؤ کے خلاف اپنا حق کو حاصل کرنے کے لئے ایک تحریک کا آغاز کیا جو ایک خاص معاشرتی نظریات مطابق تھا۔

Feminism خواتین کی مردوں پر برتری کا قائل نہیں، اسی طرح جیسے نسلی و مذہبی برابری سے مراد صرف برابری ہے، برتری نہیں۔اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے، کہ جو لوگ لفظ feminism کی مخالفت کرتے ہیں، ان سے اگر بات کی جائے تو وہ feminism کے تمام مقاصد کی حمایت کرتے نظر آئیں گے۔تو پھر آخر اس لفظ سے کیا دشمنی ہے۔اگر حق کی آواز ایک لڑکی اٹھائے، تو اسے باغی، ضدی، سرکش وغیرہ کہا جاتا ہے۔کیوں خواتین کو غلط کردار کی حامل، اور معاشرے کے تاریک حصوں سے تعلق رکھنے والا کہا جاتا ہے؟

جنسی ناانصافی صرف تیسرے ممالک کا مسئلہ نہیں ہے۔امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں بھی خواتین مردوں جتنی تنخواہیں حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ جنسی ناانصافی اب بھی ترقی پذیر ممالک میں عام ہے۔اس کے باوجود ترقی پذیر ممالک نے تو اپنی پہلی خاتون وزیراعظم دیکھ لی ہے، لیکن امریکہ جیسے ملک کو ابھی بھی اپنی پہلی خاتون صدر کا استقبال کرنا باقی ہے۔خواتین پر جنسی تشدد اور ریپ امریکہ کے تعلیمی اداروں میں عام ہے۔امریکہ میں ہر پانچ میں سے ایک خاتون جنسی تشدد کا شکار ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔شیرل سینڈبرگ اپنی کتاب ''ویمین ورک اینڈ دی ول ٹو لیڈ'': "Women, Work, and the Will to Lead" میں امریکہ میں رہنے والی ایک خاتون کی حیثیت سے اپنے مرد کولیگز کے برابر آنے کی اپنی روزانہ کی جدوجہد کی کہانی سناتی ہیں۔جنسی ناانصافی کے یہی واقعات ہیں، جنہوں نے دنیا بھر میں feminists کو جدوجہد کرنے پر مجبور کیا ہے، تاکہ نئی روایات قائم کی جاسکیں، اور کلچر اور

ذہنیتیں تبدیل کی جاسکیں۔ یہ مسئلہ جتنا عالمی اہمیت کا حامل ہے، اتنی ہی فوری توجہ بھی چاہتا ہے۔ جیسا کہ ایما واٹسن کہتی ہیں، ''اگر میں نہیں تو کون؟ اگر اب نہیں تو کب''۔ ''عورتوں پر ظلم وستم اور جبر واستبداد کی روایت بہت پرانی ہے''۔ ''عورت نے پہلی بار بغاوت کب کی۔ اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ تاہم Ellenkey کہتی ہے کہ نسائی تحریک کی شروعات وہاں سے ہوئی جب پہلے پہل حوا نے شجر ممنوعہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔۔۔ غرض عورت کا اپنے مجوزہ حدود سے تجاوز کرنا ہی نسائی تحریک کی ابتدا تھی'' ظلم وستم کی روایت تو بلاشبہ بہت پرانی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی ابتدا کا سرا شجرِ ممنوعہ کی طرف ہاتھ بڑھانے سے جوڑنا شاید مناسب نہیں۔ ایلن کی Ellenkey یہاں چوک گئی ہیں۔ جبر واستبداد کے خلاف بغاوت ہوتی تو سر آنکھوں پر۔ لیکن شجرِ ممنوعہ والی بغاوت سے پہلے تو کسی ظلم وستم کے شواہد نہیں ملتے۔ نہ کسی مذہبی روایت میں نہ کسی غیر مذہبی روایت میں۔ اس لیے اگر یہ بغاوت تھی تو کسی ظلم وستم کے بغیر ہی برپا کر دی گئی تھی۔ وگرنہ یہ کوئی بغاوت نہیں تھی بلکہ آدم وحوا کا مشترکہ طور پر شعور وآگہی کا پھل چکھنے کا عمل تھا۔ نسلِ انسانی کے پھلنے پھولنے کی راہ نکالنے کی طرف دونوں کا مشترکہ پہلا قدم تھا۔ Heath Stephen نے لکھا ہے کہ: ''مرد چاہے کتنی ایمانداری سے اس تحریک میں شامل ہوں، ان کی نیت پر شبہ برقرار رہے گا۔'' ایک طرف تو یہ کہا گیا کہ تانیثیت کے حوالے سے کام کرنے والے مرد بھی تانیثی تحریک کا حصہ ہیں۔ اور دوسری طرف ان کے حوالے سے شک کی اتنی بڑی دیوار کھڑی کر دی گئی۔ اس سے اس تحریک کی کچھ کمزوریوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۷۰ء سے ۸۰ کی دہائیوں میں فمینزم میں بہت سے رجحانات پیدا ہوئے، شدّت پسند سے لیکر اعتدال پسند رجحانات بھی سامنے آئے۔ نتیجہ میں فیمینزم کے سلسلہ میں بہت سے نظریات اور رجحانات پیدا ہو گئے۔ لیکن سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ عورتوں کے حقوق پامال ہوئے ہیں اور مناسب طریقوں۔ سے اس امتیازی برتاؤ اور حقوق کی پامالی کو روکنا چاہئے۔ البتہ کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جن میں اختلاف نظر پایا

جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ الگ الگ رجحانات میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ان تھیوریز کے نام یہ ہیں۔

حریت پسند تانیثیت (LiberalFeminism)،

مارکسی تانیثیت (Marxist Feminism)،

انتہا پسند تانیثیت (FeminismRadical)،

تحلیل نفسی تانیثیت (PsychoanalyticFeminism-)،

سماجی تانیثیت (Social Feminism)،

وجودی تانیثیت (FeminismExistentialist)،

مابعد جدید تانیثیت (Post ModernFeminism)۔اور

ایکوفیمینزم (Eco Feminism)۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مختلف عہد میں تانیثیت سے متعلق مختلف تھیوریاں وضع کی گئی ہیں۔ چند لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ تانیثیت کی کوئی ایک تھیوری نہیں ہو سکتی۔ پدری سماج میں عورتوں پر جبر و استبداد کی مختلف وجہیں تھیں۔ تمام حالات و واقعات کے پیش نظر تانیثیت کو اپنے اپنے طور پر سمجھنے کی کوششیں ہوئیں'' حریت پسند تانیثیت والے عورت کے حقوق مرد کے مساوی کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ مارکسی تانیثیت نے سماجی ناہمواری کے تناظر میں اشرافیہ کی عورتوں کے مسائل کے مقابلہ میں عام خواتین کے مسائل کو مختلف قرار دیا اور انہیں کے حق میں آواز بلند کی۔ انتہا پسند تانیثیت والے اپنے نام کی مناسبت سے یہ سمجھتے ہیں کہ ''عورتوں پر ظلم و ستم کی روایت اتنی پرانی ہے کہ اسے سماج سے طبقاتی فرق مٹا کر بھی ختم نہیں کیا جا سکتا''۔ یہ سارے حقوق مل جانے کے بعد بھی مزید کا نعرہ ہے۔ گویا ایک استحصالی طبقے کے خاتمے کے بعد دوسرے استحصالی طبقے کو جنم دینا مقصود ہے۔ تحلیل نفسی تانیثیت میں نام کے عین مطابق فرائڈ کے جنسی اور نفسیاتی حوالوں کو بنیاد بنایا گیا۔ سماجی تانیثیت نے پہلی چاروں تھیوریز پر غور و فکر کرتے ہوئے ان کی بعض باتوں سے اختلاف اور بعض سے اتفاق کرتے ہوئے کسی حد

حرف مدعا

ورجینیا وولف نے ادب میں مردانہ اور نسوانی فکر کی تفریق کو بے معنی قرار دیا ہے ان کا خیال ہے کہ ذہن یا احساس کی سطح پر مرد اور عورت کے مابین کسی بھی تفریق کا تعلق شعور، لاشعور اور تخیل سے ہے نہ کہ جینیاتی تفریق سے۔ پھر بھی مروجہ تصور کے مطابق نسائی احساس مردانہ احساس سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایک عورت کا ذہن شعوری طور پر زیادہ متحرک ہے اور فطرت کے حقائق سے روبرو ہونے کی قوت رکھتا ہے تو اُس کا مطلب ہے کہ اس کے ذہن میں مادریت کا پہلو زیادہ کارگر ہے اس کے ذہن کا Femaleness زیادہ فعال ہے۔ اور دیکھا جائے تو اس تفریق کو بعض ارباب دانش نے بھی قبول کیا ہے۔

اس مروجہ تصور کے مطابق نسائی احساس کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جہاں عورت کالی کے روپ میں نظر آتی ہے تو دوسری جانب مادریت سے بھرپور اناپورنا کا روپ ہے۔ یہ سوچ کی وہی سطح ہے جو ''ایکوفیمینزم'' کی صورت میں نقطۂ تکمیل پاتی ہے اور عورت اور فطرت کو درجِ کمال تک پہنچنے پر یقین رکھتی ہے۔ یہ وہ سطح ہے جو بعض فیمنزم کی علمبردار خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں نظر آتی ہے جو مرد کو عورت کی ضد کے طور پر دیکھتی ہے۔ ان تخلیقات کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں اس قدر فطرت ہے اور فطرت سے اتنی وابستگی کہ ان تخلیقات پر ورڈس ورتھ کی شاعری کا گماں گزرتا ہے۔ فطرت کی طرف مراجعت اور ذہنی و فکری اعتکاف کا منظر ان افسانوں میں نمایاں ہے۔ ان

تک امتزاجی رویے کو اہمیت دی۔ وجودی تانیثیت میں وجودی فلسفے کی بنیاد پر عورت کی شخصی آزادی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔ وجودی تانیثیت کی تھیوری سیمون دی بوار (Simon de Beauvoir) کی عطا کردہ سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے ژاں پال سارتر کے ساتھ دوست بن کر ساری زندگی گزاری تھی۔ مابعد جدیدیت والے تانیثیت کے تعلق سے اتنے ہی الجھے ہوئے ہیں جتنا مابعد جدیدیت کا تصور الجھا ہوا ہے۔ ان کے ہاں تانیثیت کی کوئی بنیادی بات کرنے کے بجائے اپنی مخصوص لسانی فلسفے کی اصطلاحوں کے ساتھ اسے جوڑنے کی کاوش دکھائی دیتی ہے۔ فیمینزم جو کہ ایک معاشرتی تحریک تھی اس نے چند دھائی کی سرگرمیوں میں اپنے نظریات کو اتنا مستحکم کرلیا کہ دیگر یونیورسیٹیوں میں باقاعدہ womens' studies کے نام پر شعبہ جات قائم کئے گئے جس کے نتیجے میں دنیا بھر میں خواتین کے مسائل کے ماہرین سامنے آگئے ہیں۔ اس اہم نکتہ کی طرف متوجہ کرنا ضروری ہے کہ مغربی فیمینزم ایک خاص ماحول میں خاص اسباب کی بنا پر ایک ثقافتی، سماجی تحریک بن کے ابھرا ہے، لہذا اس کے نظریات اور دلائل پر باقاعدہ غور کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ فیمینزم اپنی پہلی تقسیم بندی میں نظریاتی اور عملی بنیاد پر قابل تقلید نظر آتی ہے۔ نظریاتی بنیاد پر ایک نظریہ کی صورت میں یا آئیڈلوجی کے قالب میں یا اسی کے مانند دوسری روشوں کے اعتبار سے پیش کی جاتی ہے اور عملی پہلو کی نظر سے ایک اجتماعی حادثہ کی صورت میں بیان کی جاتی ہے اور یہ دونوں پہلو اپنے درمیان تفاوتوں کے باوجود ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، اجتماعی حادثات کے حوالے سے فیمینزم کا رشتہ تاریخی عوامل اور اقتصادی ڈھانچے منجملہ شناخت ومعرفت سے مربوط ہے جس نے معاشرے کی شناخت میں اپنی الگ پہچان بنائی ہے اور نظریاتی حوالے سے اجتماعی زینہ سے متاثر ہونے کے علاوہ اپنے سے مربوط فلسفی بنیادوں اور معرفتی ڈھانچوں سے بھی فائدہ اٹھاتی ہے۔ فیمینزم، تاریخی لحاظ سے کئی ادوار پر مشتمل ہے اور ہر ایک دور میں ایک طرح کی نظریاتی اور عملی خصوصیات سے مختص رہی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں سب سے زیادہ موثر عوامل خصوصاً اس کے نظریاتی پہلو سے مربوط، معرفت شناختی اور فلسفی مبانی

ہیں، اس وضاحت کے ساتھ بہت سے فلسفی اور معرفت شناختی حادثات نے فیمینیزم میں جدید فکری تحریک کو جنم دیا ہے اور یہ تحریک اپنی نوبت میں فیمینیزم کے معاشرتی نتائج میں اثر انداز ہوئی ہے، اس تاثیر کا واضح نمونہ فیمینیزم کی تیسری موج میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے، فیمینیزم نے تیسری موج کے اعتبار سے ایک ماڈرن نظریہ کے قالب میں ایک فلسفی روپ اختیار کرلیا ہے اور اپنی مدعیات کے دامن کو وسیع کردیا ہے اور یہ امر سب سے زیادہ معرفت شناختی کے تغیر وتبدل میں ریشہ دوان ہے، جب تک علم کا پوزیوٹسٹی نظریہ ماڈرن معاشر کے اوپر حاکم رہا فیمینیزم نظریہ اپنے دامن کو علم کے قلمرو میں داخل نہ کرسکا، پوزیوٹسٹی کی نظر میں علم کی معرفت کا حلقہ ایک ایسا حلقہ ہے کہ جو اپنے اندرونی ڈھانچے میں دوسرے معرفتی مراکز سے مستقل شمار ہوتا ہے، ایک عالم اس حلقہ میں داخل ہوتے وقت اپنے تمام ثقافتی تعلقات کو ایک طرف رکھ دیتا ہے، اس نظریہ کے مطابق علم حاصل کرنے کا مرکز ایک آزمائش گاہ (لیبارٹی) کی مانند ہے کہ جس میں وہیں سے مخصوص لباس درکار ہوتا ہے، ایک محقق اس کی حدود میں داخل ہوتے وقت اپنے مخصوص لباس منجملہ جنسیت کے لباس کو اتار دیتا ہے اور آزمائش گاہ کے مخصوص لباس کو جو کہ عالموں سے مخصوص ہے زیب تن کرلیتا ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ادھر جو گفتگو یا مباحث شروع ہوئے اس نے علمی معرفت کے متعلق مذکورہ نظریہ کو عملی بنا دیا ہے، اس نظریہ نے فیمینیزم نظریہ کے حامیوں کو یہ موقع فراہم کردیا کہ وہ جنسیت کو بنیاد بنا کر علمی معرفت میں ساجھے داری کا اعلان کرسکیں اور اس طرح وہ علمی مراکز کے جانبی مباحث سے آگے بڑھ کر علم کے اندرونی ڈھانچے میں داخل ہوگئے۔ بلاشبہ فیمینیزم ایسا ریڈیکل ماڈرن نظریہ ہے کہ جو معرفت شناختی کے بنا استفادہ کئے بغیر اپنے وجود کو منوا سکتا ہے۔

ماحولیات:

ایکوفیمینزم میں ماحولیات ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ کائنات میں ہمارے

سیارے کو ایک منفرد مقام حاصل ہے کہ صرف اسی پر زندگی اپنی گوناگوں صفات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ خلا سے کرہ ارض کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ دنیا بڑی حسین نظر آتی ہے کروڑوں سال پہلے جب زندگی نے اس سرزمین پر پہلی انگڑائی لی تھی تو یہ ایسی نہ تھی وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ہمہ انواع واقسام کے جانور اور پودے جنم لیتے گئے اور اس کے حسن میں اضافہ کرتے گئے اس وقت فطرت کی گود میں پلنے والا انسان بڑا معصوم اور قطعی بے ضرر تھا۔ فطرت سے اس کا گہرا اور قریبی رشتہ تھا۔ قدرت کی عطا کردہ نعمتوں کو وہ بیش بہا عطیہ جان کر استعمال ضرور کرتا تھا مگر اس کے استحصال اور اس نظام میں مداخلت کا خیال کبھی نہیں آیا کہ وہ ماحول کا ایک لازمی عنصر بن کر زندگی گذارتا تھا۔ گھنے جنگل، اونچے اونچے پہاڑ، سرسبز مرغزار، اٹھلاتی بل کھاتی ندیاں، گنگناتے ہوئے جھرنے، شور مچاتے ہوئے آبشار قسم ہا قسم کے چرند و درند، خوبصورت رنگوں اور دلنشین آوازوں والے پرند، سرسبز و شاداب درخت، رنگ برنگے پھول اس کے دن بھر کی جسمانی تھکن اور ذہنی کلفتوں کو دور کرنے کا بڑا ذریعہ تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وسیع و عریض دنیا کو قدرت نے ان نعائم کے بخشنے میں ذرا زیادہ ہی فیاضی سے کام لیا ہے۔ ابتدا میں انسان نے قدرت کے خزانے سے خوب مادی اور روحانی فائدہ اٹھایا۔ زمانہ قدیم میں جنگلات سیر و تفریح اور روحانی تر و تازگی اور تسکین کا ذریعہ تھے۔ گہرے گھنے اور خاموش جنگلوں میں انسانوں کو روحانی روشنی اور من کی شانتی ملتی تھی، رشیوں منیوں اور گیانیوں نے آبادی سے دور، خاموش فضاؤں میں پناہ لے کر عرفان الٰہی حاصل کیا اور عبادت و ریاضت میں اپنی عمریں گذار دیں۔ ہمارے قدیم فکر و خیال، فلسفہ اور تہذیب و تمدن کے ارتقا و عروج میں جنگل کی پُرسکون فضا کا بڑا ہاتھ ہے غالباً اسی لیے درختوں کا اگانا، سینچنا اور ان کی پرورش و پرستش کرنا متبرک مانا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ جس نے مذہب کی شکل اختیار کر لی اور اس طرح شجر کاری قدیم قبائلی تہذیب کا حصہ بن گئی۔ زمانۂ قدیم کے لوگوں نے قدرتی ماحول سے خوشگوار رابطہ قائم کر رکھا تھا وہ قدرتی توازن کو بگاڑے بغیر پوری طرح اس سے مستفیض ہوتے تھے مگر وقت کے گذرنے کے

ساتھ ساتھ انسان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ وہ خود کو دھیرے دھیرے ان نعمتوں کے سیاہ وسفید کا مالک سمجھنے لگا اور اس دولت کو بے دریغ خرچ کرنا اور برباد کرنا شروع کیا۔ تہذیب وتمدن کے پروان چڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی رخنہ اندازی میں بھی اضافہ ہوا۔ پھر جدید سائنس وٹکنالوجی کی ترقی اسے ایک دوسرے تباہ کن موڑ پر لے گئی۔ انگریز جب ہندوستان آئے تو شکار کی بہتات دیکھ کر گویا پاگل سے ہو گئے چنانچہ اپنے اس شوق کو خوب پورا کیا۔ ادھر عالمی جنگوں کے چھڑ جانے سے انسانوں کو جنگلات اور جنگلی جانوروں سے زیادہ سابقہ پڑا اور ان کی ہوس، جھوٹے وقار، شکار کے شوق اور معاشی خوشحالی کی لگن نے ان کا جانی دشمن بنا دیا۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو رہائش گاہیں اور غذا مہیا کرنے اور مختلف اشیائے زندگی کی تیاری کے لیے انسانوں نے جنگلوں کو صاف کرنا شروع کیا۔ یہ جنگل جو بارش برسانے، زمین کی تخریب کاری کو روکنے، آکسیجن کی مقدار کو متعین کرنے، فضا کو صاف رکھنے اور فضائی توازن کو برقرار رکھنے کے ذمہ دار تھے دھیرے دھیرے غائب ہونا شروع ہوئے۔ جنگلی جانوروں کے مسکن تباہ ہوئے اور یہ جانور فرار ہونے پر مجبور ہوئے اس طرح دھیرے دھیرے ان کی نسلیں معدوم ہونے لگیں۔ ماضی میں جن کے ریوڑ کے ریوڑ فطری ماحول میں قلانچیں بھرتے نظر آتے تھے آج پوری دنیا سے ایسے جانوروں کی نسلیں ناپید ہونے کے قریب ہیں، ختم ہو جانے کے خطرے سے دوچار جانوروں میں شیر، شیر ببر، چیتا، گینڈا، بارہ سنگھا، تغدار، پہاڑی کوئل، لالہ تیتر اور جانوروں (بشمول پرندوں کے) اور بے شمار قسموں کے نام لیے جا سکتے ہیں علاوہ ازیں بعض آرائشی اور ادویاتی اہمیت کے حامل پودے بھی اس دنیا سے مٹ جانے کے قریب ہیں اور اگر یہی حال رہا تو ہماری آنے والی نسلوں کو ان کے بارے میں جاننے کے لیے کتابوں کا سہارا لینا پڑے گا جس طرح آج میمتھ، ڈائنا سور وغیرہ کی معلومات کے لیے ہمیں عجائب گھروں اور کتابوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

جنگلات کے خاتمہ سے ایک طرف قدرتی توازن برقرار نہ رہ سکا جس سے موسم متاثر ہوئے جس کا لامحالہ اثر خود انسان کی زندگی پر پڑا۔ فضا جو کہ بڑی حد تک پاک

صاف ہوا کرتی تھی وہ آلودہ ہوئی۔ گنجان بستیوں سے گندے پانی اور انسانی فضلہ کے اخراج، گھڑ گھڑاتی مشینوں، دھواں اگلتی چمنیوں اور حمل ونقل کے ذرائع نے روز افزوں ترقی نے ہوا اور پانی کو آلودہ کیا۔ انسانی اور صنعتی فضلات کو ٹھکانے لگانے کے لئے انسان کو دریا اور سمندر کے علاوہ دوسرا ٹھکانہ نظر نہیں آیا۔ پانی کی آلودگی نے مچھلیوں سمیت بہت سے آبی جانوروں کی نسل کو خطرہ سے قریب کیا ہوا اور پانی کی آلودگی کا اثر پرندوں پر بھی پڑا۔ اور اس طرح قدرت میں موجود قدرتی غذائی زنجیر متاثر ہوئی۔

برسوں تک جنگلاتی دولت کی لوٹ کھسوٹ کے بعد انسانوں کو اس کا احساس اس وقت ہوا جب کہ خود اس کی زندگی اس کی معیشت متاثر ہوئی۔ موسموں کی باقاعدگی متاثر ہوئی۔ خشک سالی، قحط سالی اور سیلاب عالمی مسئلے بن گئے اور ساری دنیا میں ہاہا کار مچ گیا۔ اقوام عالم، ان کی انجمن، (UNO) اس کے مختلف اداروں، ایجنسیوں اور مختلف ممالک کی تنظیموں نے جنگل، جنگلی جانوروں اور ماحول کی بحالی کی طرف توجہ دی۔ جس کے نتیجے میں دنیا بھر میں پانچ جون کو ماحولیات کا عالمی دن منایا جاتا ہے، جس کا مقصد عوام میں ماحول کی بہتری اور آلودگی کے خاتمہ سے متعلق شعور وآگاہی پیدا کرنا ہے۔ 5 جون کو اقوام متحدہ کے زیر اہتمام 1974 سے ہر سال یہ دن ماحولیاتی مسائل پر قابو پانے کے عزم کے ساتھ منایا جاتا ہے اور دنیا کے بیشتر ممالک میں ماحولیات کے عالمی دن کی مناسبت سے، ریلیاں، سیمنارز اور دیگر تقاریب کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ماہرین کے مطابق گرین ہاؤسز گیسوں کے اخراج کی وجہ سے درجہ حرارت میں بتدریج اضافے اور موسمیاتی تبدیلیوں سے زراعت کا نظام بری طرح متاثر ہوا ہے، جس سے خوراک کی طلب پوری نہ ہونے اور بڑھتی ہوئی مہنگائی سے بالخصوص غریب ممالک کے عوام کی مشکلات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ماہرین کے مطابق پوری دنیا کو اس وقت ماحولیاتی آلودگی کا سامنا ہے اور عالمی حدت میں روز بروز خطرناک حد تک اضافہ ہوتا جا رہا ہے، جس سے لوگوں میں مہلک وبائی امراض پیدا ہو رہے ہیں۔ اس مسئلہ پر قابو پانے کے لیے ماحولیاتی تنظیمیں برسر پیکار ہیں، جبکہ سائنسدان بھی اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا

کررہے ہیں۔ ماحولیات اور جنگلات کی اہمیت اب ماہرین ماحولیات پر ہی نہیں عام انسانوں پر بھی آشکار ہو چکی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صرف بنی نوع آدم ہی نہیں خدا کی ساری مخلوقات کا اور سارے جانوروں کی بقا کا انحصار پودوں پر ہے۔ جانوروں میں قوت مطابقت پائی جاتی ہے جس کی بدولت یہ موسم اور ماحول کے خلاف اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں تا کہ اپنی نسل کا تحفظ کر سکیں یہ مطابقت ہزاروں برسوں کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے مگر ان کے برعکس انسان اپنے نمو یافتہ دماغ اور ذہنی صلاحیتوں کی مدد سے ماحول کے خلاف موثر جنگ لڑ سکتا ہے اور اپنے لیے مصنوعی ماحول ترتیب دے سکتا ہے۔ یہ سہولت جانوروں کو حاصل نہیں لہٰذا انسان پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یوں بھی بہ حیثیت اشرف المخلوقات اور اس کائنات میں اعلیٰ و ارفع مقام پر متمکن ہونے کے باعث اس پر اپنے سے کمزور اور کم درجہ کی مخلوقات کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مختلف مذاہب میں بھی پودوں اور جانوروں سے پیار پر زور دیا گیا ہے۔

یہ بات خوب ذہن نشین رہے کہ ہر جانور اور پودا اپنے ماحول کا ایک اہم جز ہے اور اس کے ختم ہونے سے دوسروں کا متاثر ہونا بھی ضروری ہے اس میں چھوٹے اور بڑے کی کوئی تخصیص نہیں اس کی مثال سانپ کی دی جا سکتی ہے۔ سانپوں کو بلا سوچے سمجھے مارے جانے سے چوہوں کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور یہ چوہے غذائی ذخیرہ اور اس طرح انسانی معیشت کو کھوکھلا کر ڈالتے ہیں اس لیے ہر جانور اور پودے کی اس کے اپنے ماحول میں اہمیت ہے اسی لیے اقبال نے کہا تھا۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
بُرا نہیں کوئی قدرت کے کارخانے میں

دنیا کے تمام مقدس یا آسمانی کتابوں میں بھی اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک خاص نظام کے تحت اس کائنات کی تخلیق کی اور تخلیق کردہ

موجودات میں ہم آہنگی پیدا کی۔مثلاً چاند، سورج اور زمین اپنے اپنے مدار میں ایک دوسرے کی گردش ایک نظام کے تحت کرتے ہیں جس کی وجہ سے صبح ہوتی ہے، دن ہوتا ہے، شام ہوتی ہے پھر رات ہوتی ہے اور یوں ہی وقت گزرتا رہتا ہے۔اس گردش سے اوقات میں تبدیلی آتی ہے اور تبدیلی اوقات سے موسم بدلتے ہیں اور پھر موسموں کی تبدیلی سے پھل، پھول اور غلّوں کے بے شمار اقسام کی پیداوار ہوتی ہے۔الغرض آسمان، زمین اور سمندر میں پائے جانے والی ایسی کوئی چیز نہیں ہے جن کا رشتہ دوسری چیزوں سے نہ ہو اور ان میں ہونے والے تغیرات کے اثرات ایک دوسرے پر نہ پڑتے ہوں اور ان تمام چیزوں میں ہم آہنگی نہ پائی جاتی ہو۔لہٰذا کائنات میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس سے انسانی رشتے قائم نہ ہوسکیں۔

اس شعر کی مزید وضاحت کے لیے اس برصغیر میں پائے جانے والے درخت ''سیمل'' کو لیجیے۔گرمی میں یہ پتوں سے ڈھکا رہتا ہے اور اپنے پورے قد کاٹھ سے اپنے اطراف ٹھنڈی چھاؤں کیے رکھتا ہے، خزاں کے آتے ہی یہ پتے جھاڑ کر سردی کی ناتواں دھوپ کو راستہ دیتا ہے اور اپنے ہمسایوں کو موسم سے مقابلے کی طاقت۔بہار کا تو اعلان ہی اس کی چاروں اطراف پھیلی ہوئی شاخوں پر موٹی موٹی انڈے کی شکل کی کلیوں کے نمودار ہونے سے ہوتا ہے جو سیاہی مائل بھورے رنگ کی ہوتی ہیں۔مظبوط شاخوں پر کلیوں کے گچھے ماہ فروری میں سرخ، نارنجی یا پیلے پھولوں میں بدل جاتے ہیں۔مختلف اطراف میں رخ کیے یہ پھول بلا مبالغہ سیکڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔پھولوں سے لدا دیدہ زیب درخت مرکز نگاہ اور اطراف کی تمام چیزوں پر حاوی ہوتا ہے۔دن کی روشنی میں یہ منظر رات کی تاریکی میں ہونے والی آتشبازی سے مشابہ ہوتا ہے۔

نباتات کی کتابوں میں اس کا نام ''بوم بیکس سیبا'' درج ہے اور اس کا شمار پھولدار درختوں والے خاندان ''مالویسی'' میں کیا جاتا ہے۔اردو میں ''سیمل'' اور انگلش میں ''سلک کاٹن ٹری'' کہا جاتا ہے، چین میں یہ ''موی این'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔اس کی کاشت کا علاقہ بہت وسیع و عریض ہے، جنوب میں تامل ناڈو سے لے کر

ہمالیہ کے دامن تک اونچے نیچے، خشک وتر سب میں ہی سر اٹھا کر جیتا ہے۔

پانچ سے سات انچ کے پانچ سے نو پتے ایک مرکزی شاخ سے جڑے ہو کر انسانی ہاتھ کی سی شبیہ بناتے ہیں۔ تنے سے پھوٹنے والی شاخیں متوازی اور سیدھی ہوتی ہیں اور تنے کے گرد ایک چکر کی صورت میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ باغبان نیچے سے ان کی چھٹائی کرتے رہتے ہیں اس طرح تنا صاف ہوتا جاتا ہے اور شاخوں کی چھتری اوپر کی جانب بڑھتی جاتی ہے یوں ایک سیدھا اور سایہ دار پیڑ وجود میں آتا ہے۔ چھ سے آٹھ انچ کا پانچ پنکھڑیوں والا خوشنما پھول بہت چمکدار اور ریشمی سا ہوتا ہے۔ دھوپ پڑنے پر اس کی چمک بہت دور تک جاتی ہے اور سب کو متوجہ کر لیتی ہے۔ پھول اپنی وضع قطع میں بیڈمنٹن کی چڑیا سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس میں پانی اور مٹھاس کی بڑی مقدار موجود ہوتی ہے جو بہت سے پرندوں کے لئے سال بھر کی توانائی کا سامان لئے ہوتی ہے۔ شہد کی مکھیاں اور بہت سے پرندے پھولوں کے کھلتے ہی اس کا رخ کرتے ہیں اور اس دعوت عام میں اپنا حصہ بقدر جسہ وصول کرتے ہیں۔ ایسے شاید کم ہی درخت ہونگے جن میں پرندوں کے لئے سیمل جتنی کشش ہو۔ باغوں میں اس کی موجودگی پرندوں کی آمد کا سبب بنتی ہے۔ سیمل کے بلند قد وقامت کے باعث بہار کی آمد کی اطلاع دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ شہروں کی سنگین سکائی لائن رنگین اور گداز کرنے کا یہ سہل اور آسان طریقہ ہے۔ درخت کی شاخ پر سیمل کے پھول کی عمر تقریباً انتیس دن ہوتی ہے یہ صرف شاخ پر کھلا، رنگ بکھیرتا ہی بھلا نہیں لگتا اس کا اپنی شاخ سے ٹوٹ کر گرنے کا منظر بھی انوکھا اور دلفریب ہوتا ہے۔ اپنی مخصوص ساخت اور وزن کے باعث بلندی سے نیچے پنکھے کی طرح گھومتے ہوئے آتا ہے۔ سیمل کے پھول مارچ اپریل میں گرنا شروع ہوتے ہیں اور جو رنگ کچھ دن پہلے آسمان پر چھایا ہوئے تھے اب زمین کو رنگ دیتے ہیں اور سیمل کے اردگرد کی زمین کا حسن ہی نہیں زرخیزی کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ ماہ مئی میں ان رنگوں کی جگہ ریشم کی سی ملائم روئی کی باریک سی تہہ لے لیتی ہے ایسا اس کے سیڈ پوڈ کے درختوں پر ہی کھل جانے سے ہوتا ہے۔ سیمل کا ایک ملی میٹر موٹا اور دو سے تین ملی میٹر

قطر کا گول بیج بہت نازک اور مہین ہوتا ہے اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ دیو ہیکل درخت اس مہین بیج سے برآمد ہوا ہے۔ چار سے چھ انچ کے سخت بیضوی سیڈ پوڈ کے اندر ریشمی روئی میں لپٹے بیج بھرے ہوتے ہے۔ یہ شاید بیجوں کی نازکی کا ہی تقاضا تھا کہ قدرت نے اسے نہایت نرمی سے ریشم میں لپیٹ کر ایک مظبوط اور چوبی ڈبے میں رکھا۔ درخت پر ہی کھل جانے پر اس کے بیج ہوا کے دوش پر دور دراز، انجان زمینوں کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں لیکن جہاں اس کی قیمتی ریشمی روئی کو ضائع کرنا مقصود نہ ہو وہاں انہیں کھلنے سے پہلے ہی اتار لیا جاتا ہے اور پھر گرم پانی میں ڈال کر کھولا جاتا ہے اور اس طرح بیج اور ریشم علیحدہ کر کے کام میں لایا جاتا ہے۔ سیمل کی روئی کو کاتا نہیں جا سکتا اس لئے یہ ریشمی ہونے کے باوجود ریشم کی ہم پلہ نہیں ہے اور صرف گدوں اور تکیوں کی بھرائی ہی کے کام آتی ہے۔ سیمل کا بیج کھانے کے قابل نہیں ہوتا اور زہریلہ ہوتا ہے۔

پینتیس سے چالیس میٹر بلند سیمل اپنی مضبوط شاخوں کی بیس سے پچیس میٹر کی چاروں اطراف پھیلی ہوئی چھتری اٹھائے، سایہ پھیلائے بہت باوقار اور بارعب انداز میں سو برس سے بھی زیادہ عرصے تک تیز و تند ہواؤں کا غرور توڑ کر باغوں کی حفاظت کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ ابتدا میں اس کے تنے پر موٹے موٹے کانٹے ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں یہ اس کا جانوروں کی چڑھائی سے محفوظ رہنے کا قدرتی نظام ہے۔ سلیٹی رنگ کی چھال کی سطح کھردری اور ہاتھی کی جلد سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس کے تنے کی موٹائی تین سے پانچ میٹر تک ہو سکتی ہے۔ یہ ایک تیز رفتار درخت ہے اور اور پانچ سال میں ہی دس سے بارہ میٹر تک جا پہنچتا ہے ویسے اس پر پھولوں کی آمد کا سلسلہ تو تین سے چار میٹر کے پودے سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ قد اور حجم بڑھنے پر اتنے بڑے وجود کو سہارا دینے کے لئے بھی قدرت نے اسے ایک خاص نظام سے نوازا ہے۔ سیمل کے نچلے حصے سے خاص جڑیں جنہیں بٹرس روٹس بھی کہا جاتا ہے نمودار ہوتی ہیں جو اس کے تنے کو کچھ فاصلے سے اس طرح سہارا دیتی ہیں جیسے واقعی کوئی دیوار تعمیر کی گئی ہو، بعض پرانے درختوں میں یہ بٹرس روٹس تنے پر آٹھ سے دس میٹر اونچائی سے زمین پر کوئی تین

سے چار میٹر تک جا پہنچتی ہیں۔ سیمل ایگرو فارسٹری کے لئے بہترین سمجھے جانے والے معدودے چند اشجار میں شامل ہے اور ہو بھی کیسے نہ، یہ جتنا اوپر بڑھتا ہے اتنا ہی نیچے بھی۔ ماہرین کے مطابق سیمل کے حجم کا ایک چوتھائی سے بھی زیادہ زیر زمین ہوتا ہے اس طرح بائیو ماس کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے کاشتکار کی زمین کو مہیا کرتا ہے۔ مزید یہ کہ اپنے حسن و جمال کے ساتھ ساتھ سیمل فضاء کو ہر قسم کی آلودگی چاہے وہ گرد و غبار کی ہو یا موٹر گاڑیوں کے دھوئیں کی سب ہی کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے اور گہری گھنی چھاؤں سے نہ صرف درجہ حرارت میں کمی کا باعث ہوتا ہے بلکہ سڑکوں کے اطراف ہونے کی صورت میں ان کی عمر بھی بڑھاتا ہے۔ اس کی تازہ کٹی ہوئی لکڑی کی رنگت کچھ سفیدی سی ہوتی ہے جو وقت کے ساتھ سلیٹی ہو جاتی ہے۔ صرف پانی کے اندر پائیدار پائی گئی ہے اس لئے چھوٹی کشتیوں اور کووں کی دیواروں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اس کا زیادہ استعمال پلائی وڈ کی صنعت میں ہی ہوتا ہے۔

ماحولیات اور جنگلات صرف اپنے قدرتی وسائل اور حسن کی بنا پر ہی نہیں بلکہ زندگی کی ان مختلف شکلوں اور پہلوؤں کے باعث بھی جو وہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں تہذیب اور معیشت کا بیش قیمت سرمایہ ہیں انواع و اقسام کے چرند، پرند و درند اس کی وسیع اور مشفق گود میں آسودگی اور زندگی پاتے ہیں اور ماحول کو حسین و خوشگوار بناتے ہیں جنگلی جانوروں کو ان کے اپنے ماحول میں دیکھنا ایک الگ ہی تجربہ ہے۔ یہاں کا سکون خامشی، پاکیزگی اور تصنع سے پاک ماحول ڈھونڈھنے والے کو روحانیت اور گیان کی دنیا میں لے جاتے ہیں جنگلوں کی معاشی اہمیت سے کسے انکار ہے۔ عمارتی لکڑی، ایندھن، چارہ، جڑی بوٹیاں، شہد، نیل، گوند، ریزن، سمور، لاکھ، ربڑ، کوکو، چمڑا وغیرہ جنگلات ہی کے حاصلات ہیں۔ فرنیچر، کاغذ، وغیرہ کی صنعتیں خام مال کے لیے ان ہی پر انحصار کرتی ہیں۔ اگر جنگل نہ ہوں تو ملک معاشی اعتبار سے کم زور ہو جائے۔ قسم قسم کے جانوروں کو قدرتی ماحول میں گھومتے پھرتے دیکھنے کا شوق سیاحوں کو افریقہ اور ایشیا کے جنگلات میں کھینچ لاتا ہے اس طرح یہ سیاحت کو فروغ دینے اور بیرونی زرمبادلہ کمانے کا

افسانوں میں دریا کی لہریں ہیں، رنگ بدلتا آسمان، زمین پر سبزے کا جادو۔۔۔اور تصور میں ایک ایسے انسان کا پیکر جس میں فطرت سے کسی قسم کی کوئی وابستگی نہیں۔ان افسانوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ فطرت میں کتنے اسرار پوشیدہ ہیں، کیسی گہرائیاں ہیں پانی کی لہروں کے نیچے۔ زمین پر بسنے والے انسانوں میں جن کے مختلف رنگ روپ ہیں۔ لہریں ابھرتی ہیں، ڈوبتی ہیں... اور سمندر کا حصہ بن جاتی ہیں، انسان جنم لیتے ہیں مرتے ہیں لیکن زندگی چلتی رہتی ہے... رواں رہتی ہے۔ان عصری تانیثی افسانوں سے فطرت کے مکمل حسن کا ادراک ہوتا ہے۔فطرت کے علاوہ ذات کے گمشدہ حصوں کی دریافت اور اپنے جڑوں کی تلاش کا عمل بھی ان افسانوں میں نمایاں ہے۔ ان خواتین افسانہ نگاروں نے زوال پذیر انسانی معاشرے کی کہانی اور اخلاقی انحطاط کا فسانہ اس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ پدرسری معاشرے کی جڑوں کی کثافت صاف نظر آتی ہے اور بعض کہانیوں میں وہ اسی کثافت کے خلاف آمادہ جنگ نظر آتی ہیں۔اس جنگ سے جنم لیتی ان تخلیقات میں دکھ بھی ہیں، درد بھی اور تنہائی کا گہرا احساس بھی۔مگر یہ کہانیاں نسائی فکری تموجات کا ایک منظر نامہ بھی ترتیب دیتی نظر آتی ہیں۔

زیر نظر کتاب عصری تانیثی افسانوں کے نسائی باغیانہ تیور کی وکالت ہے مگر یہ بے جا وکالت نہیں۔صحیح زاویے سے دیکھیں تو یہ حرفِ صداقت ہے، ایک سچا تانیثی بیانیہ ہے جسے پدرسری سماج نے برسوں اپنے جبڑوں تلے دبائے رکھا۔اس پدرسری سماج نے جس نے اپنی زمین اور جڑ کو فراموش کر دیا۔وہ زمین جو عورت کی ایک علامت ہے۔

نسترن احسن فتیحی
علی گڑھ

بھی ذریعہ ہے۔

پودوں میں مسلسل چلنے والے عمل شعاعی ترکیب Photosynthesis کی مدد سے یہ کلوروفل کی موجودگی میں زمین سے حاصل شدہ پانی اور نمکیات سے سورج کی روشنی میں غذا تیار کرتے ہیں جس کا بڑا حصہ جانوروں کے ذریعے استعمال کیا جاتا ہے۔ پودوں کی تیار کردہ غذا کی مقدار سالانہ کروڑوں ٹن تک پہونچ جاتی ہے اگر درختوں کے کٹنے کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو ہمیں ایک خطرناک صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے قدرت میں پائی جانے والی دولت جیسے درخت، نمکیات، معدنیات، کوئلہ، میٹھے پانی کے ذخائر وغیرہ کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) تجدیدی وسائل

(۲) غیر تجدیدی وسائل

قدرتی دولت کی وہ قسم جس کے تصرف کے بعد دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہے اس کا شمار تجدیدی قسم میں ہوتا ہے جیسے درخت، جانور وغیرہ مگر غیر تجدیدی کے ذخائر ختم ہو جائیں تو ان کی تجدید کاری ممکن نہیں لہٰذا ہمیں ہر دو قسم کے وسائل کو بڑی ہوشیاری، کفایت شعاری اور منصوبہ بندی کے ساتھ استعمال کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کا بے دریغ استعمال آنے والی نسلوں کو کہیں ان سے محروم نہ کردے۔

آج علم ماحول پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے اسے نئی تعلیمی پالیسی کا لازمی جز قرار دیا گیا ہے تاکہ نئی نسل کو ابتدا ہی سے اس کی اہمیت سے آگاہ کیا جائے۔ عوام کو بھی مختلف ذرائع ابلاغ و ترسیل جیسے کتابوں، اشتہاروں، نمائشوں، فلموں، میلوں وغیرہ کے انعقاد سے ماحول کی اہمیت سے واقف کروایا جاسکتا ہے۔ ماحولیات اور قدرتی وسائل کی مناسبت سے ماحولیات اور قدرتی وسائل کے حکام اور اہلکاروں کے ساتھ ملاقات میں ہوا کی آلودگی، گرد و غبار جنگلات، مرغزاروں اور سبز فضائیں کی تخریب جیسی ماحولیات کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے منصوبہ بندی، تدبیر، پیہم تلاش و کوشش اور متعلقہ اداروں کے ٹھوس اقدامات پر تاکید کرتے ہوئے فرمایا: ماحولیات کی حفاظت حکومت کی اہم

ذمہ داری ہے اور اس سلسلے میں قومی ماحولیات کی دستاویز کو آمادہ کر کے اسے تمام تعمیری اور صنعتی منصوبوں کے ساتھ منسلک کرنا چاہیے اور ماحولیات کی تخریب کو جرم قرار دیکر اس اہم ذمہ داری پر سنجیدگی کے ساتھ عمل کرنا چاہیے۔ ماحولیاتی آلودگی انسان کی زندگی کے لئے خطرہ ہے۔ انسان آلودہ ماحول میں سانس لے کر اپنے جسم میں بیماریوں کو دعوت دیتا ہے۔ دنیا میں ماحولیاتی آلودگی میں انتہائی اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس پر قابو پانا ضروری ہے۔ ہماری صحت، ہمارے ماحول سے بہت حد تک وابستہ ہے۔ ہم جس ماحول میں رہتے ہیں، اِس میں انسان، جانور، موسمی حالات، چرند پرند، پودے اور درخت، ہوا، پانی، سورج، بادل، کھیت اور کھلیان، دریا اور نہریں سب کچھ شامل ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر ماحول کو فراموش کرنے کی کوشش کریں تو یہ بیکار ہوگا کیونکہ ماحول ایک دائمی چیز ہے۔ گھر کا ماحول، باہر کا ماحول، اسکول کا ماحول، آفس کا ماحول غرض کہ ماحول سے ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ انسان کے اندر کا ماحول اس کو بیرونی ماحول سے نبرد آزما ہونے میں مدد دیتا ہے۔ جس فضا میں ہم سانس لیتے ہیں، ہوا کا ایک ذریعہ ہے۔ ہم آکسیجن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمارے جسم میں ہر لمحہ کاربن ڈائی آکسائیڈ بنتی رہتی ہے۔ ہمارے خون کے سرخ خلئے نہایت سرعت اور جانفشانی کے ساتھ ہمارے پھیپھڑوں کی باریک نالیوں میں آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کا تبادلہ کرتے ہیں اور آکسیجن کو جسم کے کونے کونے تک پہنچاتے ہیں۔ یہ کارکردگی زندگی کے پہلے دن سے آخر دن تک برقرار رہتی ہے۔ فضا میں دوسری گیسز بھی ہوتی ہیں اور وہ گیسز ہماری سانس کے ساتھ ہمارے جسم میں داخل ہوتی ہیں اور باہر نکل جاتی ہیں۔ گاؤں کی فضا چونکہ آلودگی سے پاک ہوتی ہے اس لیے وہاں رہنے والا شخص نسبتاً زیادہ صحت مند ہوتا ہے مگر شہر کے باسی اتنے خوش نصیب نہیں ہوتے۔

شور کی آلودگی بھی ماحولیاتی آلودگی کی ایک قسم ہے۔ جسے ہمارے ملک میں کسی بھی طور پر اہمیت نہیں دی جا رہی، حالانکہ یہ ان دیکھی آلودگی ہماری زندگیوں، صحت (جسمانی اور ذہنی) اور ترقی پر براہِ راست اور بلاواسطہ بہت زیادہ اثرات مرتب کر رہی

ہے۔ مثلاً شور کے حد سے زیادہ بڑھنے سے یہ سننے کی حس کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ اگر اس کا مقابلہ گرمی اور روشنی کی آلودگی سے کیا جائے تو صوتی آلودگی کے عناصر یا (پارٹیکلز) ہمیں کہیں نہیں دکھائی دیں گے مگر آواز کی لہریں قدرتی لہروں کی موجودگی میں خطرات کو بڑھا دیتی ہیں۔

شور کی آلودگی میں بہت سی آوازیں شامل ہیں جن کو ہم اپنی عام زندگی میں نظر انداز کر دیتے ہیں مگر درحقیقت یہ ہماری زندگی میں بہت بڑا خطرے کا باعث ہوتی ہیں۔ شور کی آلودگی میں جنریٹر، ریل گاڑی، کار، موٹر سائیکل، رکشہ، جہاز، مشینیں (سلائی مشین، واشنگ مشین، گرائنڈر وغیرہ) گھر کے دروازے کی بیل کے علاوہ محلوں میں چیختے چلاتے چھابڑی فروش اور ہمسائیوں کی مشکلات سے بے خبر بلند آواز میں گلا پھاڑتے ہوئے مکین شامل ہیں۔ دیہی اور قصباتی علاقوں میں ہر مذہبی اور سماجی تقاریب کے موقع پر لاؤڈ اسپیکر کا بے دریغ استعمال اور الیکشن کے وقت سیاسی پارٹیوں کا شور وغوغا بھی اس آلودگی میں بے پناہ اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

سائنسدانوں کی ریسرچ کے مطابق اگر کوئی شخص مسلسل شور کے ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے تو اس کے سننے کی حس بتدریج زائل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مصنوعی شور کی آلودگی جس میں ٹریفک کا شور شامل ہے، کی وجہ سے انسان اعصابی تناؤ، بے چینی اور طبیعت میں چڑچڑے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جنریٹر یا مشینوں کی آواز کی وجہ سے یا اچانک تیز دروازے کی گھنٹی کی وجہ سے نیند ٹوٹ جاتی ہے یا اس میں خلل آجائے تو انسان کی طبیعت میں مزید بے سکونی بڑھ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے دل کی بیماریاں اور ذہنی صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ یہ زرق برق روشنی جہاں ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک، دل کو فرحت ونشاط اور ذہن ودماغ پر خوشی ومسرت کے لافانی نقوش چھوڑ جاتی ہے وہیں ہم سے اس کی بھاری قیمت بھی چکا لیتی ہے۔ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ رات کی روشنی صحت انسانی کے لیے خطرہ ہے نیز سینے کے سرطان، مایوسی اور دیگر امراض کے روز افزوں واقعات کا اہم سبب ہے۔ بہت سے جنگلی جانوروں اور پودوں کے لیے

رات میں روشنی زہریلے عناصر کے مانند ضرر رساں ہے۔

ماحولیاتی آلودگی میں ٹریفک کا دھواں بھی کئی بیماریاں پھیلانے کا سبب ہے۔ شہر کی فضا گاڑیوں کے دھوئیں سے آلودہ ہے۔ علاوہ ازیں کچرے کے ڈھیر میں بھی آگ لگا دی جاتی ہے جس کا دھواں بھی مضر صحت ہے۔ ماحولیاتی آلودگی اور گرم ماحول سے خواتین سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں اور ٹمپریچر کے بڑھنے کی وجہ سے خواتین کی جسمانی کارکردگی تیس فیصد جبکہ دماغی کارکردگی پچاس فیصد تک رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے خواتین ڈپریشن، ٹینشن اور فرسٹریشن کا شکار ہوتی جارہی ہیں۔ فضائی آلودگی کے سبب لوگوں کو سانس کی مختلف الرجیز کے علاوہ دمہ کی بھی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔

گاڑیوں اور دیگر آوازوں کا شور اور دھواں بھی جانداروں کیلئے انتہائی مضر ہیں جس سے ان کا سانس لینے کا عمل بالخصوص دل اور پھیپھڑے متاثر ہوتے ہیں اور آلودگی کے مختلف اجزاء جسموں کے اندر داخل ہو کر ان کے اندرونی نظام کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی کے ان تمام پہلوؤں کے پیش نظر انھیں مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(ا) فضائی آلودگی:

انسانوں نے آبادی میں اضافے کے پیش نظر اپنا پہلا نشانہ جنگلات کو بنایا تاکہ رہائش، فیکٹریوں اور دیگر سہولیات (جیسے سڑکیں، پل، باندھ، اناج کی پیداوار) کے لیے جگہ حاصل کی جاسکے۔ جنگلات کی اندھا دھند کٹائی نے نہ صرف ماحول کو متاثر کیا بلکہ موسموں کی ترتیب کو بھی اثر انداز کیا۔ چٹانوں اور زمین کا بڑا حصہ کھل (عریاں) گیا جس سے جھیج میں اضافہ ہوا۔ جنگلی جانوروں کے مسکن تباہ ہوئے نیز دیگر جانوروں اور پرندوں کو بھی نقصان ہوا۔ چراگاہوں کے خاتمے سے نہ صرف جنگلی جانور بلکہ پالتو جانور بھی متاثر ہوئے۔ گویا ماحول کی بنیاد ہل کر رہ گئی۔ موسموں خصوصاً بارش پر اس کا اثر پڑا۔ اس کے نتیجے میں فصلیں بھی متاثر ہوئیں۔ اناج اور دیگر زراعی پیداواروں کی بڑھتی

مانگ سے نمٹنے کے لیے کھادوں اور جراثیم کش ادویات کے استعمال کے لیے کسانوں کو اکسایا گیا۔ جس سے زمین کی زرخیزی متاثر ہوئی ہے اور اس کے بدولت کھیت کے اطراف کی زمین اور پانی کے ذخائر بھی متاثر ہوئے۔ اشیائے خوردنی کے ساتھ انسانی جسم میں داخل ہونے والے ان کیمیائی مادوں نے اس کی صحت کو متاثر کیا۔ ان کے سد باب کے لیے نئی نئی دواؤں کی وافر مقدار میں تیاری نیز شفاخانوں کی ضرورت پیش آئی۔ فیکٹریوں، اسپتالوں کے لیے زائد زمین جنگلات کو صاف کر کے حاصل کی گئی۔ انسانی آبادیاں دور دور تک پھیلتی گئیں لہٰذا قدرتی طور پر حمل ونقل اور بار برداری کے لیے مزید گاڑیوں کی ضرورت پیش آئی جس میں جلنے والے ایندھن نے آلودگی کو اور بڑھایا۔ اسی طرح کارخانوں کی چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں نے کچھ کم قہر نہیں ڈھایا۔ وہ ہوا کی آلودگی سے پودوں، جانوروں اور انسانوں میں مختلف بیماریوں کا انتشار ہوا۔ ہوا کی آلودگی سے حلق، تنفسی اعضا، آنکھ وغیرہ متاثر ہوتے ہیں۔ ان سے دمہ، کینسر جلدی بیماریاں، تپ دق اور دیگر امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب کی ضرب معاشی حالت پر بھی پڑتی ہے۔ صنعتی علاقوں میں متاثرہ افراد کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ علاوہ اس فضا میں موجود گیسوں کے بارش کے پانی کے ساتھ مل کر زمین پر آنے سے بھی کئی نقصانات ہیں۔ اس ''تیزابی بارش'' نے کئی تاریخی عمارتوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ تاج محل کو ''سنگی کینسر'' اس بارش کا تحفہ ہے۔ اسی طرح ''کالی بارش سے نوشینی پانی آلودہ ہوتا ہے بلکہ یہ انسانوں کے استعمال کے لائق نہیں رہ جاتا۔ سیمنٹ کارخانوں، پارچہ بافی، چمڑا سازی اور دیگر صنعتوں سے نکلنے والے مہین ذرات اور ریشے ہوا کا حصہ بن کر اپنی قیمت وصول کرتے ہیں۔ یہ انسانوں میں مختلف عارضے پیدا کر کے ان کی تخلیقی اور فکری قوت کو متاثر کرتے ہیں۔ کام کرنے کی صلاحیت بھی متاثر ہوتی ہے اور ان سب کے نقصان کو روپے میں نہیں آنکا جا سکتا۔ ایٹمی تجربات، دھماکوں اور ایٹمی توانائی کے مختلف استعمال کے نتیجے میں تابکار آلائندے ہوا میں شامل ہو جاتے ہیں جو کہ سارے آلائندوں کی بہ نسبت زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے زخموں کو دنیا چھ دہائی کے بعد بھی بھول

نہیں پائی ہے۔ حالیہ تاریخ میں سابق سوویت یونین کے چرنوبل کا واقعہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ تابکار آلودگی انسانیت کے لیے کتنی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ بڑھتی ہوئی جوہری دوڑ اور بعض ممالک کی ہٹ دھرمی اور غیر دانش مندی نے انسانیت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ ایک معمولی سی حماقت اس خوبصورت سیارے کو منٹوں میں تباہ کر سکتی ہے۔ صنعتی آلودگی کا 1984 کا بھوپال کا سانحہ بھی ایک ایسی مثال ہے جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ معمولی سی لاپرواہی کس طرح ہزاروں انسانی جانوں کو بھینٹ چڑھا سکتی ہے۔ آئے دن اخبارات میں گیسوں کے چھوٹے موٹے رساؤ کی خبروں کے ہم عادی ہو چکے ہیں اور ایسی خبروں کو سرسری طور پر پڑھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ان کارخانوں سے مختلف گیسوں، کیمیائی مادوں اور صنعتی فضلات سے ہوا، پانی، مٹی سبھی آلودہ ہوتے رہتے ہیں۔ صنعتی فاضلات پانی کے ساتھ زمین میں سرایت کر کے اور ندی، تالاب میں شامل ہو کر پانی کے ذخائر کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ فضا کی آلودگی نے کئی مسائل کو جنم دیا ہے جیسے اوزون گیس کے غلاف کا پتلا ہو جانا، گرین ہاؤس اثرات، عالمی حدت اور موسموں میں یکلخت تبدیلیاں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے طوفان، سیلاب وغیرہ۔

ہوائی کرہ میں اوزان کی تباہی ایک سنجیدہ مستقل مسئلہ ہے۔ یہ نازک اور پیچیدہ مسئلہ سبھی ممالک کی تشویش کا سبب بنا ہوا ہے۔ زمین اور اس کے باسیوں کو سورج کی حد درجہ تپش خصوصاً بالائے بنفشی شعاعوں سے تحفظ فراہم کرنے میں اس کے رول کو نظر انداز نہیں جا کیا سکتا۔ کچھ مخصوص صنعتیں اوزون کی کمی کی ذمہ دار ہیں چنانچہ اس کے سدباب کے لیے بین الاقوامی سطح پر کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس میں بطور خاص کلورو فلورو کاربن مرکبات (CFCs) اور ہائیڈروفلورو کاربن (HFCs) پر مکمل پابندی نیز جیٹ، سپر سونک اور کانکرڈ طیاروں کے ایندھنوں کی اصلاح جن سے اوزان کی تباہی عمل میں آتی ہے، یہ اقسام شامل ہیں۔

شہری اور صنعتی سرگرمیوں کے نتیجے میں دنیا کی آب و ہوا، موسم میں نمایاں

تبدیلی ہو رہی ہے۔ پچھلی صدی میں ہمارے کرہ ءارض کی تپش میں 0.6 درجہ سیل سی ایس کا رخانے کا اضافہ ہوا نیز TERI (دی انرجی سورسیز انسٹی ٹیوٹ) کے ڈائرکٹر کے مطابق یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو اکیسویں صدی میں اس اضافے کے 1.4 تا 5.8 درجہ سیل سی ایس تک پہنچ جانے کی توقع ہے۔ اس عالمی حدّت (گلوبل وارمنگ) کے نتائج ہمیں دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ دنیا کے عظیم گلیشیئر کا نیز قطبی برف کا پگھلنا اسی طرح ہمالیہ جیسے پہاڑی سلسلوں سے برف کا تیزی سے پگھلنا، سمندروں کی سطح میں اضافہ کر سکتا ہے جس سے نچلے اور ساحلی علاقوں کے غرقاب ہونے کے خدشات ہیں نیز دیگر بحری آفات میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ قطرینہ، ہری کین، ریتا، ولمو جیسے طوفان اور سونامی جیسی قیامت صغریٰ کی تباہ کاریاں ابھی انسانی ذہنوں میں تازہ ہیں۔ ماہرین کے مطابق ان قدرتی مظاہر سے دنیا کے بڑے شہروں جیسے نیویارک، شنگھائی، ممبئی وغیرہ کو بے حد خطرہ لاحق ہے جب کہ بنگلہ دیش انڈونیشا کے کچھ جزائر کے پوری طرح زیر آب چلے جانے کے خدشات ہیں۔

امریکہ جیسا سائنسی اعتبار سے ترقی یافتہ ملک اور اس کی جدید مشنری ان آفات کے سامنے بے بس پائے گئے۔ پھر بھلا انڈونیشا، بنگلہ دیش وغیرہ کس شمار میں ہیں۔ ان آفات کے لیے خود انسانوں کے اپنے کرتوت بھی ذمہ دار ہیں۔ موسموں کے تواتر اور ان کی نوعیت میں تو تبدیلی پیدا ہوئی ہے، سونامی جیسی آفت سے تو دنیا کا جغرافیہ اور نقشہ تک بدل گیا ہے۔ اب آگے نئے ریگستانوں کے وجود میں آنے اور قابلِ کاشت زمین کے رقبے کے کم ہونے کے امکانات ہیں نیز بڑے بڑے شہروں کے غرقاب ہونے کے بھی اندازے لگائے گئے ہیں لہٰذا اس آلودگی پر کنٹرول فوری توجہ چاہتا ہے۔

(۲) پانی کی آلودگی:

پانی کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس گمبھیر مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ پانی کے گھٹتے ذخائر نیز پانی کی آلودگی۔ اس آلودگی کے لیے کئی عوامل ذمہ دار

ہیں۔ ہماری صنعتیں، بطور خاص رنگ، کیمیات، کھاد، جراثیم کش ادویات ایک طرف تو گہرا گھنا دھواں چھوڑ کر ہوا کو آلودہ کرتے ہیں دوسری جانب ایسے صنعتی فاضل مادے خارج کرتے ہیں جو تالابوں، ندیوں حتیٰ کہ سمندروں کو آلودہ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا یہ مادے اگر انسانوں میں مختلف بیماریاں پھیلاتے ہیں تو آبی جانوروں کے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ ان سے بحری و آبی جانور، کائی، بیکٹر یا وغیرہ ختم ہو جاتے ہیں جو قدرت میں بطور خاکروب کام کرتے ہیں۔ کھیتوں سے بہنے والے پانی میں کھادوں کی کچھ مقدار بھی رہ جاتی ہے جس سے غیر ضروری پودے/ کائی وغیرہ کی نشو ونما تیزی سے ہوتی ہے اسی طرح انسانی فضلے کے لیے سمندر کی کوکھ کو زیادہ مناسب سمجھنا چاہیے، نیز تابکاری فضلے بھی یہاں مدفون کر دیئے جاتے ہیں چنانچہ آج خلا، ہمالیہ جیسے پہاڑ، سمندر، انٹارٹیکا وغیرہ بھی آلودگی سے محفوظ نہیں رہ پائے ہیں۔ بڑے بڑے تیل کے ٹینکروں سے رسنے والا تیل اور حادثات کی صورت میں سطح سمندر پر پھیل جانے والی میلوں لمبی تیل کی تہہ آبی جانوروں کے لیے جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ پاک وصاف پانی کسی نعمت سے کم نہیں۔ مگر دنیا کے بیشتر ممالک کے عوام کو یہ قدرتی تحفہ میسر نہیں۔ پینے کے پانی کے حصول کے لیے تو بعض علاقوں کے لوگوں کو خصوصاً عورتوں کو میلوں دور جانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد بھی جو پانی ملتا ہے وہ انسانوں کی صحت کی نقطہ نظر سے قطعی مناسب نہیں۔ مگر ایسا پانی پینے پر لوگ مجبور ہیں۔ موسموں کی بے یقینی کیفیت اور انسانی سرگرمیوں نے زمین کا سینہ پانی کی دولت سے خالی کر دیا ہے اور اگر یہ دستیاب ہے بھی تو سیکڑوں فٹ گہرائی میں، تجارتی ذہنیت نے اس خزانے کو مشروب اور مینرل واٹر کی شکل میں فروخت کر کے اپنے لیے کھرے منافع میں تبدیل کر لیا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں عالمی پیمانے پر اس جال میں تیسری دنیا کے ممالک کو جکڑنے کے لیے پوری تیار ہیں۔

کیمیائی کھاد کے استعمال نے فصلوں کی پیداوار میں ضرور اضافہ کیا ہے مگر یہ کسی سراب سے کم نہیں۔ زمین کی بڑھتی ہوئی تیز ابیت اور ختم ہوتی ہوئی زرخیزی کسانوں کو نظر نہیں آئی۔ اس کی تلافی کے لیے اور مزید فصل کے حصول کے لیے کھاد کی

اور زیادہ مقدار اور مادہ طاقت مزید فصل کے حصول کے لیے کھاد کی اور زیادہ مقدار اور طاقت ور کھاد کے استعمال کرنے کی نوبت آئی جس نے زمین کو اور زیادہ نقصان پہنچایا۔ زمین کی اس بربادی کے مدنظر جاپان جیسے ملک نے کیمیائی کھاد کے استعمال پر مکمل پابندی عائد کر دی ہے۔ یہاں صرف اور صرف قدرتی کھادوں کے استعمال نے خوش آیند نتائج سامنے لائے ہیں۔ زمین کو دی جانے والی کھاد کی کچھ مقدار پانی کے ساتھ ندی تالابوں میں بہہ کر چلی جاتی ہے جس سے فاضل گھاس، کائی وغیرہ کو غذائیت ملتی ہے اور ان کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کیمیات اور جراثیم کش ادویات بھی پانی میں گھل کر ندی تالابوں میں پہنچ کر یہاں کے جانوروں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ زیادہ تر کارخانے اپنے صنعتی فاضلات قریبی پانی کے ذخائر میں چھوڑ دیتے ہیں جن سے آبی جانوروں اور انسانوں کو ناقابل بیان نقصان پہنچتا ہے۔ مذہبی رسوم اور تہواروں کے نتیجے میں نیز ادھ جلی لاشوں اور راکھ کو بہانے سے گنگا جیسی عظیم اور پوتر ندی اس حد تک آلودہ ہو چکی ہے کہ اس کی صفائی کے پرعزم منصوبے ناکام ہو چکے ہیں۔ ملک کی دیگر ندیاں بھی آلودگی کی کم و بیش یہی تصویر پیش کرتی ہیں۔ پینے کے علاوہ پانی انسان کی کئی دوسری ضروریات کے علاوہ کارخانوں، بجلی گھروں وغیرہ کو بھی چلانے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ انسان نے اس بیش قیمت دولت کا بے دریغ استعمال کر لیا ہے اور اب اس کی قدر و قیمت سے واقف ہو رہا ہے۔ مشاہدین کا یہ خدشہ بے بنیاد نہیں کہ تیسری عالمی جنگ اسی پانی کے حصول اور اس کے ذخائر پر قبضے کے لیے لڑی جائے گی۔ یہ پانی عنقا ہو کر قحط اور خشک سالی کی کیفیت پیدا کرتا ہے تو اس کی زیادتی طوفان اور سیلاب کی صورت میں قیامت صغریٰ کا منظر پیش کرتی ہے۔ گویا اس کی مناسب مقدار ہی ہمارے لیے فائدہ مند ہے۔

پانی کو اگر اکسیر یا آب حیات سے تشبیہ دی جاتی ہے تو یہ عین اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر بالکل درست ہے مگر یہی پانی اگر آلودہ ہو جائے تو انسانی زندگی کو پریشانیوں اور بیماریوں سے بھر دیتا ہے۔ بعض مادے اور عناصر تو سم قاتل ثابت ہوتے ہیں۔ خصوصاً سیسہ، پارہ، آرسنک وغیرہ اگر موت نہیں تو تشویش ناک امراض کے لیے

ضرور ذمہ دار ہوتے ہیں۔

(۳) صوتی آلودگی:

صوتی آلودگی یا آواز کی آلودگی نے بھی انسان کے ماحول اور اس کے معاشرہ کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ انسانی ترقی (سائنسی ترقی) کے اضافہ کے ساتھ آواز کی آلودگی بھی متناسب انداز میں بڑھی ہے۔ دن رات چلتی مشینیں، کارخانے، دوڑتی ہوئی گاڑیاں (اسکوٹر، لاری، آٹو رکشہ، طیارے، ریل گاڑیاں) گھریلو اور صنعتی مشینیں، انسانی آبادی کا شور، لطف اندوزی کے ذرائع جیسے سینما، ٹی وی، لاؤڈ اسپیکر وغیرہ مسلسل آواز پیدا کر کے انسان کے سکون، ذہنی آسودگی اور صحت کو متاثر کر رہے ہیں۔ عام حالات میں ہم ان کے خطرات کو نہیں سمجھ پاتے مگر یہ شور انسان کو مختلف طرح سے بیمار کر دیتے ہیں۔ اس کے کام کرنے کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے اور بعض محرومیاں یا معذوریاں تو مستقل صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ آواز کی آلودگی اور شور شرابے سے جانور اور پودے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ سائنس و ٹکنالوجی کی بے پناہ اضافے نے خصوصاً ان کے غیر دانشمندانہ طور پر استعمال نے کچھ اور مسائل کو پیدا کیا ہے۔ اس سے قبل تابکار آلودگی کا ذکر گزر چکا ہے کہ اس آلودگی کے ذریعے انسانوں اور جانوروں کی جسمانی ساخت (کروموزوم) پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اطلاعاتی انقلاب نے ایک نئے مسئلے کو جنم دیا ہے۔ دنیا میں ہر سال لاکھوں کمپیوٹر، ٹی۔وی، موبائل فون اور دیگر الکٹرونک اشیا بنائی جاتی ہیں۔ جدید تحقیق کی روشنی میں ان کے تازہ ترین ماڈل کی مارکیٹ میں مانگ ہوتی ہے چنانچہ اچھے خاصے آلات کو کباڑ خانے کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ناکارہ ہونے والے سیٹ کا بھی یہی مقدر ہوتا ہے۔ یہ سامان خاص قسم کے پلاسٹک، فائبر وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں جن کو بآسانی ضائع کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ یہ e۔ کچرا ہر سال ٹنوں اور منوں کی مقدار میں پس ماندہ ممالک کو چوری چھپے روانہ کر دیا جاتا ہے تاکہ اسے ڈسپوز (ٹھکانے) کیا جا سکے۔ ان کے ڈسپوزل کا عمل

پیش لفظ

بیسویں صدی کے پہلے پچاس سال گزرے تو یورپ میں انسانی مسائل کو نئے رخ سے دیکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ وجودیت اور جدیدیت پہ مکالمہ جاری تھا کہ ساختیاتی بحث نے فکری دھارے کو پھر اسی طرف موڑ دیا جہاں سیاق و تناظر اور جدلیات کی بحث کا سلسلہ منقطع ہوا تھا۔ یعنی متنی تشکیلات میں ثقافتی (تاریخی) مادیت کی اہمیت و کردار۔ نئے علمی و ادبی تناظر میں متن کی حیثیت واضح ہونے سے نفسیاتی محرکات کو بھی تسلیم کیا گیا اور یوں متن سیاق اور تناظر کی تثلیث مباحث کا حصہ بن گئی۔ اردو شعری تنقید نے روایت اور جدت میں توازن رکھنے کی (ہر ممکن) کوشش کی ہے لیکن فکشنل متون پہ مغربی تنقیدی فکریات کا اثر کافی گہرا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو روایتی ترکیب نحوی سے رگڑ کھاتے وہ سوالات ہیں جو آئیڈیالوجی پہ 'ارتکاز' کرتے نیا محاورہ تشکیل دینے پہ مصر ہیں۔ لیکن ستم ظریفی یہ کہ ہنوز آئیڈیالوجی کی تعریف وضاحت طلب ہے۔ علامتی اور استعاراتی زبان میں موجود (تشکیکی) کلامیہ ثقافتی ہچکچاہٹ کا شکار نظر آتا ہے۔ اس تنقیدی التباس میں جملے کی جمالیاتی ترجیحات تصور انسان اور تصورِ متن کو دھندلانے میں پیش پیش رہیں۔ دوسری وجہ (تنقیدی تحدید کے سبب) 'نئی نوانسانیات' میں عورت کی آواز کی شمولیت سے عبارت ہے۔ مروج تنقید میں، عورت کے بدن کی نسبت سے ہر قسم کی رومانوی، جمالیاتی اور مزاحیاتی کیمیاگری قابل قبول ہے لیکن جہاں تک عورت کی سماجی حیثیت اور اس کی ''ادرنگ'' کا تعلق ہے تو عام طور پہ ردعمل بہت ٹھوس اور روایتی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں

اتنا آسان اور بے ضرر نہیں ہوتا علاوہ ازیں ان میں پلاسٹک / فائبر کے علاوہ دیگر دھاتیں بھی ہوتی ہیں جو انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اسی طرح بڑے بڑے ناکارہ بحری جہازوں کو توڑنا اور اسے بھی ٹھکانے لگانا ایک مسئلہ ہے۔ اس سے بھی ہوا اور پانی کی آلودگی بڑھتی ہے۔ ایسے ہی جہازوں کا دنیا کا سب سے بڑا قبرستان ہندوستان (گجرات) میں ہے۔ یہاں پلاسٹک کی تھیلیوں اور اسی قسم کی چیزوں کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ جن کے بے روک استعمال نے بڑے ماحولیاتی مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ ممبئی کے سیلاب کے اتنے تباہ کن شکل اختیار کر لینے میں کہیں نہ کہیں ان پلاسٹک کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی ضمن میں قطبین اور خلا کی بڑھتی آلودگی کو بھی خارج از بحث قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ دونوں علاقے اور ہمالیہ کے ناقابلِ عبور علاقے جو کل تک انسانی دسترس سے محفوظ تھے آج وہ بھی آلودگی کا شکار ہو چکے ہیں۔

اس طرح مختلف قسم کی آلودگیوں نے اس حسین و جمیل کرۂ ارض کو کچھ اس طرح اپنے شکنجے میں کس لیا ہے کہ پورا ماحولیاتی نظام لڑکھڑا گیا ہے۔ اس میں بسنے والے چاہے وہ جانور ہوں پودے یا انسان سبھی اس کی گرفت میں ہیں۔ اس کے نتیجے میں آج انسانوں کے سامنے کئی سنگین مسائل آ کھڑے ہوئے ہیں جیسے جنگلات کی بربادی، چراگاہوں کا خاتمہ، قدرتی وسائل کی کمی، توانائی کا بحران، اوزون کی تہہ میں شگاف، عالمی حدّت، جنگلی جانوروں کی نسل کا ناپید ہو جانا، موسموں میں تبدیلی، قدرتی آفات میں اضافہ، تابکار اور زہریلے مادوں کا انتشار وغیرہ۔ دیہی آبادی کی شہروں کو ہجرت نے بھی کئی مسائل کو جنم دیا ہے۔ سائنسی ترقی نے دنیا کے سبھی علاقوں / ممالک کو قریب تر کر دیا ہے۔ اب دور دراز کے علاقے بھی ہمارے لیے اجنبی نہیں رہے۔ تابکار مشین ٹکنالوجی نے مغربی کلچر سے ہندوستان جیسے روایت پسند قدیم ملک میں تہذیبی آلودگی کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ مجلس، معاشرت، لباس، خوراک آرٹ، فلم، کلچر ادب غرض ہر چیز مغرب سے ہر طرح متاثر ہو رہی ہے۔ اسی طرز فکر نے ذہنوں اور خیالات کو بھی آلودہ کر دیا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی آلودگی ہے۔ جس کی زد میں ہمارا معاشرہ ہے۔

مختصر یہ کہ آلودگی ایک ایسا سلگتا مسئلہ بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہے جس سے نبرد آزما ہونا اسی صورت میں ممکن ہے جب عوام، سیاست داں، ممالک رضا کار انجمنیں اور اقوام متحدہ اس مسئلے کی سنجیدگی کو محسوس کریں اور پوری دیانت کے ساتھ اس کے خلاف محاذ بنا کر باقاعدہ جنگ کا آغاز کریں۔ انسان ترقیوں کے عروج پر کیوں نہ پہنچ جائے وہ اپنی اس زمین، یہاں کے ماحول سے الگ نہیں رہ سکتا۔ ماحول کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ دوسرے جانور/ پودے اپنے وجود کے لیے انسانوں کے محتاج نہیں مگر انسان کو قدم قدم پر ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات تبھی کہلائے گا جب وہ ان کا یعنی ماحول کا احترام کرنا سیکھ جائے گا۔

دنیا میں حکومتیں ماحولیاتی تحفظ کے لیے ادارے بناتی ہیں تاکہ عوام کو زندگی کی بہترین سہولیات مہیا کر سکیں۔ فضا کے ساتھ ساتھ زمینی یعنی ارضی آلودگی بھی صحت کے لیے اتنی ہی خطرناک ہے جتنی کہ فضائی آلودگی۔ کوڑا کرکٹ، گندگی اور بیماریاں پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ آلودگی کی تمام اقسام سے بچنے کیلئے حکومت شہر کو صاف ستھرا رکھنے کیلئے بہتر اقدامات کرے اور عوام بھی صفائی کا خاص خیال رکھیں تاکہ ہمارا شہر ماحولیاتی آلودگی سے پاک ہو جائے- دنیا کے تمام مذاہب نے ہمیشہ طبیعت اور قدرتی ماحول کے بارے میں انسان کی ذمہ داری کے احساس اور انسان اور ماحولیات کے درمیان توازن برقرار رکھنے پر تاکید کی ہے کیونکہ اس توازن کا خاتمہ ہی ماحولیات کے سلسلے میں مشکلات پیدا ہونے کا اصلی سبب ہے۔ مختلف ممالک کے تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی ماحولیاتی مشکلات کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ماحولیات کا مسئلہ اس حکومت یا اس حکومت یا اس شخص یا اس شخص یا اس گروہ یا اس گروہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک قومی اور ملکی مسئلہ ہے اور اس سے متعلق مشکلات کو حل کرنے کے لئے سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ صبر و حوصلہ، تدبیر اور پیہم تلاش کے ذریعہ یہ مشکلات قابل حل ہیں۔ پانی اور خاک کو ماحولیات کے تین اصلی عناصر قرار دیتے ہوئے فرمایا: بڑے شہروں میں ہوا کی آلودگی اور گرد و غبار جیسے مسائل کو حل کرنے اور اسی طرح پانی کی کمی اور مٹی کے کٹاؤ کے سلسلے میں تبلیغ و اشاعت

سے کہیں زیادہ عملی اور سنجیدہ اقدامات انجام دینے کی ضرورت ہے۔ ماحولیات کے لئے قومی سند کو تیار کرنا، تمام تعمیراتی، صنعتی اور تجارتی منصوبوں کے ساتھ ماحولیات کی سند کو منسلک کرنا، ماحولیات کی تخریب کو جرم قرار دینے کے لئے قانون پر نظر ثانی کرنا، مفاد پرست اور قانون توڑنے والے افراد کا مقابلہ اور ماحولیات کی حفاظت کے لئے نگرانی اور چوکسی کو مؤثر بنانا ایسے اقدامات ہیں جن کے ذریعہ ماحولیات کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔

ماحولیات سے خواتین کی وابستگی:

عورت اور فطرت کے درمیان ہمیشہ ایک مضبوط رشتہ رہا ہے جس کے ماخذ اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ دنیا کے تمام ''لوک ادب'' میں زمین ماں (ماتر بھومی) سمجھی جاتی ہے۔ زمین ایک ایسی مشفق ماں ہے، جو نہ صرف نچھاور کرنا جانتی ہے۔ بلکہ ایک نا مکمل تاریک دنیا میں ارتقائی امکانات کی روشنی لانے کی کوشش کرتی ہے۔ زمانہ قدیم میں دھرتی ماں یا مادر ارض کو مکمل عورت سمجھا جاتا تھا اور اسے بہت بڑی دیوی کی حیثیت حاصل تھی۔ مرکندیہ ایران میں یہ دیوی یوں خطاب کرتی ہے

> ''اس کے بعد میں ساری دنیا کو حیات بخش سبزیوں سے نواز دونگی
> ان سبزیوں کو تیز بارش میں اپنے جسم سے اگاؤنگی اور ہریالی پیدا
> کرنے والی کہلاؤنگی''

جنگلات کی کٹائی، ایندھن، چارے، اور پانی کی قلت، کووں کی آلودگی وہ ماحولیاتی مسائل ہیں جن کا براہ راست تعلق عورتوں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماحول سے وابستگی خواتین کی حیاتیات اور فطرت میں دیکھا جاسکتا ہے۔

تقریباً پانچ ہزار قبل مسیح کے لوک گیت جو غالباً سینہ بسینہ اور نسل در نسل منتقل ہوتے رہے ہیں اس مادر کائنات کی تعریف میں ہیں جو درختوں، پودوں حتیٰ کہ دیوی، دیوتاؤں کو پیدا کرتی ہے اور کوئی بڑے سے بڑا دیوتا بھی اس کے امور میں مداخلت کرتا

ہے تو اسے سخت سزا دیتی ہے۔ ذہن ذرا آگے بڑھا اور بہار و خزاں کے مناظر کا بغور مشاہدہ ہوا تو دو اور دیویوں نے جنم لیا، بہار کی علامت، محبت اور افزائش کی دیوی عشتار اور موت اور ظلمات کی دیوی ''اریش گل'' جسے ہندو دیو مالا میں درگا، کالی، یا چنڈی کا نام دیا گیا ہے۔ عشتار کی حیثیت آفاقی ہے اور یہ اس وقت کی آباد دنیا میں مختلف ناموں سے ہر جگہ موجود رہی ہے۔ یہ سومیری دیو مالا میں انا ہے، عکادی اور اشوری میں عشتار، فونیقی دیو مالا میں اشیر دت ہے۔ ایرانی دیو مالا میں شالا اور نانیا ہے، ہندو دیو مالا میں اما، اوشا، سرسوتی اور رتی ہے۔ یونانی دیو مالا میں ایفرودتی اور آرتمیس ہے۔ عربی اساطیر میں یہی دیوی زہرہ اور مشتری ہے۔

عورت نے جب فطرت کا بغور مشاہدہ کیا تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ نباتات بیج سے اُگتے ہے۔ اس نے فطرت کے عمیق مطالعہ سے زراعت کا ہنر ایجاد کیا اور تمدن کو ایک بہت بڑے انقلاب سے دوچار کر دیا۔ اس نے زمین کی فیاضی کو دریافت کیا جو انسانی تہذیب کے ارتقاء کا سبب بنا۔ اس نے آگے چل کر آگ اور اس کی افادیت سے بھی آگاہی حاصل کر لی اور تمدن ایک اور عظیم تر انقلاب سے دوچار ہوا۔ آگ کی دریافت سے درندگی گھٹ گئی آگ اور زراعت کی بدولت انسان شکار کے تعاقب سے آزاد ہو گیا۔ پکانے کے عمل سے ہزاروں ناقابل ہضم پودوں کے خام حالت سے چھوٹے خلیے اور نشاستے کھانے کے قابل ہو گئے اور انسان زیادہ سے زیادہ اناج اور سبزیوں کی طرف رغبت کرتا گیا'' یہی وجہ ہے کہ سینا پرونا، سوت کاٹ کر کپڑا تیار کرنا، ٹوکری سازی، برتن سازی، کشیدہ کاری، پھولکاری، اور دستکاری عورتوں سے منسوب ہیں۔ پیدائش، پرورش اور افزائش زراعت میں ہو یا نسل انسانی میں عورت کا کارنامہ ہے۔ اس لئے اسے تمام تر قوت و اختیار کا سرچشمہ قرار دیا گیا یوں ''اموی'' یا ''مادرسری نظام'' رائج ہوا یہ نظام اس وقت کی آباد دنیا مصر، عراق، یونان، ایشیائے کوچک اور وادی سندھ میں صدیوں قائم رہا یہی علاقے تہذیب و تمدن کے ابتدائی گہوارے تھے مصر میں فراعنہ کے عہد تک تخت و تاج کی حقیقی مالک اور معابد کی مہاپرہت ملکہ ہی کو سمجھا جاتا تھا۔

فراعنہ کو ملکہ کے ساتھ شادی کر کے ثانوی اقتدار نصیب ہوتا تھا مادر سری دور میں وراثت ماں کی طرف سے ملتی تھی۔ آج بھی بعض قبائل اسی تمدن کے حامل ہیں۔ اسی دور میں زمین کو اناج اُگانے کے باعث عورت سے مشابہت دے کر ''مادر ارض'' یا ''دھرتی ماتا'' کا لقب دیا گیا اس زمانے کے لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ زمین کا تخلیقی عمل اور عورت کا تخلیقی عمل ایک ہی حقیقت کے دو مظاہر ہیں۔ لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ صرف عورتیں ہی بہتر فصل اُگا سکتی ہیں۔ اسی دور میں عورت کی مورتیاں تراشی گئیں جنہیں فصلوں میں برکت ڈالنے کے لئے مختلف موسموں میں پوجا گیا۔ اس حقیقت سے تو ہم واقف ہیں کہ وادی سندھ اور بلوچستان میں جو مورتیاں نکلی ہیں ویسی ہی مورتیاں عراق، شام، فلسطین، قرض، بلقان، ایران اور مصر میں کائنات یا قدرت کی دیوی کی ہیں، وادی سندھ کی مورتیاں مغربی ایشیاء کی مورتیوں کی طرح سماج کے مادر سری دور میں وجود پذیر ہوئی ہونگی۔ ہڑپہ کی کھدائی سے برآمد ہونے والی تین ہزار برس پرانی مہریں بھی اسی کی تصدیق کرتی ہیں ان میں عورتوں کو ہی پودوں کے نامیاتی عمل کی علامت بتایا گیا ہے۔

انسانی زندگی کی بقاء کا انحصار پانی پر ہے اور صرف انسان ہی نہیں حیوانات، جنگلات سبھی کا انحصار پانی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین کا دو تہائی حصہ پانی اور ایک تہائی خشکی پر مشتمل ہے۔ انسانی جسم کا زیادہ حصہ بھی پانی پر مشتمل ہے لیکن دنیا کے بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں پانی نایاب یا کم یاب ہے۔ جہاں عورتیں دور دراز علاقوں سے پانی لاتی ہیں، جہاں عوام کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں۔ کارخانوں کی چمنیوں سے نکلتا ہوا دھواں ان سے خارج شدہ زہریلا کیمیکل ملے پانی نے دریاؤں، نہروں، سمندروں کو آلودہ کر دیا ہے۔ جہاں دریا، ندیاں، چشمے، تالاب، انتہا درجے کی آلودگی کا شکار ہیں۔ دیہی علاقوں میں خواتین اس سے براہ راست متاثر ہوتی ہیں۔

آلودگی اور ماحولیات میں گہرا تعلق ہے۔ اس سے جنگلی حیات اور جنگل بھی متاثر ہو رہے ہیں دنیا بھر میں جنگلات میں تیزی سے کمی آ رہی ہے۔ جنوبی امریکا میں ایمزون کا خطہ 70 لاکھ کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے جس میں 390 بلین ارب درخت پائے

جاتے ہیں۔ 90ء کی دہائی میں ایمزون کے جنگلات کے ایک بڑے حصے کا خاتمہ ہو گیا جس کا رقبہ تین ملکوں کے برابر تھا یعنی 6 لاکھ مربع کلومیٹر۔ ہوسکتا ہے کہ بیشتر لوگوں کو پتہ نہ ہو کہ ایمزون کے جنگلات کی کیا اہمیت ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ یہ جنگلات دنیا کی 60 فیصد آکسیجن مہیا کرتے ہیں۔ اس لیے ان جنگلات کا تحفظ پوری دنیا کی ذمے داری ہے۔ ہم ماحولیات کے حوالے سے جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں ہمیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جنگلات کو خطرے میں ڈالنے کا مطلب انسانوں کی زندگی کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ بے پناہ صنعتی ترقی کی ''برکت'' نے فضا کو ایسے زہریلے عناصر سے آلودہ کر دیا ہے جو بارش ہونے کی صورت میں جنگلات پر تیزابی پانی پھینک کر ان کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ چین میں درجہ حرارت باقی دنیا کے مقابلے چار گناہ زیادہ ہے۔ اس کے نتیجے میں چین کے موسم میں تباہ کن تبدیلیاں آئی ہیں۔ بڑھتے ہوئے درجہ حرارت کی وجہ سے گلیشیئر کے پگھلنے کی رفتار میں انتہائی تیزی آ گئی ہے۔ آخر کار ان کا نتیجہ گلیشیر کے خاتمے کے نتیجے میں نکلے گا اور طویل مدت میں ایشین دریا جس میں دریائے سندھ، گنگا شامل ہیں خشک ہو جائیں گے۔ خطرہ ہے کہ ہمالین گلیشیئر 2035ء تک پگھل جائیں گے جو پانی دریاوں کو مہیا کرتے ہیں۔ اگر یہی صورتحال رہی تو ہمالیہ اور انٹارٹیکا کی برف 2060ء تک پگھل جائے گی نتیجتاً بے تحاشا سیلاب آئیں گے۔ سمندر کی سطح میں اضافے سے ساحلی شہر ڈوب جائیں گے۔ یہاں تک کہ ہمالیہ کے پہاڑ سبزے سے خالی پتھریلے پہاڑ رہ جائیں گے۔ ایمزون اور مشرق بعید کے جنگلات جو بنگلہ دیش، برما، تھائی لینڈ لاؤس، کمبوڈیا، ویت نام، ملائشیا، انڈونیشیا تک پھیلے ہوئے ہیں کو نہ بچایا گیا تو دنیا کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ ترقی یافتہ ملکوں کے درمیان صنعتی ترقی کی دوڑ نے انسانیت کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ چین کے شہروں میں آلودگی کا تناسب اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ لوگ منہ پر ماسک لگانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی 2012ء کی رپورٹ کے مطابق فضائی آلودگی کی وجہ سے 70 لاکھ لوگ مر چکے ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی جنگلات کا خاتمہ اور کوئلہ کا غیر ضروری استعمال اوزون کا

خاتمہ کر رہا ہے۔ اوزون کی تہہ 50ء کی دہائی سے متاثر ہونا شروع ہوئی۔ اوزون انسانی زندگیوں کی اس طرح حفاظت کرتی ہے کہ سورج کی مضر صحت شعاؤں کو فلٹر کر کے ہمیں محفوظ بناتی ہے۔ اب اوزون کو بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ صنعتی ترقی کی رفتار کو کم کیا جائے ترقی یافتہ ملکوں میں۔ جب کہ سائنس دانوں کی ایک تعداد تو یہ بھی تجویز کرتی ہے کہ ہے کہ ہر طرح کی صنعتی ترقی پر پابندی لگا دی جائے اور جو ترقی ہو چکی ہے اسی پر اکتفا کیا جائے۔ یعنی ایک طرح سے ماضی کی طرف مراجعت!!

ماحولیات کے ضمن میں جنگلی حیات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے جس کا انسانوں کے ہاتھوں قتل عام ہو رہا ہے۔ 1900ء کے قریب کئی لاکھ گینڈے جنوبی افریقہ میں پائے جاتے تھے۔ جن کی تعداد 90ء کی دہائی کے شروع میں ڈھائی ہزار سے بھی کم رہ گئی۔ اندازہ کریں انسانوں کی وحشت و بربریت کا گینڈوں کی کئی اقسام ہیں۔ ان کی ایک قسم ناپید ہو گئی ہے۔ جب کہ سفید شمالی گینڈے جن کی تعداد صرف پانچ رہ گئی ہے ختم ہونے والے ہیں۔ لاہور چڑیا گھر جو برصغیر کا سب سے پرانا چڑیا گھر ہے وہاں پر بھی ایک گینڈا رہ گیا ہے۔ گینڈوں کے سینگوں کی غیر قانونی تجارت ان کے لیے ایک عظیم خطرہ بن گئی ہے۔ کیونکہ اس کے سینگوں سے قیمتی اشیاء اور دوائیاں بنتی ہیں۔ چین گینڈوں کے سینگوں کا سب سے بڑا درآمد کنندہ ہے۔

چائنیز روایتی جنسی ادویات میں ان کا استعمال ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان گینڈوں کے سینگوں کی قیمت پچاس ہزار ڈالر فی کلوگرام تک پہنچ گئی۔ پندرھویں صدی تک موجودہ پاکستان میں بھی گینڈے پائے جاتے تھے۔ لاہور سے بہاولپور تک کے علاقے میں۔ بابر بادشاہ اور اس کے فوجیوں نے اس بڑے پیمانے پر ان کا شکار کیا کہ وہ ناپید ہو گئے۔ انگریزوں کی آمد نے بھارتی علاقے سے بھی گینڈوں کا تقریباً صفایا کر دیا۔

بڑے قوی الجثہ جانوروں میں سے ہاتھی بھی ناپید ہو رہا ہے جن کی تعداد تیس لاکھ سے گر کر ساڑھے چار لاکھ سے بھی کم رہ گئی ہے۔ انسانوں کے ہاتھوں بندوق اور جدید اسلحہ کے استعمال نے بے بس جنگلی حیات کو دنیا سے ناپید ہونے کے قریب پہنچا دیا

ہے۔اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انسان خود اپنا کتنا بڑا دشمن ہے اور کس بے رحمی سے اپنے ہی گھر دنیا کو تباہ کر رہا ہے۔ دنیا کی تباہی اس وقت ہی رک سکتی ہے جب ہر انسان اسے اپنے گھر جیسا سمجھے دشمن کا نہیں۔

عورتوں نے اس خطرے کو سب سے پہلے محسوس کیا اور ماحولیاتی آلودگی کے خلاف عوامی تحریکیں شروع کیں تا کہ صنعتی ترقی سے پیدا شدہ انسانیت کے اس خطرے سے زور آزمائی کی جا سکے۔اور ماحولیاتی آلودگی کے تناسب کو کم کیا جا سکے۔

ماحولیاتی آلودگی اور عوامی تحریکیں

ماحولیاتی آلودگی کے خلاف خواتین کی عوامی تحریک نے عوام کو سماجی شجر کاری کی طرف مختلف طریقوں سے راغب کرنے کی کوشش کی۔خواتین کی یہ عوامی تحریکیں لوگوں کو جنگلاتی دولت کو کفایت شعاری سے استعمال کرنے کی تعلیم دیتی ہیں تا کہ وہ کاٹے گئے ہر درخت کے بدلے دو درخت اُگائیں۔خواتین کی ان عوامی مہم نے مقامی حالات اور تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اسے جاری رکھنے کی کوشش کی۔ان کا ماننا ہے کہ عام لوگ اگر ایک بار جنگلات اور جانوروں کی اہمیت کو سمجھ لیں تو پھر یہ کام کوئی مشکل نہیں رہ جائے گا۔انسانی عقل و دانش کا تقاضہ ہے کہ انسان خود بھی اس ماحول کا ایک حصّہ بن جائے اور اپنی فہم اور فراست کو استعمال کرتے ہوئے اس دنیا کو جنت کا نمونہ بنائے۔ جنگلی جانوروں اور جنگلوں کی بربادی خود انسان کی بربادی بلکہ اس کی بقاء کے لیے ایک خطرہ بن سکتی ہے اس لیے اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وہ اب بھی اس سلسلے میں ٹھوس قدم اٹھائے تا کہ صورتِ حال مزید خراب ہونے سے بچ جائے۔ ہماری گنجان شہری آبادیوں میں کنکریٹ، لوہے، پتھر اور شیشے سے بنی بلند و بالا عمارات، موٹر گاڑیوں کے کثیف دھوئیں اور بے پناہ شور ہمارے ماحولیاتی توازن کو درہم برہم کرنے کا سبب ہیں۔ اس طرز زندگی کی جملہ خرابیوں سے آگہی کے باوجود ہم اپنی معاشی اور سماجی مجبوریوں کے باعث اس سے یکسر انکار نہیں کر سکتے۔لیکن ماحولیاتی آلودگی کے خلاف

عوامی تحریکیں امید کی ایک کرن ہے۔

چپکو تحریک:

۲۶ مارچ ۱۹۷۴، کو بھارت کی ریاست اتراکھنڈ کے ضلع چمولی کے علاقے ہموال گھاٹی کے ایک دور دراز گاؤں 'رینی' کی باہمت اور پرعزم کسان خواتین نے جنگل کے ٹھیکیداروں اور سرکاری افسران کی ہر عیاری اور دھونس دھاندلی کو ناکام بنایا، جنگل کے ٹھیکیداروں نے درختوں کی کٹائی کے لئے ایک ایسے دن کا انتخاب کیا جب گاؤں کے سب مرد گاؤں سے دور کسی سرکاری دفتر سے اپنے واجبات کی وصولی کے لئے گئے ہوئے تھے اور ان کا خیال تھا عورتیں کتنی اور کب تک مزاحمت کر سکیں گی لیکن ان کا یہ خیال ایک خواب ثابت ہوا اور ہر طرح کے خوف اور لالچ سے بے نیاز کسان خواتین آخری حربے کے طور پر اپنے درختوں سے لپٹ گئیں اور ان سے پہلے کٹنے کا اعلان کیا۔ سارا دن اور ساری رات ان کا پہرا دیا جب تک ان کے مرد اپنے گاؤں واپس نہ آ گئے۔ یہ تحریک اتنی مؤثر تھی کہ ہمالیہ کے پورے دامن میں لوگوں نے اسی کو اپنایا۔ یہ احتجاج برسوں کامیابی سے جاری رہا اور بل آخر ۱۹۸۰ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اگلے ۱۵ برسوں کے لئے (جب تک پورا علاقہ پھر سے سرسبز نہ ہو جائے) پورے ہمالین ریجن میں درختوں کی کٹائی پر پابندی لگا دی اور پھر اسی تحریک نے عوام کی امنگوں سے قریب ترین جنگلات کی سرکاری پالیسی کو جنم دیا۔ تاریخ کی کتابوں میں عوام کی اپنے ماحول اور اپنے ہم وطن پودوں، درختوں سے محبت کی یہ داستان 'چپکو تحریک' کے نام سے جانی جاتی ہے۔

چپکو تحریک نے کچھ بڑے لیڈروں کو بھی جنم دیا جن میں بہت بڑی تعداد خواتین کی ہے۔ انہیں میں سے ایک لیڈر جناب سندر لال بہوگنا بھی ہیں جنہوں نے چپکو تحریک کو پھیلانے کے لئے ۱۹۸۱ سے ۱۹۸۳ تک ہمالیہ کے پورے دامن میں ۵۰۰۰ کلومیٹر کا پیدل مارچ کیا، ماحول دوستی اور جنگل کی حفاظت کی اہمیت سے سب کو آگاہ کیا۔ چپکو تحریک کی کامیابی کا راز اس میں عورتوں کی بڑی تعداد میں شمولیت کو مانا گیا

ہے۔عورتوں اور درختوں کا دیہاتی معیشت میں بہت اہم اور بنیادی کردار ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر سیمل کی مثال میں دیکھ چکے ہیں درخت کے تقریباً سبھی اجزاء پتے، جڑیں، چھال، تنا اور پھل پھول وغیرہ کسی نہ کسی مالی منافع کا باعث ہوتے ہیں، جانوروں کے چارے سے لے کر مزیدار پھل تک اور بیماری میں شفا اور دوا سے لے کر گھر کا چولہا روشن رکھنے تک سبھی کاموں میں مددگار ہوتے ہیں۔ دیہاتی زندگی کا کارخانہ، کسی بھی کھاتے میں درج نہ ہونے والی عورتوں کی جان توڑ محنت سے ہی چلتا ہے، منہ اندھیرے گائے بھینس کا دودھ دوھنے سے شروع ہونے والا دن گھر کے کام کاج کے علاوہ سارا دن کھیتوں میں مشقت پر ختم ہوتا ہے۔عوام کی معمولی سی ہلچل بھی ''چپکو تحریک'' کی سی صورت اختیار کرسکتی ہے۔

گرین بیلٹ تحریک

ماحولیاتی آلودگی کے خلاف عوامی تحریک میں عورتوں کی شراکت کی یہ دوسری عمدہ اور خوبصورت ترین مثال ہے۔اس تحریک کی ابتدا کینیا کی نوبل انعام یافتہ ''ونگری موتا متھائی'' نے اپنے چند خواتین دوستوں کے ساتھ مل کر 1977 میں اپنے آنگن میں سات درخت لگا کر شروع کی۔گرین بیلٹ تحریک کے زیر اثر 2005 تک ان درختوں کی کل تعداد 30 میلین تک پہنچ گئی۔نوبل انعام یافتہ ''ونگری موتا متھائی'' کے زیر قیادت شروع کی گئی اس تحریک کا مقصد نہ صرف کینیا کی فضائی آلودگی کو دور کرنا تھا بلکہ ''ویمن ایمپاورمنٹ'' کی بھی کوشش تھی۔شجر کاری کی اس تحریک میں مقامی درختوں اور پودوں کو فوقیت دی گئی۔

کینگ شی آن گرین پروجیکٹ تحریک

شمالی چین کے کینگ شی آن کی نوے ہزار ہیکٹر زمین شور زدہ، بنجر اور ناقابل استعمال تصور کی جاتی تھی اور اس پر کوئی بھی منافع بخش زرعی فصل کاشت نہ کی جاسکتی تھی۔

کوئی بھی علمی اور تحقیقی مکالمہ تنقیدی خندہ پیشانی پہ شکن کا سبب (اب بھی) بنتا ہے۔ایک طرف تو تحریمات کا جبر اور دوسری طرف پاپلور کلچر۔اس قسم کے علمی ماحول میں محدود آزادیِ اظہار ہی ممکن ہے۔شعری اور فکشنل مکانات میں ممکنہ بیبا کی کی سہولت موجود ہے لیکن براہ راست یعنی تنقید کے میدان میں ابھی بہت سے نظریاتی مسائل حائل ہیں۔ محدود ردتشکیلیت یا ساخت شکنی کے باوجود عورت نے اپنی زندگی، ماحول اور متن کو نسائی اور (کہیں) تانیثی نظر سے دیکھا ہے۔اس ضمن میں اردو میں بہت اچھے مضامین لکھے گئے جن میں ثقافتی سرگرمیوں اور افسانوی متون میں عورت کے استحصال اور اس کے پس پردہ محرکات کی تصویر کشی کی گئی۔اردو تحقیقی اور تنقیدی روایت میں ڈاکٹر نسترن فتیحی کی کتاب ''ایکوفیمینزم اور عصری تانیثی افسانہ'' نہایت اہم ہے۔تخلیق، تحقیق اور تنقید میں ڈاکٹر صاحبہ کا نام دنیائے ادب کے کسی خاص نظریاتی دھارے سے تعلق نہیں رکھتا۔ ان کا تصور ادب وہی ہے جو ان کا تصور انسان ہے۔نرکسیتی رہتل میں بسنے والے تقرر پسند انسان ان کے ردِ تشکیلی مطالعہ کا موضوع رہے ہیں۔لیکن ان کی تصانیف میں مخاطبہ نہیں مکالمہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ان کی اس فکری کاوش سے تنقیدی لٹمس ٹیسٹ کی آزادی کی نوید ملتی ہے۔یہ کتاب اس لئے بھی اہم ہے کہ اس میں ایکوفیمینزم کی رو سے اس روایت سے انحراف کیا ہے جس نے آئیڈیالوجی، طاقت، اجارہ داری اور نرپرستی کی فوقیت سے انسانیاتی تقسیم کو تقویت دی ہے۔لیکن ڈاکٹر نسترن نے اپنے تھیسز میں مرد کو قوسین نہیں کیا نہ ہی عورت کو روایتی کچن قلمرو کی باسی سمجھا۔یہاں عورت کی وہی لوکیل ہے جو مرد اپنی ریاست سمجھتا ہے۔یہ بات خوش آئند ہے کہ عورت اور ماحولیاتی مادریت میں تعلق پہ اردو تنقید سے جو متن سامنے آرہا ہے اس میں صورتِ حال، تجزیہ، منہاج اور نتائج بھی مختلف ہیں۔'تاریخی اختتام' جیسے مہانیوں نے سرمایہ دارانہ نظام کے آفاقی غلبہ پہ مہر تو ثبت کردی لیکن سماجی تجربات کے تنوع میں اینٹی تھیسز کی اہمیت اس گرہن کی زد میں نہیں آئی۔ بلکہ، اس کے برعکس، بیسویں صدی کے آخری حصے میں، نظریہ، ذہن، نصب، تاریخ اور انسان سازی میں ثقافتی اور لسانی طرفداریوں اور جانبداریوں کے

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

ویسے بھی محنت کرنے والے سب مرد روزگار کی تلاش میں شہروں کو جا چکے تھے ایسی ہی مایوس کن صورت حال میں چینی خواتین کی تنظیم نے تحفظ ماحول کی ملک گیر تحریک کا آغاز کیا۔ اسے گرین پروجیکٹ کا نام دیا گیا۔ اس نے واقعی انقلاب برپا کر دیا۔ بنجر اور شورزدہ علاقوں کی لئے مخصوص فصل 'جوار' بھی جہاں کاشت نہ کی جاسکتی تھی وہاں آج بیر کے باغات لہلہاتے ہیں اور اپنی کاشتکاروں کی آمدنی میں پانچ سو فیصد اضافہ بھی کر چکے ہیں۔ ۵۴ سے ۶۰ سال کی خواتین کی بھرپور شمولیت نے اس مہم کو اور بھی معنی خیز بنا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تینتس ہزار ہیکٹر زمین پر بیر کے باغات نظر آنے لگے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کینگ شی آن میں کاشت کاری کا ۷۰ فیصد کام خواتین انجام دیتی ہیں۔ خود انحصاری کے اس ولولہ انگیز عمل میں بہت سے حیران کن واقعات دیکھنے کو ملے، ایک بالکل ہی بنجر اور ناہموار قطعہ اراضی پر ایسی خواتین جو پہلے جسمانی محنت کا کوئی تجربہ نہ رکھتی تھیں باون ہزار بیر کے پودے لگانے کا کام سونپا گیا، اندازہ تھا کے یہ کام دو ماہ میں ختم ہوگا مگر اپنے قصبے کی قسمت بدلنے کے جذبے سے سرشار باہمت خواتین نے صرف بیس دن کی قلیل مدت میں ہی پورا کر لیا۔ آج وہاں بیر کی پیداوار بیس کلو فی درخت سے پچاس کلو پر جا پہنچی ہے اور بیر کی جڑوں کے بے مثال نظام کی بدولت زمین کی زرخیزی میں بے پناہ اضافہ ہوا اور اب گندم اور کپاس جیسی منافع بخش فصلات بھی کاشت ہو رہی ہیں جبکہ جنگل پر مشتمل رقبے میں اسی فیصد کا اضافہ ہو چکا ہے۔

نو دانیہ تحریک

نو دانیہ تحریک دراصل نو بیجوں والی ایک ایسی تحریک ہے جو آج کے ہائبریڈ طریقہ زراعت کے خلاف ایک نسوانی آواز ہے۔ یہ تحریک روائتی طرز زراعت کو فوقیت دیتی ہے تاکہ ماحولیاتی نظام کو درہم برہم کرنے کی کسی بھی کوشش کو روکا جا سکے۔ ان کا ماننا ہے کہ زراعت میں کیمیکلس کے استعمال کے باعث ماحولیاتی بگاڑ پیدا ہونے کا خدشہ ہے اور اگر روائتی طرز زراعت معدوم ہوگئی تو شدید بگاڑ پیدا ہوسکتا ہے کیوں کہ ایک

ماحولیاتی حیات کے خاتمے کے باعث حیاتیاتی نظام میں بگاڑ پیدا کرسکتا ہے۔اس تحریک کا ماننا ہے کہ ہنگامی بنیادوں پر ماحولیات اور روائتی طریقہ زراعت کے تحفظ کیلئے جامع منصوبہ بندی کے تحت کام کرنے کی ضرورت ہے۔

فری گین ازم

صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس کسی صاحبِ حیثیت خاتون یا مرد کو کوڑے دان سے کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرتا دیکھ کر آپ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو جائیں گے۔ کچھ عرصہ پہلے امریکیوں اور یورپی باشندوں کا بھی یہی حال تھا،لیکن ان ممالک میں ''فری گین ازم'' (Freeganism) کے بڑھتے رجحان کے بعد اب انھیں کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ امریکا اور یورپ میں ایسے ہزاروں لوگ ہیں، جنہیں 'فری گن'' (Freegan) کہا جاتا ہے۔فری گین ازم کی تحریک عالم گیریت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف امریکا میں نوے کی دہائی میں شروع ہوئی۔ اس تحریک سے وابستہ افراد 'فری گینرز' (freegans) کہلاتے ہیں۔ انھیں 'شہری خاکروب' (Urban Scavenger) اور 'اربن ڈائی ور' بھی کہا جاتا ہے۔فری گینرز نمود و نمایش کی چیزیں خریدنے سے اجتناب کرتے ہیں اور کوڑے دانوں میں پڑی استعمال شدہ اشیاء استعمال کرتے ہیں۔ وہ آپس میں بارٹر سسٹم (کرنسی استعمال کرنے کے بہ جائے چیزوں کا باہمی تبادلہ) کے تحت چیزوں کا لین دین کرتے ہیں۔فری گینرز بڑے فراخ دل اور انسان دوست ہوتے ہیں۔ وہ مادہ پرستی، لالچ، بے حسی اور خود غرضی کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔فری گینرز نے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی لوٹ کھسوٹ اور اس کی پروردہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے اندھے منافع کے خلاف احتجاجاً اشیائے صَرف خریدنے سے گریز کی راہ اپنا رکھی ہے۔ وہ ایسی کمپنیوں کے صارف بننے کو تیار نہیں جو انسانی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے چیزیں نہیں بناتیں بلکہ ان کا اصل اور واحد مقصد زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنا ہوتا ہے۔فری گینرز کے نزدیک دولت کمانے کی دھن میں یہ کمپنیاں ماحولیات کو تباہ و

برباد کر رہی ہیں، جانوروں کو بے دردی سے مار رہی ہیں اور مزدوروں کا استحصال کر رہی ہیں۔ ایسی کمپنیاں ہر روز لاکھوں ٹن غذا کوڑے دانوں میں پھینک دیتی ہیں لیکن کسی غریب کی بھوک دور نہیں کرتیں۔ فری گین ازم دو الفاظ Free (آزاد) اور Vagan (سبزی خور) کا مرکب ہے۔ یہ لفظ بڑی حد تک Veganism (سبزی خوری) سے ملتا جلتا ہے۔ فری گینر کا ماننا ہے کہ گوشت کے بائیکاٹ سے جانوروں کی جانیں بچائی جاسکتی ہیں، جنہیں گوشت فراہم کرنے والی کمپنیاں بڑی بے دردی سے ذبح کر رہی ہے۔ تاہم کوڑے دانوں میں کھانا تلاش کرنے والے سارے فری گینر سبزی خور نہیں ہوتے۔ ان میں بہت سے گوشت خور بھی ہیں، جو اپنے طرز عمل کی یہ دلیل دیتے ہیں کہ کوڑے دانوں سے حاصل کیا گیا گوشت استعمال کرنے سے کمپنی کو کوئی نفع نہیں ہوتا، کیوں کہ اُس نے اسے پہلے سے بے کار سمجھ کر پھینک دیا ہوتا ہے۔ لہٰذا کمپنی کی حوصلہ افزائی گوشت کھانے سے نہیں بل کہ اسے خریدنے سے ہوتی ہے۔ فری گین ازم کی تحریک، صارف مخالف نظریات کے طور پر دیکھی جاتی ہے۔ اس تحریک سے جُڑے افراد صارف بننے سے بچنے کے لیے متبادل ذرائع ڈھونڈتے ہیں۔ ان ذرائع میں کوڑے دانوں سے غذا تلاش کرنا، غیر آباد اور لاوارث مکانات میں مفت رہائش اختیار کرنا، جنگلات میں کھانے کے لائق جنگلی پھل اور جڑی بوٹیاں تلاش کرنا اور اپنے لان میں سبزیاں اور پھل کاشت کرنا وغیرہ شامل ہے ریستوراں میں ڈرم بجانے کا کام کرنے والے ایک امریکی، وارن اوکیس (OakesWarren) نے 1999 میں ایک پمفلٹ شایع کیا تھا، جس کا نام تھا، 'میں فری گن کیوں ہوں۔'' اس پمفلٹ میں اُس نے فری گین ازم کی تشریح کرتے ہوئے کھانے پینے کی اشیاء نہ خریدنے کی وجوہ بیان کرنے کے ساتھ ان اشیاء کو حاصل کرنے کے متبادل ذرائع کی بھی نشان دہی کی تھی۔ نیویارک میں رہنے والے ایک اور فری گن ایڈم ویسمین (Weissman Adam) کا شمار بھی فری گین ازم کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اس تحریک کا پرچار کرنے اور دیگر ممالک میں رہنے والے فری گینر کو اپنے ساتھ جوڑنے کے لیے 2003 میں

www.freegan.info کے نام سے ایک ویب سائٹ بنائی، جس کا نعرہ تھا، ''سرمایہ داری سے ذور قابل برداشت زندگی گزارنے کی استطاعت۔'' ویسمین، فری گین ازم تحریک کو خوراک کے ضیاع کے خلاف ایک ردعمل سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''فری گین ازم مختلف اقسام کے استحصال کا ذمے دار، سرمایہ دارانہ معیشت کو قرار دیتی ہے۔ مثلاً مزدوروں کا استحصال، جانوروں کا استحصال، ماحولیات میں بگاڑ پیدا کرنا، غربت اور بھوک میں اضافہ، قدرتی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، مختلف اقسام کی جنگوں کو انسانوں پر مسلط کرنا اور عورت کو تجارتی مال سمجھنے کا اصل ذمے دار سرمایہ دارنہ نظام ہے۔'' نیویارک سٹی میں فری گینرز اکثر ملاقات کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ ویسمین اپنی ویب سائٹ پر ملاقات کا شیڈول طے کرتے ہیں اور اس کے ذریعے نئے فری گینرز بنائے جاتے ہیں۔ ان ملاقاتوں میں فری گین ازم کے مسائل اور فلسفے پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ مزید متبادل ذرائع کی نشان دہی کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ملاقات کے اختتام پر تمام اراکین خوراک کی تلاش میں نئے علاقے 'کھوجنے' نکل پڑتے ہیں۔ اس مہم کو TourTrash کہا جاتا ہے۔ ویسمین کہتے ہیں۔

> ''میں کبھی بھوکا نہیں رہا، لوگ جس کھانے کو خراب سمجھ کر کوڑے دان میں پھینک دیتے ہیں، وہ ہمارے نزدیک صرف کھانے سے بھرپیکٹ ہوتے ہیں۔ جسے کھا کر زندہ رہا جا سکتا ہے۔ لوگ کھانے معاملے میں بہت زیادہ اسراف کرتے ہیں۔ کوڑے دان ہمیں صرف کھانا ہی مہیا نہیں کرتا، بل کہ اس میں سے بعض اوقات کام کی دیگر اشیاء بھی ہاتھ لگ جاتی ہیں۔ میں ان کوڑے دانوں سے کمپیوٹر، ٹیپ ریکارڈر اور کپڑے تک حاصل کر چکا ہوں۔''

امریکی ثقافت میں چوں کہ نیو برانڈ چیزوں کے استعمال کا زیادہ زور ہے۔ اس لیے لوگ پرانی لیکن کارآمد چیزیں پھینک دیتے ہیں، جنہیں ہم اپنے استعمال میں

لے آتے ہیں۔'' ایک محتاط اندازے کے مطابق ترقی یافتہ ممالک میں گھروں، ہوٹلوں، گوداموں اور فیکٹریوں میں کھانے کا ایک چوتھائی حصہ ضایع ہو جاتا ہے۔ چناں چہ ان ممالک کے مرکزی بازاروں اور بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹوروں کے باہر رکھے کوڑے دان، فری گینئر کی توجہ کا خاص مرکز ہوتے ہیں۔ رات کے وقت ان بازاروں سے زاید المیعاد اور معمولی نقص والی اشیاء بے کار سمجھ کر کوڑے دانوں میں پھینک دی جاتی ہیں۔ چناں چہ رات کو ان جگہوں پر فری گینئر کی آمد شروع ہو جاتی ہے، جو اپنی کمر پر بڑا بیگ لٹکائے، سائیکلوں پر سوار ہو کر یہاں پہنچتے ہیں۔ بعض اوقات انھیں کوڑے دانوں سے اتنی زیادہ غذا ہاتھ لگتی ہے کہ ان کا ہفتہ آرام سے گزر جاتا ہے اور ان چیزوں کو گھر لے جانے کے لئے انھیں کار استعمال کرنی پڑتی ہے۔ فری گینئر کا کہنا ہے کہ زاید المعیاد چیزوں کی تاریخ کو گزرے صرف ایک دن ہُوا ہوتا ہے اس لیے انھیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ امریکا اور یورپ میں کھانے کی تمام اشیاء سربہ مہر ڈبوں میں بند ہوتی ہیں یا نفاست کے ساتھ تھیلیوں میں پیک کی جاتی ہیں اس لیے کوڑے دان میں پھینکے جانے کے باوجود وہ خراب نہیں ہوتیں۔ کوڑے دانوں میں اعلیٰ کوالٹی کے پھل، دودھ کے ڈبے، جیلی، مکھن، سینڈوچ، نوڈلز، آلو، پیاز، لیموں، ڈبل روٹی، چائے کی پتی اور مختلف اقسام کی سبزیوں کے علاوہ آئس کریم، گوشت اور مچھلی کے تازہ پیکٹ بھی مل جاتے ہیں۔ یہ چیزیں اتنی تازہ ہوتی ہیں کہ فریز کی گئی آئس کریم، گوشت اور مچھلی کے پیکٹ کی ٹھنڈک پھینکے جانے کے بعد کافی دیر تک برقرار رہتی ہے۔ کوڑے دانوں سے خوراک ڈھونڈنے والوں کا نہ صرف گھر بار ہوتا ہے بل کہ وہ برسر روزگار بھی ہوتے ہیں۔ ان میں بعض ڈاکٹر اور انجینیر بھی ہیں۔ یہ لوگ بہ آسانی بازار سے چیزیں خرید سکتے ہیں لیکن انھوں نے فری گین ازم نظریات ایک خاص مقصد کے تحت اپنا رکھے ہیں، جس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ نیویارک میں رہنے والی میرلین کی معقول تنخواہ ہے، لیکن وہ گزشتہ دس برس سے فری گن کے طور پر زندگی بسر کر رہی ہے۔ میرلین کہتی ہے کہ فری گن بننے سے پہلے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں غیر ضروری چیزوں کی خریداری پر اتنا پیسہ برباد کر رہی ہوں۔ فری گین ازم سے

آگاہی ملی تو احساس ہُوا کہ کمپنیاں کس طرح اپنی چیزیں بیچ کر ہم سے پیسے بٹور رہی ہیں۔ میرلین کہتی ہیں، ''مرکزی بازار میں کوڑے دانوں میں پھینکی جانے والی چیزیں مضر صحت جان کر نہیں پھینکی جاتیں، بلکہ اس کی وجہ چیزوں کی ظاہری حالت کا خراب ہونا ہے۔ مثلاً بارہ عدد انڈوں کے سیکڑوں پیکٹ اس لیے پھینک دیے جاتے ہیں کہ ان کے اندر رکھا ہُوا ایک انڈا ٹوٹا ہوتا ہے، لیکن ہمارے لیے دیگر گیارہ انڈے استعمال کے قابل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر روز کٹی پھٹی اور دبی ہوئی پیکنگ والی اشیاء بھی کوڑے دانوں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ دکان داروں سے لوگ 100 یا 300 ڈالر کی چیزیں خریدتے ہیں، ہم ایک گھنٹے میں اتنے پیسوں کی اشیاء کوڑے دانوں سے اکٹھا کر لیتے ہیں اور انھیں کھا کر آج تک بیمار نہیں ہوئے۔'' اقوام متحدہ کے ادارے فوڑ ڈ اینڈ ایگری کلچر آرگنائزیشن کے مطابق 2010 میں دنیا کے 92 کروڑ 50 لاکھ افراد کو کم خوراکی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف ستم ظریفی یہ ہے کہ ادارے تحفظ ماحولیات کے مطابق امریکا میں ہر سال ایک چوتھائی غذا یعنی 96 بلین پاؤنڈ کھانا پھینک دیا جاتا ہے۔ اس طرح برطانیہ میں ہر سال 17 ملین ٹن غذا ضائع ہو جاتی ہے، جس میں سے آدھی غذا استعمال کے قابل ہوتی ہے۔ امریکا میں سب سے بڑی خوراک کی صنعت ہے، اس کے باوجود 3 کروڑ امریکیوں کو پوری خوراک نہیں مل پاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکا کی 95 فی صد خوراک ملٹی نیشنل کمپنیاں تیار کرتی ہیں اور خوراک کے شعبے پر ان کمپنیوں کی اجارہ داری قایم ہے۔ امریکی ریاست ٹینیسی کے شہر ناشویلی میں رہائش پذیر ڈینیل اور امینڈا پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر اور انجینیر ہیں۔ وہ چند برس سے فری گن کے طور پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ 2008 میں امریکی ٹی وی کے مشہور پروگرام 'اوپرا ونفری شو' میں فری گین ازم پر ایک پروگرام پیش کیا گیا تو اس شو میں دیگر فری گینر کے ساتھ ڈینیل اور امینڈا بھی شریک ہوئے۔ اس شو میں ان کا گھر دکھایا گیا، جہاں ایسی چیزوں کا ڈھیر نظر آیا، جو کوڑے دانوں سے حاصل کی گئی تھیں۔ ان چیزوں میں کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ فرنیچر، قالین، دو ہزار لفافے اور میک اپ کا سامان بھی تھا۔ ڈینیل اور امینڈا نے لوگوں

کی فضول خرچی اور چیزوں کے ضیاع کے خلاف فری گن بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ ڈینیل کہتے ہیں، ''میرے خیال میں ہم امریکی قوم دنیا کی پانچ فی صد آبادی ہے، لیکن ہم دنیا کے تیس فی صد وسائل خرچ کر رہے ہیں۔ ہمیں اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ ہمارا طرز عمل دوسرے لوگوں کے لیے کہیں تکلیف کا باعث تو نہیں بن رہا۔'' کھانے پینے اور استعمال کی دیگر اشیاء تلاش کرنے کے لیے فری گینر کے لیے کوڑے دانوں کے علاوہ دوسرا بڑا میدان جنگل یا وہ ہرے بھرے میدان ہیں جو انھیں پھل، جڑی بوٹیاں اور دوسری صحت بخش نباتات فراہم کرتے ہیں۔ پارک وغیرہ میں ایسے عارضی مفت بازار (Market Free Realy Realy) بھی لگائے جاتے ہیں، جہاں فری گینر اپنے استعمال میں نہ آنے والی چیزوں کا بارٹر سسٹم کے تحت تبادلہ کرتے ہیں۔ اس بازار میں چیزوں کی لین دین کے علاوہ لوگ اپنی بعض خدمات مفت فراہم کرتے ہیں۔ ان خدمات میں تفریح مہیا کرنا، لوگوں کی مفت حجامت بنانا اور مساج وغیرہ شامل ہے۔ اس طرح کے بازار سب سے پہلے 2004 میں میامی، فلوریڈا اور شمالی کیرولینا میں عالم گیریت کے مخالفین نے 'جی ایٹ' اجلاس کے موقع پر احتجاجاً لگائے تھے۔ بعد ازاں مفت بازار کا رجحان پورے امریکا میں پھیلتا چلا گیا۔ فری گینر اپنے گھر کے لان اور چھتوں پر سبزیاں اُگاتے ہیں اور پھلوں کے باغ لگاتے ہیں۔ اس طریقے سے بھی وہ صارف بننے سے بچ جاتے ہیں۔ فری گینر ماحول دوست ہوتے ہیں۔ وہ ان چیزوں کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں جن سے ماحولیات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا اس میں پیسے خرچ ہوتے ہوں۔ وہ سفر کے لیے زیادہ تر سائیکل استعمال کرتے ہیں تاکہ پیسوں کی بچت ہو سکے۔ ٹرانسپورٹ کا کرایہ بچانے کے لیے وہ لفٹ مانگتے ہیں اور ٹرینوں کی چھتوں پر سفر کرتے ہیں۔ بجلی کی بچت کے لیے شمسی توانائی سے کام چلاتے ہیں اور شیشے کے گلاس کے بجائے اسٹیل کے گلاس استعمال کرتے ہیں۔ فری گینر بڑھتی ہوئی آبادی کو ماحولیات کے لیے خطرہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زیادہ آبادی کا مطلب زیادہ جنگلات کی کٹائی اور پانی اور ہوا کو آلودہ کرنا ہے۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ

رہائش انسان کا فطری حق ہے لیکن مہنگائی کے باعث لاکھوں افراد گھر نہیں خرید سکتے ،لہٰذا مکان کو بازار کی جنس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے بے گھر افراد کو مفت مکان فراہم کرنے چاہئے۔ اس نظریے کے پیش نظر فری گینرز ایسے مکانات اور عمارتوں میں رہائش اختیار کرنا جائز سمجھتے ہیں جن کا کوئی قانونی وارث یا دعوے دار نہیں ہوتا۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری اور اس کے سبب بڑھتی ہوئی مہنگائی کے باعث امریکا اور یورپ میں فری گین ازم کی تحریک تیزی سے مقبول ہو رہی ہے۔ تیسری دنیا کے عوام بھی ان وجوہ سے پریشان ہیں لیکن وہ فری گینرز کی طرح کوڑے دانوں سے غذا تلاش کرنے کا تصور نہیں کر سکتے ، یہاں کے کوڑے دان، امریکا اور یورپ کے کوڑے دانوں کی طرح صاف ستھرے نہیں ہوتے اور کھانے پینے کی چیزیں پیک کر کے فروخت نہیں کی جاتیں۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ۔ تیسری دنیا میں معیار پر زور نہیں دیا جاتا کہ دکان دار اور بڑے اسٹورز کے مالکان معمولی نقص والی چیزیں کوڑے دانوں میں پھینک دیں، جو فری گینرز کی خوراک بن سکے۔ لیکن۔ تیسری دنیا کے عوام فری گین ازم کے کچھ طریقوں پر عمل پیرا ہو کر بڑی حد تک اپنی زندگی سہل بنا سکتے ہیں۔ وہ فری گینرز کی طرح صحن اور چھتوں پر سبزیاں اُگا سکتے ہیں، موٹر سائیکل یا بسوں میں سفر کرنے کے بہ جائے سائیکل استعمال کر کے کرایہ اور پیٹرول بچا سکتے ہیں۔ نئی چیزیں خریدنے کے مقابلے میں استعمال شدہ اشیاء سستے داموں خرید کر بچت کر سکتے ہیں۔ اس طرح فری گین ازم پر عمل درآمد کر کے عوام اپنے گھریلو بجٹ کو کچھ حد تک 'فری' کر سکتے ہیں۔

آج گرد و پیش میں موجود تمام ترقی انسانی عظمتوں اور رفعتوں کے گن گاتی نظر آتی ہے۔ یہ دور ایک طرف تو سائنسی ترقی کی غمازی کرتا ہے تو دوسری طرف انسانیت کی بنیادی اقدار کی تنزلی کا شکار نظر آتا ہے ایک طرف یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ سائنسی ایجادات نے انسانی زندگی کو بہت بلند اور طرز زندگی کو ماضی کے مقابلے میں بہت آسان بنا دیا ہے۔ اور دوسری جانب انسانی زندگی کیلئے اتنی ہی مشکلات میں اضافہ کیا ہے۔ اس برسر پیکار ترقی اور شعبہ ہائے زندگی میں ہونے والی کیمیائی ،طبعی، حیاتیاتی اور نباتاتی

تبدیلیوں نے نسل انسانی کو نئی جہتیں عطا کی ہیں لیکن اگر ہوش وخرد کے ساتھ اس عنوان پر غور کیا جائے تو اس انسانی ترقی نے اس کے اپنے ہی ماحول پر تباہ کن اثرات مرتب کیے ہیں۔ اب ترقی کا مفہوم انسانی سوچ پر منحصر ہے اگر انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ جنگلات کو کاٹ کر وسائل میں اضافہ کر رہا ہے، صنعتکاری کو فروغ دے کر صحت انسانی کو دوام بخش رہا ہے یا پھر غذائی اجناس اور فصلوں پر بے مہار کھادوں اور کیڑے مار ادویات کا استعمال کر کے آنے والی نسلوں کو خوراک کا حصول یقینی بنا رہا ہے تو پھر اس لفظ ترقی کی تعریفِ نو کرنا ہوگی۔ آج ہماری دشمنی خود کرہ ارض سے ہے۔ ہم فطرت کے عناصر آسمان، فضا، زمین، ہوا اور پانی کے خلاف صف آرا ہیں۔ نتیجے میں ان کا غضب بھی نہایت ہولناک ہوگا۔ ہمارے شہر اور جنگل، ہمارے کھیت اور گاؤں کئی دن تک متواتر جلتے رہیں گے۔ دریا زہر میں تبدیل ہو جائیں گے۔ فضا آگ میں بدل جائے گی۔ ہوا اس آگ کے شعلوں کو دور دور تک پھیلا دے گی۔ جب جلنے کے قابل ہر شے جل چکی ہوگی اور آگ بجھ جائے گی تو دھواں اٹھ کر سورج کو ڈھانپ لے گا۔ زمین پر تاریکی چھا جائے گی۔ پھر دن نہیں نکلے گا۔ کبھی نہ ختم ہونے والی رات شروع ہوگی۔ درجہ حرارت گر کر نقطہ انجماد سے نیچے چلا جائے گا اور ایٹمی موسمِ سرما کا آغاز ہو جائے گا۔ پانی زہریلی برف میں تبدیل ہو جائے گا۔ ریڈیو ایکٹو اثرات زمین کی تہوں میں اُتر کر سطح کے نیچے پانی کے ذخیروں کو آلودہ کر دیں گے۔ بیشتر زندہ چیزیں جانور اور نباتات، سمندری اور گھریلو جاندار مر جائیں گے۔ صرف چوہے اور کاکروچ اپنی نسل بڑھائیں گے اور باقی ماندہ خوراک حاصل کرنے کے لیے باقی ماندہ انسانوں سے مقابلہ کریں گے۔

لہٰذا ہمیں اس بات کو سوچنا ہوگا کہ ہم اپنے وسائل کو بڑھانے کے چکر میں کیا کیا کھو رہے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی پیدا کرنے والے سرفہرست عوامل میں جنگلات کا کٹاؤ، صنعتکاری کا فروغ، شہروں کا بے جا پھیلاؤ اور زرعی ادویات کا کثرت سے استعمال ہے۔ اس ماحولیاتی آلودگی کے نتائج گلوبل وارمنگ اور مہلک بیماریوں کی صورت میں پیش آ رہے ہیں۔ جنگلات کی کٹائی سے چرند پرند کا قدرتی توازن خراب